دراحساس پہ دستک

کالموں کا مجموعہ

ڈاکٹر کریم ملک

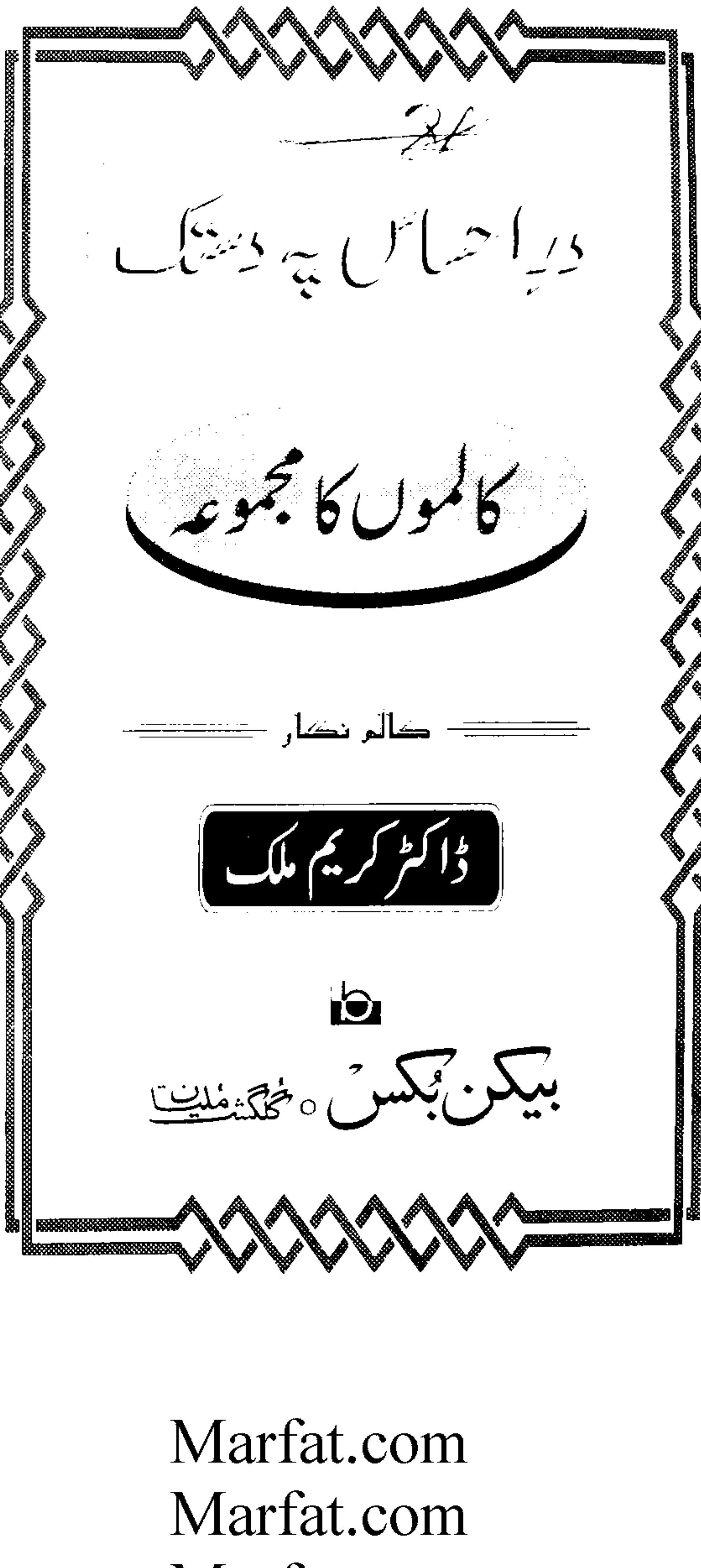

درِ احساس پہ دستک

کالموں کا مجموعہ

کالم نگار

ڈاکٹر کریم ملک

بیکن بکس ○ گلگشت ملتان

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

جملہ حقوق محفوظ

۲۰۰۱ء

درِ احساس پہ دستک

ڈاکٹر کریم ملک

بیکن بکس گلگشت ملتان فون: 520790-91

کے لیئے

شرکت پرنٹنگ پریس لاہور سے طبع ہوئی

قیمت: 225روپے

ٹائٹیل: جاذب، گرافکس ان لاہور

فون: 042-6363009

بہ اہتمام: سید اویس علی سہروردی

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

اِنتساب

اپنے مرحوم والدین کی خاموش دعاؤں
کے نام

جنہوں نے ہوا کے رستے میں
چراغ جلانے کا حوصلہ دیا

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

فہرست

صفحہ نمبر

اظہارِ خیال (پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ چوہدری، وائس چانسلر بہاء الدین یونیورسٹی)	9
اظہارِ خیال (جناب ناصر محمود کھوسہ صاحب کمشنر ملتان ڈویژن)	10
حرفِ آغاز	11
جدید ابلاغ میں کالم نگاری کی اہمیت	15
آٹے کا بحران	21
ابلاغ عام کی نئی صورتیں	23
نوائے وقت ملتان لیہ الی روڈ پر ارتقاء کا نیا موڑ	25
بکرے ہیں سب دیکھے بھالے	27
آؤ دعائیں اکٹھی کریں	30
سکول کو جانے والے راستے اور گلیاں	33
مسئلہ کشمیر۔ مضامین گجرال کے آئینے میں	35
تجوریوں کے تالے کب کھلیں گے؟	41
اعلیٰ سند اور قبائے فضیلت	44
ہم کیا پڑھیں اور کیا نہ پڑھیں	47
جنریشن گیپ	50
حاملِ رقعہ زبانی عرض کرے گا	53
لاہور، ملتان، کوئٹہ روڈ	57
ابھی دنیا میں اچھے لوگ باقی ہیں	60
ڈاکٹر صبور غیور	62
ہر کلہ راشہ۔ پہ خیر راغلے	65
"یہ پیشکش ملتان کیلئے نہیں ہے"	69
پی۔ آر۔ او	72
سواری اپنے سامان کی خود حفاظت کرے	75
ہمارے کان اور بجٹ کا اعلان	79
یہاں تھوکنا منع ہے	82

Marfat.com

Marfat.com
Marfat.com

پگڑی 84
جون کا مہینہ ۔ فیلڈ سٹاف کا پسینہ 87
ملتان اپنی پہچان مانگتا ہے 90
مائی بھاگاں 94
جمعۃ الوداع سے حجتہ الوداع تک 97
فالسہ کا جوس ۔ سوانجراں کے پھول 100
اللہ کرے سی ۔ بیوروکریسی 103
کیا ملتان میں احمد شاہ ابدالی کا کوئی ولی وارث نہیں ؟ 107
"ہور کی حال اے" 110
جنوبی پنجاب میں صحافتی اقدار کا جائزہ 112
ابھی راکھ میں چنگاریاں باقی ہیں 115
"But" - "However" - "Otherwise" 118
"سوری" 121
ہم چلتے پھرتے خواب کیوں دیکھتے ہیں ؟ 123
ملتان کی سہ پہر دوپہر سے زیادہ گرم ہوتی ہے 126
لفظ تاثیر سے کب محروم ہوتے ہیں 128
نشتر کالج ایک اور عبدالرب نشتر کا منتظر ہے 131
پھول توڑنا منع ہے 135
ملتان کی گل گشت کالونی 138
Most Welcome 140
"جلنے والے کا منہ کالا" 142
ڈیرہ غازی خان میڈیکل کالج کا منتظر ہے 145
گولڈن ٹیک ہینڈ 148
ملتان کی وحدت کالونی 151
صحت مند یا خوبصورت ملتان 154
کوٹلہ تولے خاں 157
والدین، بچے اور تفریح گاہیں 160
ادھورے خواب 163
چائلڈ لیبر 166

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ٹیوشن	169
کوثر علم کے ساقی مگر بے بسی کے شاکی	172
نفاذ اردو دفتری زبان	174
مسجد	177
بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ترقی کی شاہراہ پر	180
میاں چنوں میں محفل میلاد	182
پوری دنیا فتح کرنے کا خواب	185
نئی ایجوکیشن پالیسی کب آئے گی	188
بند گلی اور آخری راستہ	191
سوال کا جواب بھی سوال میں ملا مجھے	193
گرد	196
ملتان کا زیرو پوائنٹ	199
روح کی غذا - ناکردہ گناہوں کی سزا	201
لیڈر اور ان کے بیانات	203
کیا ایسا ہو سکتا ہے	205
مزار اقبال	207
بہاولپور	210
علاج بالغذا	213
جوڑے تو کوہ گراں تھے ہم	216
ملتان کے محسن	219
ایک کمرہ - 6 آدمی	223
عمر بھر کی محنت کش "مہارانی"	226
ملتان کی تہذیبی قدریں	228
ہمارے شہر میں ایک آدمی تھا آسماں جیسا	232
بازاروں میں لاؤڈ سپیکر	234
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلماں بھی ایک	237
23 مارچ ہماری منزل کے تعین کا دن	240
یہی دن اہل دل کے واسطے امید کا دن ہے	244

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

مجھے بے حد خوشی ہے کہ ڈاکٹر کریم صاحب اپنے ان کالموں کا مجموعہ چھپوا رہے ہیں جو ایک عرصے سے نوائے وقت ملتان میں شائع ہو رہے ہیں۔ ان کے یہ کالم ان کی ادبی اور سماجی شعور کے آئینہ دار ہیں اور وہ ان کالموں کے ذریعے نہ صرف وہ اپنے پڑھنے والوں کے فکر و احساس پہ دستک دیتے ہیں بلکہ پہلے ہی بہت سے مسائل کا سامنا کرنے والے معاشرے کے دامن میں کئی سوالوں کا اضافہ کر دیتے ہیں۔

ہماری کوشش ہے کہ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی میں نہ صرف تحقیق و تخلیق کی فضا پروان چڑھے بلکہ یہ کاوش زیورِ طباعت سے آراستہ ہو تاکہ ناقدین ہمارے اساتذہ اور سکالرز کی کاوشوں کا محاکمہ بھی کر سکیں۔

پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ چوہدری
وائس چانسلر
بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

(جناب ناصر محمود کھوسہ صاحب کمشنر ملتان ڈویژن)

انسانی فکر کو متاثر کرنے اور بدلنے کی جو بے پناہ طاقت ایک صحافی کے قلم میں ہے وہ کسی اور پیشہ کے فرد میں نہیں۔ صحافی معاشرہ کی آنکھ، کان اور دل ہی نہیں بلکہ مملکت کے چوتھے ستون کا ایک اہم حصہ بھی ہے۔ یہی وجہ ہے صحافی کی زندگی سکوت ساحل نہیں بلکہ موجوں سے پیہم برسرپیکار رہنے کا جہد مسلسل کا نام ہے۔

اکثر قومی اخبارات میں شائع ہونے والے مضامین، فیچر، کالم اور ادارتی تجزیے نظر سے گزرتے ہیں۔ ایک صحافی جس طرح حادثات و واقعات پر نقد و نظر کرتا ہے رائے عامہ تشکیل کرنے، عوام اور حکام کو باخبر کرنے کا فریضہ سرانجام دیتا ہے اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے کندھوں پر کس قدر ذمہ داری کا بوجھ ہے۔

ڈاکٹر کریم ملک کے کالم اکثر زیر مطالعہ رہتے ہیں مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ ڈاکٹر کریم ملک بڑی ذمہ داری سے معاشرہ کی بنیادی اکائیوں اور ان سے وابستہ موضوعات کو زیر بحث لاتا ہے، معاشرے کے معاشرتی زخم دکھاتا ہے اور قومی درد رکھنے والے حساس افراد کی توجہ مبذول کراتا ہے کہ وطن عزیز کی ترقی کو کس طرح مضبوط اور مربوط بنایا جائے۔ اس کی ترقی میں کون سی دشواریاں حائل ہیں اور ان کا مداوا کیسے ممکن ہے۔

ڈاکٹر کریم ملک یہ احساس دلانے میں کسی حد تک کامیاب ہوئے ہیں اور مجھے ان کی صلاحیتوں پر اعتماد ہے اور ان کے جوش عمل کا اعتراف بھی ہے۔ انہوں نے جس خلوص کے ساتھ ملتان اور جنوبی پنجاب کے مسائل کی نشاندہی کی ہے اور اس خطہ میں پھیلی ہوئی محرومی، پسماندگی کا خوبصورتی سے ذکر کیا ہے اس سے ترجیحات کے تعین میں آسانی ہوتی ہے۔ ''ذرا احساس پہ دستک'' صرف کالموں کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک سنگلاخ میدان میں چلنے اور دشوار گزار راہوں سے گزرنے کا نام بھی ہے۔ ان کی مضبوط قوت ارادی، اور اس میدان میں ثابت قدمی کیلئے دست بہ دعا ہوں کہ مقاصد کی رفعت کا یہ سفر جاری رہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

11

حرفِ آغاز

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

NGO کی زبان میں Social Questions کہتے ہیں انہیں کا انتخاب کیا ہے زیادہ تر مسائل کا تعلق ملتان اور جنوبی پنجاب سے ہے جہاں زندگی کو متحرک کرنے اور ترقی کے پہیہ کو فعال کرنے کی صرف ضرورت ہی نہیں بلکہ ہوا اور آکسیجن کی طرح بقا کا مسئلہ بھی ہے۔ یہ خطہ جو ڈھائی کروڑ افراد پر مشتمل ہے نوآبادیاتی نظام کے عہد میں ترقی سے یہ علاقہ کوسوں دور رہا اور پھر صبحِ آزادی کے بعد اس پر توجہ کرنے اور اس کی ترجیحات کا تعین کرنے میں مجرمانہ غفلت برتی گئی اور اس خطہ کی قیادت پر اعتراضات ہوئے کہ وہ گورنر، صدر، وزیراعلیٰ اور وزیراعظم کے منصبوں تک پہنچے مگر اس خطہ کے زخم انہیں کہیں نظر نہ آئے اور نہ ہی اراکین اسمبلی نے اسمبلی کے فلور پر اس خطے کی مؤثر نمائندگی کا فریضہ ادا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ابھی تک یہاں کی زراعت صنعتوں سے محروم ہے معدنیات کیلئے جدید کارخانے ندارد ہیں۔ لیبر فورس یا افرادی قوت کیلئے محنت اور معاوضے کے روشن امکانات نہیں۔ اہل دانش کیلئے اظہار خیال و بیان کیلئے نہ تو ٹی وی سٹیشن ہے اور نہ ہی اچھے Publishing houses موجود ہیں۔ مخطوطات، آرٹس، فنون لطیفہ، نوادرات کیلئے کوئی مستند تحقیقی ادارہ، میوزیم موجود نہیں۔ اس وسیع و عریض خطہ کا صدیوں پرانا کلچر اس طرح بکھرا ہے جیسے کسی پہاڑ کے دامن میں سنگریزے بکھرے ہوں جو راہ چلتے مسافر ٹھوکروں کی زد میں ہوں۔ وطن عزیز کی ترقی، خوشحالی اس کے ایک ایک گوشہ کو اجاگر کرنے اور مجموعی ترقی کے ہم پلہ بنانے میں مضمر ہے۔ اس خطے کی ترقی درحقیقت استحکام پاکستان کی علامت ہے۔ اور یہ خطہ بلاشبہ پاکستان کے اقتصادی مسائل حل کرنے میں اپنا کلیدی کردار ادا کر سکتا ہے۔ اس کے اثمار، اشجار، فصلیں، گندم، کپاس، آم، کھجور، چاول، گنا، کنو، مالٹے خلیج فارس اور مشرق وسطیٰ کی اچھی منڈیوں میں مقبول ہو سکتے ہیں اور پاکستان کو درآمدی محتاجی سے اور بڑھتے ہوئے قرضوں کے جال سے نکال سکتے ہیں۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

بات طویل ہو گئی ہے۔ بہر حال کالم نگاری میں ہم نے آج سے کوئی تیس سال پہلے قدم رکھا۔ روزنامہ کوہستان، روزنامہ امروز، ہفت روزہ قندیل سے اپنی کالم نگاری، مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔ 1972 سے روزنامہ نوائے وقت لاہور سے مستقل وابستگی اختیار کی اور زراعت، صنعت و حرفت، شینگ، سٹاک ایکس چینج کے حصص میں اتار چڑھاؤ پر تواتر سے کالم اور فیچر

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

لکھے۔ ان تحریروں، کالموں کو بین الاقوامی شہرت یافتہ اور اردو کالم نگاری میں مستند نام، حوالہ بلکہ ایک ادارہ جناب عطاء الحق قاسمی نے بے حد پسند کیا اور ہمیشہ حوصلہ افزائی کی۔ یہاں اپنے درویش صفت استاد جناب عبدالقیوم اعتصامی کا ذکر بھی ضروری ہے کہ انہوں نے ابتدائی دنوں میں رہنمائی کا اور حوصلہ افزائی کا کام بہ حسن و خوبی سرانجام دیا۔ سید عاشق علی فرخ، امجد اسلام امجد، سید ارشد مدنی انہی دنوں کے ساتھی ہیں۔ جناب مجید نظامی کی شخصیت میرے لئے ہمیشہ سایۂ عافیت سراپا شفقت اور خلوص و ایثار کا سرچشمہ رہی ہے میں ان کی تمام تر محبت کا زیر بار رہوں گا۔ ایک دوسری شخصیت جو میرے علاقے سے مثل آفتاب بن کر ابھری وہ جناب ملک خدا بخش بچہ کی ہے جنہیں بابائے زراعت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہاں اپنے استاد مکرم پروفیسر ڈاکٹر مسکین علی حجازی کا بھی ذکر کرنا ضروری محسوس ہوتا ہے۔ ڈاکٹر حجازی کی کریم ذات میں خیر اور فلاح کی اعلیٰ مثال ہیں۔ انہی کے دم قدم سے ابلاغ کے ادارے آباد ہیں۔ ان سے وابستہ افراد شاد ہیں۔ اپنے برادر محترم جنہیں میں نے ہمیشہ اپنا استاد سمجھا وہ ہیں پروفیسر ڈاکٹر انوار احمد ڈین فیکلٹی آف لینگویجز جو ہماری کسی کامیابی پر اس قدر خوش ہوتے ہیں کہ لفظ اس کیفیت کو بیان نہیں کر سکتے اور کسی تکلیف پر اس قدر رنجیدہ ہوتے ہیں کہ ہمیں اپنی تکلیف بھول جاتی ہے۔ محترم جناب شیخ ریاض پرویز ریذیڈنٹ ایڈیٹر روزنامہ نوائے وقت ملتان نے باقاعدہ کالم لکھنے کی تحریک دی اور اسے ملتان اور جنوبی پنجاب کے موضوعات کو زیر بحث لانے کا صائب مشورہ دیا اور بتایا کہ جناب مجید نظامی صاحب کی خواہش ہے کہ اس علاقے کی پسماندگی کو اجاگر کیا جائے۔ میں جناب شیخ صاحب کی اس علمی سرپرستی کا ممنون ہوں۔ مجھے یہاں اپنے ابلاغ کے اداروں کے وہ دوست یاد آ رہے ہیں جن کا خلوص اور پیار ہر محفل میں چاندنی کی طرح کھلتا ہے اور دل و دماغ کے گوشے منور کرتا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر مغیث الدین شیخ شعبہ ابلاغیات پنجاب یونیورسٹی، پروفیسر عماد راشدی، جامشورو یونیورسٹی، جناب پروفیسر عبدالستار عباسی، گومل یونیورسٹی، جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد شمس الدین، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور، جناب محمد رمضان اظہر یونیسیف عراق، جناب نسیم الرحمن بنگلہ دیش، جناب ڈاکٹر صبور غیور سنگاپور، سید ابرار وزیر اطلاعات جناب جاوید جبار، مسٹر [illegible] جرمنی، اشرف عظیم پی ٹی وی لاہور، کمشنر ملتان ڈویژن جناب ناصر محمود کھوسہ جن کی علم دوستی اور خلوص ہمیشہ آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتا ہے۔ مجھے یہاں جناب توحید

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

احمد بائی کمشنر سفارت خانہ پاکستان سنگاپور، جناب محمد اعظم چوہدری ڈائریکٹر جنرل بورڈ آف ریونیو حکومت پنجاب لاہور، محترم پروفیسر ڈاکٹر ایم الطاف علی قریشی سابق وائس چانسلر ملتان یونیورسٹی، محترم پروفیسر ڈاکٹر خیرات ابن رسا، پروفیسر ڈاکٹر محمد نذیر رومانی اپنی تمام تر مہربانی کے ساتھ یاد آتے ہیں۔

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

آخر میں اپنے بیٹے محمد سجاد کریم، محمد شہزاد کریم کا ذکر کرنا ہے جو کتاب کو جلد لانے میں کوشاں تھے۔ اور اپنی بڑی بیٹی بشریٰ کریم اور چھوٹی بیٹی شگفتہ جبیں جنہوں نے کتاب کی پروف ریڈنگ میں میرا ساتھ دیا۔ کتاب کی تحریر، تدوین اور تکمیل میں میری بیگم کا بھی خصوصی تعاون رہا ہے۔

میرے پیارے دوستوں میں جناب جبار مفتی، جناب سلیم ناز، اولڈ ہلین ملتان کی ایسوسی ایشن کے ساتھی جناب سلیم بخاری، محمد یونس غازی، عزیز الحسن اور جناب رفیق انصاری کے ساتھ ساتھ اپنے پیارے دوست جناب غلام نبی کروڑی جو آجکل ایڈیشنل کمشنر ڈیرہ غازی خاں ہیں، جناب محمد یونس خزانہ دار بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان، جناب زین اے ملک جو ہمارے رجسٹرار رہے ہیں ان سے بڑھ کر بڑے بھائی اور مخلص ساتھی، عبدالجبار بیکن بکس کا خصوصی شکریہ۔ ان سب دوستوں، شاگردوں اور عزیزوں کی خواہش تھی کہ کتاب جلد از جلد منظر عام پر آئے۔ سو ان سب کی پُر خلوص خواہش اور دعا مقبول ہوئی۔ کتاب آپ کے سامنے ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر کریم ملک
شعبہ ابلاغیات
بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان

یکم جنوری ۲۰۰۱ء

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

جدید ابلاغ میں کالم نگاری کی اہمیت

جدید ابلاغ نے عہد حاضر میں جو اہمیت اختیار کر لی ہے اس کی وسعت اور ترجیحات کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں رہا۔ ابلاغ کے سہارے دنیا سے ترقی ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور اس کے محدود امکانات کا تجزیہ کرنے والوں نے Global Society Approach کے تحت اسے پیش کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس معاشرتی تشکیل دنیا کے تجزیے کے بارے میں Glen Fisher کی رائے بڑی معنی خیز ہے جسے انہوں نے اپنی کتاب American Communication in a Globe میں بیان کیا ہے:

> "Society" implies existence of a common culture-shared knowledge and beliefs. patterns of association. custom on this "globe" one is actually impressed with the diversity and contrast even among peoples of the traditional western world. Yet an advanced degree of internationalized common culture does extend around the world even though most people only observe bits and pieces of it (1)"

ان کی رائے میں سیاسی، تہذیبی، ثقافتی، ٹریڈ، کامرس، فیشن اور زبان مشترک ہوتی جارہی ہے اور انگریزی دنیا بھر کی زبان بن گئی ہے اس بڑھتے ہوئے سماجی، سوسائٹی، معاشرہ میں مسائل کا پیدا ہونا فطری عمل ہے۔ پھر اس میں ایسے سلگتے سیاسی مسائل ہیں جو عالمی یکجہتی کے اس خوشگوار ماحول کو متاثر کر سکتے ہیں اور اقوام عالم کو جنگ کی دلدل کی طرف دھکیل سکتے ہیں۔ محروم اور مجبور اقوام کو غلام بنا سکتے ہیں۔ حریت، آزادی اور خود مختاری اور زندہ رہنے کی آرزو رکھنے والی اقوام کو کئی توسیع پسند جارحیت کے رحم و کرم پر لا سکتے ہیں ایسے ماحول میں یہ Global Village یا Global Access کا خواب پورا ہو سکتا ہے۔ جس انفارمیشن انقلاب سے ہم گزر رہے ہیں اور جو ترجیحات ہمیں مکمل کرنی ہیں اس میں سب سے بڑا چیلنج The Digital Millennium کا ہے جس میں ہمیں دیکھنا ہے کہ ہمارا معاشرہ جدید ٹیکنالوجی سے کس حد تک متاثر ہوا ہے اور کس حد تک مسائل حل ہوئے ہیں اور کس نوعیت کے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

مسائل پیدا ہوئے ہیں اور جو مسائل پیدا ہوئے ہیں ان کو ہم اپنے دانشوروں کی رائے میں کیسے حل کر سکتے ہیں۔ کالم نگاری معاشرے میں پیدا ہونے والے مسائل کی سنگینی، تلخی میں شگفتگی اور شوخی پیدا کرنے کا عمل ہے۔ روزمرہ کے مسائل جن سے ایک عام آدمی کو سامنا کرنا پڑتا ہے جس میں معاشی، معاشرتی محرومیاں، ناہمواریاں، غربت و افلاس، بے روزگاری، بے انصافی ہر مقام اور ہر مرتبہ سے محرومی گھر سے لیکر دفتر تک، دفتر سے منڈی' مارکیٹ میں پیدا شدہ دباؤ، خوفزدہ کرنے والے واقعات انسانی طبع پر بار گزرتے ہیں۔ کہیں ٹکٹ لینے جائیں تو بکنگ آفس میں سیٹ دستیاب نہیں ہوتی۔ کہیں پرچانس کہیں پر رشوت کہیں پر سفارش۔ سفر کرنا دشوار۔ دوران سفر عدم تحفظ ایسے ان گنت مسائل کالم کا موضوع بنتے ہیں اور عمل اس تلخی میں Sugar Coated انداز سے مسائل کی تلخی کو کم کرتا ہے انسانیت کو زندہ رہنے آگے بڑھنے کا حوصلہ فراہم کرتا ہے کالم میں ادبی چاشنی بھی ہوتی ہے ڈرامائی انداز سے بھی اور Cheery Chat Style بھی۔ ایک طرف مسئلہ کو اٹھایا جاتا ہے اور اس کا ہلکے پھلکے انداز میں حل بھی بتھایا جاتا ہے کہیں طنز، کہیں مذاق کہیں بذلہ سنجی کہیں سنجیدگی کہیں پھول کہیں کانٹے کہیں عزم کہیں نظم کہیں چوٹ سے پیدا ہونے والے درد کا احساس۔

ایک دو زخم نہیں سارا کا سارا جسم ہے چھلنی
درد بیچارہ پریشاں ہے کہ کہاں سے اُٹھے

اگر کہیں بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ ہے تو اس کے لئے ممکنہ وسائل کی فراہمی کہاں سے ہوگی۔ اگر کہیں کشمیر، فلسطین، بوسنیا، چیچنیا کی مظلوم اقوام کی جرأت، حریت کو سلام ہے تو وہاں بڑی طاقتوں کا شرمناک کردار بھی زیر بحث آتا ہے وہ کس طرح ترقی پذیر اقوام کا استحصال کرتے ہیں اور اپنے مخصوص مفادات کے تحت انہیں اقتصادی غلام بناتی ہیں کہیں A vision for 21st century کا موضوع سامنے آتا ہے جس میں دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے معاشرہ کے حقیقی مسائل کیا ہیں۔ آزادی کے ابتدائی دنوں میں کوریا اور پاکستان کی GNP ایک جیسی تھی آج پاکستان ڈویلپمنٹ ریویو کے شمارہ 36 پارٹ I 1997 کے مطابق کوریا کی 7,670 GNP ڈالر ہے جبکہ پاکستان کی 476 ڈالر اور یہ فرق 1,611 فیصد ہے (2)۔ اس طرح زراعت، صنعت

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

اور دیگر شعبوں میں ہماری مجموعی پیداوار وہ نہیں جس پر ہمیں ناز کرنا چاہیے آج ہمیں صرف چینی جیسے درآمدی مشتاق کا سامنا ہے۔ ہمیں ایک طرف مسلسل بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ ہے اور دوسری طرف افلاس، گھٹیا تعلیم، ماحول کی ذلت، خوراک کی قلت، کمزور صحت ہر روز ہماری نسوانی آبادی کو کم عمری کی شادی، بار بار ماں بننے کی اذیت ایام زچگی میں ہر سال کئی ہزار میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہیں۔ ایسے گھٹے ہوئے کنبوں کے افراد ہر روز نئے روزگار کے ذرائع آمدنی، بہتر ذرائع رسل و رسائل، صاف پانی، بہتر تعلیم اور علاج معالجے کی مناسب سہولتوں جیسے سرگرداں رہتے ہیں آج بھی ہر بہت سے دیہاتوں میں لوگ گڑ پیاز سے روٹی کھاتے ہیں۔ متوازن غذا اور مناسب کلوریز کی فراہمی بڑے دور کی بات ہے ان مسائل کی موجودگی میں کالم نگار وہ دیدور ہے جو ایک متبادل پارلیمنٹ کا کردار ادا کرتا ہے حکام اور بااثر عوام کو ان سلگتے ہوئے حیران، پریشان کرنے والے مسائل کی طرف توجہ دلاتا ہے۔

کالم نگاری صحافتی دنیا کی ایک ایسی شاخ ہے جو اخبارات کی مقبولیت کا باعث بنتی ہے اخبارات کے تشخص کو ابھارتی ہے صحافتی زبان میں اخبارات کی سرکولیشن میں اضافہ کا موجب بنتی ہے۔ ایک Competent, successful Columnist معاشرے کی آنکھ، کان اور دل ہوتا ہے۔ وہ ان مسائل کو بڑے غور سے دیکھ لیتا ہے، محسوس کر لیتا ہے جہاں دوسروں کی نگاہیں اپنی مصروفیت کی وجہ سے مبذول نہیں ہوتیں۔

کالم کیا ہے؟ کالم ایک ایسی باغ و بہار تحریر کا نام ہے جو مختصر لفظوں میں کسی مسئلہ کی خیال کی ضرورت پر ایسی توجہ دے کہ پڑھنے والا مسئلہ کی شدت کو دل کی گہرائیوں میں محسوس کرے اور اس کے ممکنہ حل جیسے کوشاں ہو۔ اگر حل کرنے کی سکت نہ رکھتا ہو تو کم از کم اپنے حلقہ اثر میں اس کا ذکر کرے اور اس طرح ایک رائے عامہ کی تشکیل کا موجب ٹھہرے۔ کالم ایک ڈرامائی تحریر ایک ایٹ اور ایک ایسے انداز کا نام ہے جس میں جملے اپنے اندر کاٹ، چوٹ اور شوخی سے مظہر ہوں۔ منفرد سوچ، شوخی طبع، طنز و مزاح، شعر و شاعری کی ادا، ادبی ذوق، فکری پختگی کا اظہار کریں اور کالم نگاری کے اس میدان میں فنی مہارت اسلوب اور ندرت خیال کا سکہ جمائیں۔ کالم ہمارے ماحول میں ان گنت مسائل، مشکلات، دشواریوں سے جنم لیتے ہیں خواہ یہ مسائل کسی بین الاقوامی فورم سے متعلق ہوں عالمی طاقتوں کی منہ پرستانہ سوچ کے عکاس ہوں یا کسی محدود معاشرہ و طبقہ کی سماجی، معاشی، معاشرتی زندگی سے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

گرد گھومتے ہوں۔ کالم ہر اس موضوع، خیال، نظریہ، مسئلہ پر اظہار خیال کرتا ہے جو عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوں مگر کالم نگار اسے ڈھونڈ نکالے۔

پاکستان ساڑھے چودہ کروڑ انسانوں کا ملک ہے۔ جہاں غربت، افلاس کی کوئی شرح نہیں جو چاہے وہی اعداد و شمار بنا کے پیش کر دے مگر یہ حقیقت ہے کہ امارت اور غربت کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہے ایک طرف تقریباً 5 کروڑ افراد ہیں جو غربت کی آخری حدوں تلے دبے ہیں اور دوسری طرف ایسے مال مست لوگ ہیں جن کے محل دیکھنے کیلئے سر کو اونچا کرنا پڑتا ہے اور وہ محل کی منزلوں کی بلندی کو دیکھ کر غیر متوازن غذا کا عادی عام آدمی غش کھا کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ امارت اور غربت کا یہ فاصلہ کون مٹائے گا۔ کیا ہماری سوچ صرف مسجدوں کی صفوں میں مساوات اور پاؤں کی برابری تک محدود ہے یہ مساوات دستر خوان پر کیوں نہیں ہو سکتی۔ ایسے ان گنت موضوعات کالم کا عنوان بنتے ہیں۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ہمیں جن معاشی، معاشرتی، سماجی مسائل کا سامنا ہے وہ ایسے مسئلے ہیں جو عام خبروں کا موضوع بنے رہیں بلکہ یہ ایسے مسئلے ہیں جن کو حل کرنے کیلئے ہمیں Undeclared war اس کا مداوا کرنا ہوگا۔ اس لئے ہمارے ملک کے کالم نگاران مسائل سے آنکھیں چرا نہیں سکتے۔ لوٹ جاتی ہے نظر ادھر کو کے مصداق سوچنا پڑتا ہے۔ کالم نگار تو ایک طرف بڑھتی ہوئی غربت پر اپنی سوچ کو یکجا کرنا ہے اور معاشرے میں لاقانونیت کے ابھرتے Conflicts تشدد اور جارحیت کے خلاف محاذ بنانا ہے۔ معاشرہ کو مہذب بنانے کے لئے قوانین کی جائے ان میں تہذیب کی درخشندہ روایات اور کردار کی ارفع مثالیں پیش کرنا ہے اور بچوں کی بہتر تعلیم و تربیت کرنے اور Child labour سے انہیں بچانے کے لئے Child Friendly Schools کا قیام ضروری ہے جہاں ہاتھ کا کام اور تعلیم دونوں لازم و ملزوم ہوں۔ ہمیں اپنے کالموں میں معاشرے کے بزرگ افراد، شہریوں کیلئے خلوص، محبت، ایثار کے دروازے کھولنے ہیں اپنی مشرقی روایات کے مطابق والدین کو عزت و احترام بزرگوں کیلئے عزت و توقیر، ماں کی محبت اس کے پاؤں تلے جنت تلاش کرنے کی سچی آرزو ہمارے کالموں کا زندہ موضوع ہونا چاہئے۔ ہمارے کالم نگاران شکستہ، خستہ مگر عہد رفتہ کی نادر عمارات، نقش و نگار بھول جاتے ہیں جو ہماری عدم توجہی کی وجہ سے زوال اور خستگی کی آخری حدوں تک جا پہنچے ہیں۔ ان کی مناسب دیکھ بھال ہمارا قومی فریضہ بھی ہے اور اپنے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

21

آٹے کا بحران

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

تدارک کرنا ہمارے متعلقہ محکموں کی ذمہ داری ہے۔ ہمیں تو یہ اناج ایشیا اور افریقہ کے ملکوں کو برآمد کرنا تھا اور اب ہم ٹنوں کے حساب سے درآمدی محتاجی میں آگئے ہیں ہمارے کھیتوں کی زرخیزی اور ہمارے کسانوں کی محنت گواہ ہے کہ ہم اس میدان میں آگے بڑھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں صرف یہ نہیں بلکہ عالمی منڈی تک اپنی اجناس لے جا سکتے ہیں نئی عالمی منڈیاں تلاش کر سکتے ہیں اور اپنی شرح نمو کو اسطرح پر لا سکتے ہیں کہ خود کفالت ہماری منزل بن جائے گی۔ یہ کام آسان نہیں آٹے کا بحران اسکا راستہ نہیں روک سکتا۔ ایثار قربانی اور مشکل فیصلوں اور دیرپا پالیسیوں کی ضرورت ہے اور رہے گی اور اگر کہیں علاج کیلئے نشتر کا استعمال ضروری ہو تو اس سے گریز نہ کیا جائے۔ یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ ماضی میں اگر ایسے بحران آئے ہیں تو حکومتیں ہل جاتی تھیں مگر عوام کا موجودہ حکومت پر اعتماد کا اظہار یوں بھی ہوتا ہے کہ مسئلہ تو پھر مسئلہ ہے مگر حکومت بھی مستحکم ہے۔ اہل ملتان جانتے ہیں کہ جب حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانی سہروردی کے دور میں قحط آیا تو انہوں نے اپنے گودام عوام کیلئے کھول دیئے آج جن کے گودام گندم سے بھرے ہیں وہ بھی ان بزرگوں کی قائم کردہ روایت پر کھل کر عوام سے داد لیں اور ثواب بھی کمائیں۔ ایک نیکی سے دو کام۔ دنیا بھی سنور جائے اور آخرت بھی ہاتھ سے نہ جائے۔ ایک قحط ۱۹۵۱ میں آیا ایسا ہی کٹھن مرحلہ تھا لیکن عوام نے اس مشکل کو اپنی ہمت سے حل کیا آج بھی ایسی ہمت چاہئے کہ ہم اناج میں خود کفیل ہو جائیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ابلاغ عام کی نئی صورتیں

بات چیت کو ابلاغ کہتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کے درمیان ہو تو ابلاغ عام ہو جاتا ہے کسی خبر رسانی کا ابلاغ ہو تو پرنٹ میڈیا کہلاتا ہے ٹی وی ہو یا فلم کا ابلاغ الیکٹرانک میڈیا جدید روپ دھار لیتا ہے۔ ایک ایسا ابلاغ بھی ہے جو بڑی خاموشی سے آئین کی طرح تحریری صورت میں ہے اس میں رسم و رواج کا دخل ہے۔ یہ رسم و رواج کا ابلاغ رشتوں، تقریبوں، دعوتوں کی بار بار کی صورت میں ہوتا ہے اور یہ تقریبی ذرائع ہوتے ہیں گھروں سے ذرائع ہوں تک ہر ایک نے اپنے اپنے منشور کا اظہار اپنی کاریوں کے پچھلوں پر لکھا ہوتا ہے ایسا ابلاغ کسی بھی اور چاہے ابلاغ نہ ہو تو بھی پیدا ہوتا ہے اور زندگی کی تعمیری اقدار کے نصاب میں شامل ہے۔ یہ تو زندگی کے فروغ کا بہترین پروگرام ہے کہ نئی روشنی اور تعلیم یافتہ ان اقدار سے اس کے پیچھے رہتے ہیں۔ دشمن کے پیچھے چھپا ہے معنی خیز جملے ہوتے ہیں کہ پڑھتے ہی طبیعت خوش ہو جاتی ہے اور پڑھنے والے کے تخیلاتی ذہن کی داد دینی پڑتی ہے۔ "میں بھی حق ہوں" "بے رخیاں کہتے تو سارے ہیں" "پیار کی یادداشت" جیسے اپنائیت بھرے جملے زندگی میں حوصلہ پیدا کرتے ہیں۔ کس درد کی دنیا میں کوئی آ گیا ہے جو پیغام محبت بکھار رہا ہے ہاتھوں میں ساتھ لیے کی جانب بڑھ رہا ہے۔ انہیں خیالوں کو سوچتے ہوئے اچانک دوسری گاڑی گزر جاتی ہے اور جب کسی طرف آنکھ اٹھتی ہے تو یہ خوبصورت جملہ پڑھنے کو ملتا ہے "ماں کی دعا جنت کی ہوا" یہ پڑھتے ہوئے بھی داد دینی پڑتی ہے اسی طرح شہزادوں، سوالی، پہیلی زندگی مظلوم جیسے خدا ترسی کا مظہر صورت نظر آتے ہیں۔ سواری تو پہیے کی ... سے خوشحال ہوتی ہے پیچھے رقت آمیز داد دے دیتے ہیں "چلنے والے کی ..." "محنت کر حسد نہ کر" پیچھے رخ بدلتے ہیں تو شاید آنکھوں کے غم میں بھی نہیں ہوں گے جو اس ابلاغ عام میں نظر آتے ہیں۔ اکثر گاڑیوں پر پیاری، فلمی شہزادیوں کی تصویریں بنی ہوتی ہیں اور پیچھے آنے والا کس عقیدت سے پیچھا کرتا ہے کہ کہیں پڑی ان کے چہرے اور اس کی شخصیات کا سب سے پیارا بھی بن جاتی ہیں۔ اسی طرح قومی رہنماؤں سے منسوب جانے ... ان کے والوں ... آگے بانٹے پورٹریٹ بنے ہوتے ہیں ایسے پورٹریٹ عقیدت سے نہیں بلکہ تعریف سے نمبر وزرائے بیچے بنائے جاتے ہیں کہ ہمیں ایک بار روک کے تو دیکھو ہماری زندگی پچھتاوے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

اور اگر واقعی کوئی ٹریفک کا عملہ روکتا ہے تو ایسا قومی عقیدت میں ڈوبا ہوا ٹرک چلتا نکل جاتا ہے۔ اکثر گاڑیوں، بسوں اور ویگنوں پر ایسے شعر بھی لکھے ہوتے ہیں جو بین الاقوامی امن چارے کے فروغ میں مدد دیتے ہیں مثلاً

میرے پاس سے گذر کر میرا حال تک نہ پوچھا
میں یہ کیسے مان جاؤں کہ وہ دور جا کے روئے

''ماں کی دعا جنت کی ہوا'' والدہ سے عقیدت کا بھرپور اظہار ہوتا ہے رکشے میں سفر کرنے سے اخروی زندگی کا فلسفہ سمجھ میں آتا ہے وہ کسی اور ابلاغ میں موجود نہیں۔ پھٹے پرانے سلنسر کی آواز ڈیزل کا انتہائی مضر دھواں اور ٹیپ ریکارڈر کی وہ آواز جس سے معصوم بچے ماؤں کو چمٹ جاتے ہیں کہ امی کہیں بھونچال تو نہیں آگیا۔ بہر حال اس کے باوجود ایسے رکشے سواری کی استقامت اور زندہ رہنے کا حوصلہ بڑھاتے ہیں اور کم از کم بسوں سے تو بہتر ہوتا ہے جس کی فرنٹ سیٹ کے سامنے لکھا ہوتا ہے ''اے مسافر دھیان کر یہ تیرا کہیں آخری سفر نہ ہو'' اس کے بعد سواری کا دھیان آخرت کی طرف ہو جاتا ہے اور جیب کترے کا دھیان سواری کے سامان کی طرف ہو جاتا ہے کون پہلے سفر طے کرتا ہے ابلاغ عام کے شہ پارے ابھی تخلیق ہوتے ہیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

نوائے وقت ملتان ابدالی روڈ پر : ارتقاء کا نیا موڑ

نوائے وقت ملتان ابدالی روڈ پر گلشن دین کالونی سے
ابدالی روڈ کے ارتقائی سفر کا ایک مشاہدہ

روزنامہ نوائے وقت ملتان کے دفاتر ۱۳ اپریل ۱۹۹۹ء سے اپنی نو تعمیر شدہ عمارت واقع 63/A ابدالی روڈ ملتان منتقل ہو گئے ہیں۔ عمارت رفتہ رفتہ چند مہینوں میں تازہ رنگ بھرنے کی مراد ہے آئے جیسے ابدالی روڈ سے زیادہ مناسب جگہ اور کوئی ہو سکتی ہے یہی وجہ ہے جہاں احمد شاہ ابدالی والی افغانستان کی جائے پیدائش قائم ہے۔ یہی وہ ابدالی روڈ ہے جو قاسم بیلہ کی طرف جاتا ہے جہاں غازی اسلام محمد بن قاسم کے لشکر کے پہلے پڑاؤ کے تاریخی آثار موجود ہیں اور وہ اس خطہ ارض پر ہماری روشن تاریخ کے نقطہ آغاز کی علامت ہیں۔ نوائے وقت کے دفاتر کی یہاں منتقلی ہمارے ملی، تہذیبی اور اسلامی تشخص، اپنی ثقافت اور اپنی منزل کی طرف آگے بڑھنے کا نام ہے۔ نوائے وقت ملتان سے اس علاقے کی صحافتی تاریخ کا ایک نیا رخ سامنے آتا ہے۔ جب برصغیر کے مسلمان صحافی مسلم صحافت کے ارتقاء اور فروغ کے لئے سرگرم عمل تھے۔ اس طرح برصغیر پاک و ہند کے دیگر خطوں میں صحافت کے ترقی کی کے پیش نظر صحیح ملتان ان سرگرمیوں میں پیش پیش تھا۔ پرنٹ میڈیا کی تاریخ کا آغاز ہو رہا تھا۔ ۱۸۵۱ء ان جیسے کاوشوں سے شروع کرتے ہیں مگر ملتان سے ۱۸۵۳ء سے ریاض نور کے نام سے باقاعدہ ہفتہ وار اخبار جاری ہوا اور اس کے بعد شعاع الشمس اور دیگر ان گنت پرچے جاری ہوئے جن پہ کئی تحقیقی مقالے درکار ہیں اور کئی مقالے شعبہ صحافت بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان میں موجود ہیں۔

۱۹۷۴ء کے بعد امروز اور نوائے وقت کے پرچے صحافتی افق پر ابھرے۔ اگرچہ روزنامہ امروز کی عمارت بند ہو گئے اور اب امروز چوک کی شکل صورت سے سامنے آ رہا ہے لیکن نوائے وقت ملتان کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس کا ارتقائی، تاریخی سفر تمام تر دشواریوں اور مختلف عمارات کی تبدیلیوں کے باوجود جاری رہا اور آج الحمد للہ اسے اپنی عمارت جو ملتان کی عمارات میں نمایاں ہو کر میسر آئی ہے۔ دیگر قومی اخبارات بھی ملتان کو اپنا مرکز بنانے کی تمام تر

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کوشش کر رہے ہیں اور یہاں سے اپنے پرچے نکالنے کا اہتمام کر رہے ہیں جو ایک خوش آئند اور قابل ذکر کوشش ہے کہ ملتان پھر صحافت کا مرکز اور صحافتی سرگرمیوں کا گھر بن جائے گا۔ پہلے ہی یہاں کا پریس کلب اور اخبار کی مارکیٹ فعال اور متحرک ہے مزید اسے خوشگوار فضاء میسر آئے گی۔ صحافت کا وہ چراغ نوائے وقت ملتان کی صورت میں جو ۱۶ جون ۱۹۵۹ء کو جناب حمید نظامی کی ولولہ انگیز قیادت میں اور مقاصد کی رفعت کا تعین کرتے ہوئے اور جنوبی پنجاب سے صحافتی ترجیحات کو مد نظر رکھتے ہوئے ملتان سے روشن ہوا۔ ۱۹۶۶ء کے اوائل میں ایوبی آمریت نے پریس اینڈ پبلی کیشنز ایکٹ کے تحت بند کیا ۱۹۷۸ء سے روشنی کا مینار بن کر دوبارہ شائع ہوا جو کئی نسلوں کی ذہنی تربیت کر رہا ہے اور دور پسماندہ ویران بنجر، سنگلاخ زمینوں کے خطوں میں شادابی، ہریالی، ترقی اور خوشحالی کو فروغ دے رہا ہے۔ افراد کی صلاحیتوں کو اور اداروں کی کارکردگی بڑھانے میں غیر جانبداری سے کام کر رہا ہے۔ نوائے وقت ملتان کو یہ منزل اچانک نہیں ملی۔ اس کے پیچھے مشکلات طویل تاریخ بھی موجود ہے اور عزم و ہمت کی فراوانی بھی۔ ۱۹۶۶ء میں یہ اخبار ملتان میں بند ہوا مگر اسکا دفتر گل دین کالونی میں قائم رہا اس دفتر کے چیف بیورو جناب شیخ ریاض پرویز تھے جو جناب مجید نظامی کی رہنمائی اور سرپرستی سے ۳۱ سالہ اپنی طویل صحافتی جدوجہد کے بعد اس شاندار عمارت کی تعمیر سے اس خواب کی تعبیر دیکھ رہے ہیں جو جناب مجید نظامی کے عظیم اور طویل المعیاد منصوبے کا حصہ تھا۔ بلا شبہ یہ امر اظہار تشکر کا ہے اور نوائے وقت، ملتان کے کارکنوں کی حوصلہ افزائی کا ہے اور دوسری طرف ملتان میں صحافی سرگرمیوں کے عروج سے بھی عبارت ہے۔ جس تیزی سے قومی اخبارات ملتان سے جاری ہونے لگے ہیں یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ نوائے وقت ملتان نے آج سے ۳۸ سال پہلے جن صحافتی سرگرمیوں کا آغاز کیا تھا وہ آج جنوبی پنجاب میں اور وطن عزیز کی مجموعی ترقی میں قابل فخر روایات کو شامل کر رہا ہے۔ ملتان جو کبھی صحافتی اخبار سے اجڑ گیا تھا آج ۱۹۹۷ء میں نئی آب و تاب سے کمپیوٹر پرنٹنگ اور انٹرنیٹ کے نظام سے مربوط ہو رہا ہے کشمور سے لیلر شورکوٹ تک ایک نئی صحافتی تاریخ مرتب ہو رہی ہے اور سرگرمیوں میں نئی شان پیدا ہو رہی ہے بلا شبہ اس میں نوائے وقت کا کلیدی کردار شامل ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

بکرے ہیں سب دیکھے بھالے

عید کی بھی کیا بات ہے۔ امیر ہو یا غریب عید سب کو اچھی لگتی ہے اس موقع کے لیے کیا کیا انتظام کرنے پڑتے ہیں۔ کیا کیا پاپڑ بیلتے ہیں بچے نئے جوڑے سلواتے ہیں۔ فرمائشوں پر کھانے پکتے ہیں جو وقت پر تیار ہوتے ہیں اور جس کی جب کی تیاری کی جاتی ہے جس نان دوران کا سب ہوتا ہے جس میں سب تیار ہوتے ہیں اور جن پکوں کی فرمائش پر آسکتی سے پیٹ بھرتے ہیں غرضیکہ عید اپنے ساتھ کئی خوشیاں لاتی ہے اور قربانی والی عید تو قابل دید ہوتی ہے۔

اس دفعہ گوشت خریدنے کی صورت گزشتہ سال سے چند زیادہ بڑھ چکی ہے اور اس کی قدر و قیمت کا اندازہ اس عید پر ہوا کہ جن کی عید کا مرکزی کردار بکرے ہی ہوتے ہیں کی کردگی چاہے تو بچہ عید کی کمائی بند کرے کا حصول اس عید کی خوشی کا سبب ہے۔ اب یہ کہ بکرے کی قیمت بھی کہ ترقی کے دور میں ..... تنخواہ والے کسی نہیں دیتے زیادہ محتاط ہوتے ہیں۔ عرف عام میں بکرے والی تے ہیں ہونے سے کہیں بڑی رقمیں دے کر بھی یہ بولے تو امام مسجد کا فتویٰ ہے کہ قربانی کے بکرے میں عیب نہیں ہونا چاہئے اس لیے چیزیں دیکھ بھی لیں اور بکرا منڈی پہنچ بھی جائیں تو بکرے کی قدر و قیمت ہے کہ پیچیدہ ہو اور شکل ہے اور صحیح بھی ہے کہ بکرا بے عیب ہونا چاہئے۔ لیکن پھر شرط ہے کہ بکرے کی صحت کو پیچ کرنا ہوں کان، آنکھ سینگ ہونی چاہئیں دانت ہوں جن عادت میں بتدریج ہو جیسے کہ علماوں کو بکروں سے حسب نسب سے آگاہی حاصل ہوتی ہے بھی ایک مضمون کے بارے سوچا کرتے تھے کہ زمانہ ہی نہیں ہے لیکن علم جانور شناسی کے کتے ہیں بکرا منڈی جا کر اس علم کی اہمیت کا اندازہ ہوا کہ اسے پڑھا ہوتا تو عمر از علم بکرا شناسی تو جانی ہے بکرا منڈی سے آرتی اور مالکان علم میں خاصا اضافہ کرتے ہیں کہ یہ بکرا کس نسل کا ہے یہ چست، تیز رفتار اور صحت مند ہے۔ قیمت پوچھا جاتا ہے تو اس سے آگے بڑا روپے بتاتا ہے جب کہ ہمارے پاس صرف دو ہزار روپے ہوتے ہیں لہٰذا سمجھ میں نہیں آتا کہ بکرے والے سے نہ جانے کتنے ہے۔ اس کے لئے تو کوئی مرکزی وزارت ہونی چاہئے جو قیمتوں کا تعین کرے جب ایسی وزارت ہوگی تو پھر وزیر کا تقرر بھی ضروری ہے مگر خزانہ اتنا متحمل نہیں ہو

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

سکتا ویسے بھی اس وزارت کا کوئی فائدہ نہیں "متاثرین بکرا" کو کوئی رعایت نہیں مل سکتی اگر کوئی بکرا ہماری قیمت پر پورا اترتا بھی ہے تو اسکی درویشی کو دیکھ کر ترس آتا ہے کہ ایسے حلیم الطبع، لاغر اور کمزور بکرے کو کیسے گھر لے جائیں چل کر تو جا نہیں سکتا البتہ تانگے یا ریڑھی پر لے جاتے ہیں گھر آکر بکرا اس خشوع و خضوع سے اٹھتا بیٹھتا ہے کہ اسکی بزرگی اور گریہ زاری سے اہل محلہ داد نہیں دیتے بلکہ فریاد کرتے ہیں کہ اسے چپ کرایا جائے اور اسے احساس دلایا جائے کہ کوئی پڑوس میں بیمار بھی ہو سکتا ہے یا کوئی طالب علم محو مطالعہ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بکرا ہے ریڈیو تو نہیں کہ اسے بند کر دیں۔

بکر منڈی میں کچھ بکرے ایسے بھی ہیں جنہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے ان پر خاصا کام کیا گیا ہے ان پر کیسے کیسے صدری نسخے استعمال کئے گئے ہیں۔ بعض بکروں کو بیسن کھلا کھلا کر ایسا موٹا کیا گیا ہے جیسے کسی سائیکل کی پرانی ٹیوب میں ہوا بھر دی گئی ہو بعض بکرے، دنبے، مینڈھے ایسے بھی ہیں جو قبائلی علاقے سے آئے ہیں ان کے مالکان کا مؤقف ہے یہ معمولی بکرے نہیں بلکہ وہ بکرے ہیں جن سے قبائلی روایات زندہ ہیں یعنی بجی کی ضیافتیں انہیں کے دم قدم سے ہیں۔ یہ بکرے چنے نہیں کھاتے بلکہ پہاڑی علاقوں کی جڑی بوٹیاں کھا کر جوان ہوئے ہیں انکے گوشت کا ذائقہ خشک اور پر لطف ہے۔ جی میں آتا ہے کہ ایسا بکرا گھر لے جائیں مگر جیب کا یہ عالم ہے کہ ایک طرف بکرا ہے دوسری طرف جیب میں صرف دو ہزار روپے ہیں اور بکرا آٹھ ہزار روپے کا ہے اب بتائیں کہ صدری نسخوں سے پلے ہوئے بکرے اور جڑی بوٹیوں کی تاثیر والے بکرے کیسے ہاتھ آئیں۔ بہر حال بکرا ہمارے معاشرتی سٹیٹس (Status) کا ایک سمبل ہے جس گھر کے سامنے تین بکرے بندھے ہوں آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اہل محلہ پر ان بکروں کی ہیبت کتنی ہوتی ہے اور جہاں ایک بکرا ہو اور وہ بھی محرومیوں کی آغوش میں پلا ہو اسکی قربانی سے "جاودانی" کی بجائے پشیمانی ہوتی ہے کیسے اس کو زحمت دی۔ یہ تو خود ہمدردی کا مستحق تھا۔ بہر حال اس امر کی خوشی ہوتی ہے کہ کسی عام قصائی کی دکان پر بکنے سے بچ گیا اور عید قربان پر کئی سعادتوں اور کامرانیوں کو ہمراہ لیکر سرخرو ہوا۔ اس عید کی ایک خاص بات ہے کہ ہر طرف بکرے ہی بکرے نظر آتے ہیں ان کے بیٹھنے اٹھنے کا منظر بھلا لگتا ہے کچھ چست ہیں کچھ کاہل ہیں، کچھ لاغر ہیں کچھ بیمار لیکن قربان ہونے کا جذبہ انہیں بازار مصر میں لایا ہے۔ انکی اس سعادت مندی کو دیکھ کر بے اختیار پیار کرنے کو جی چاہتا

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ہے مگر ہم ان سے محبت بھی نہیں کر سکتے کیونکہ ان کی قیمت ہمیں اتنے قریب نہیں آنے دیتی۔ البتہ کارپوریشن اور ایم ڈی اے والے ان سے بے حد پیار کر رہے ہیں کارپوریشن کو پہلے ہی ہفتہ صفائی سے چڑ ہے اب ان کا عذر معقول ہے کہ کیا کریں ہر طرف بکرے ہی بکرے ہیں کہاں صفائی کریں ایم ڈی اے والے بھی خوش ہیں کہ جن تجاوزات سے ان کو تکلیف ہوتی تھی اب یہ تجاوزات بکروں نے کر رکھی ہے جب تک بکرے نہیں جائیں گے ان کو ان فرائض کی بجا آوری کا موقع نہیں ملے گا۔ ویسے بھی کروڑوں کے سامنے پھیلے ہوئے ہزاروں کی صورت میں جو تجاوزات موجود تھیں انکا ان بکروں نے صفایا کر دیا ہے لہذا ایم ڈی اے حکام خوش ہیں کہ ان بکروں کے خلاف کوئی صاحب خانہ کاروائی نہیں کرے گا۔ بہر حال ایک طرف بکرے ہیں اور دوسرے طرف وضعدار سفید پوش مسلمان۔

زخمی ادھر ہے میرا دل
چھلنی ادھر میرا جگر
مرہم گائے چارا گر
آدھا ادھر آدھا ادھ
ساری باتیں اپنی جگہ
گھر میں بکرا آنا چاہئے

یہی مناسب ہے جیسا بکرا بھی ملے وہی بکرا گھر لے جائیں بکرے ہیں بکرے ہیں سب دیکھے بھالے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

30

آؤ دعائیں اکٹھی کریں

دعائیں کیسے اکٹھی ہوتی ہیں؟ ''سننے والے نے حیرت سے پوچھا کہنے والے نے قدرے تحمل سے کہا اس کے لئے کسی بڑے سرمایہ کی ضرورت نہیں'' بس دعائیں اکٹھی کرنے کا جذبہ ہونا چاہئے۔ دعائیں آپ کے اردگرد موجود ہیں بس انہیں تلاش کیجئے اور مل جائیں تو ان کی سرمایہ کاری کیجئے یہ سرمایہ ایسا ہے کہ اس پر نہ مارک اپ کا مسئلہ ہے نہ سالانہ زکواۃ کٹوتی کا بلکہ اس سے اثاثے بڑھتے ہیں کم نہیں ہوتے لیکن ''یہ دعائیں ملتی کہاں سے ہیں؟ میں لینا چاہتا ہوں'' سننے والے نے دوبارہ سوال دہرایا اور کہنے والے نے پھر کہا یہ دعائیں آپ کے اردگرد موجود ہیں کبھی آپ نے دیکھا ٹریفک کا سپاہی کسی ضعیف بزرگ خاتون کو سڑک کیسے پار کراتا ہے۔ کبھی کوئی راہ چلتا کسی معصوم بچے کو گھر کا راستہ بتاتا ہے۔ کبھی ویگن میں بیٹھا ہوا نوجوان کسی بزرگ کو اپنی سیٹ دے دیتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوا ہے سگریٹ پینے والا کسی بزرگ کے آجانے پر سگریٹ بجھا دیتا ہے حالانکہ بزرگ اسے منع نہیں کرتا بلکہ کہتا ہے کہ بیٹا سگریٹ پیتے رہو مجھے کوئی اعتراض نہیں وہ جواب میں کہتا ہے بزرگو آپ کی عمر میرے باپ کے برابر مجھے شرم آتی ہے!

بات دعا کی ہو رہی تھی دعا انسان کی وحشی جبلتوں کی تہذیب کرتی ہے عملی اور تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرتی ہے۔ اسے رفعتوں سے ہمکنار کرتی ہے۔ سوز جگر پیدا کرتی ہے رحمت و شفقت سے سرشار کرتی ہے۔ دعا دوسروں کی انسانیت جگاتی ہے انسان سے محبت کا راستہ دکھاتی ہے خالق سے ملنے اور مخلوق سے رشتے نبھانے کا درس دیتی ہے یہ وہ نیکی ہے جس کی ہر شخص ہر بزرگ نے خواہش کی ہے۔ تمنا کی ہے۔ راتیں صرف کی ہیں شب بیداریوں میں اور دن کے اجالوں میں اسے تلاش کیا ہے علامہ محمد اقبال نے کیا خوب کہا ہے۔

اٹھ بھوکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل
اس شہر کے خوگر کو پھر وسعت صحرا دے
بے لوث محبت ہو، بے باک صداقت ہو
سینوں میں اجالا کر دل صورت مینا دے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

خاموش نداء ہے۔ ایک پکار ہے ایک آرزو ہے۔ ایک امنگ ہے۔ کچھ حاصل کرنے کی اور کچھ کر دکھانے کی۔ اس کا اپنا ابلاغ ہے جو جدید ابلاغ سے زیادہ مؤثر، تیز اور ہمہ گیر ہے۔

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا ہوں
میرے مولا، مجھے صاحب جنوں کر

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

سلوٹوں کو جانے والے راستے اور کلیاں

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

مہکی مہکی نظر آتی ہے اکثر سکول ایسی گلیوں میں قائم ہیں جہاں صفائی والا عملہ شاید عیدبرات پر نظر آتا ہے آگے پیچھے ان کی شکلیں اجنبی نظر آتی ہیں کچھ سکول اچھی سڑکوں پر بھی قائم ہیں مگر ان سڑکوں کی ٹریفک کا شور بچے کو متاثر کرتا ہے اور وہ پڑھائی میں کم توجہ لگاتا ہے بلکہ رکشا ویگن کے ہارن اسکی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔

ملتان کا ایک ایسا پر رونق علاقہ بھی ہے جسے لودھی کالونی کہتے ہیں جو کبھی ملتان کی گرین بیلٹ کہلاتا تھا ایک نالہ تھا جو اب سڑک کی شکل اختیار کر گیا ہے اس نالے پر اب ایک سڑک ہے اور یہ سڑک ایک اچھے سکول کی طرف جاتی ہے لیکن بچے جس طرح سکول سے تین فرلانگ پہلے جس تعفن سے گزر کر جاتے ہیں اس اذیت کا اندازہ یا تو والدین کر سکتے ہیں جو روزانہ بچوں کو سکول چھوڑنے جاتے ہیں یا بچے خود اندازہ کر سکتے ہیں جو اس کوڑا کرکٹ پر ہر وقت آگ اور دھواں کے شعلے دیکھتے ہیں ہوا چلنے سے جس قدر ماحول میں بے زاری پیدا ہوتی ہے کاش یہ کالم اسکی سنگینی اور تلخی کو واضح کر سکتا حیرت یہ بھی ہے کہ آج تک کسی نے اس پر احتجاج نہیں کیا اہل محلہ جو اس کوڑا کرکٹ کے گرد مکانوں میں رہتے ہیں شاید اس لئے خوش ہیں کہ چوری چکاری سے یہ علاقہ محفوظ ہے کیونکہ چور کو اس علاقہ میں آنے کے لئے آکسیجن ماسک پہن کر آنا پڑے گا ورنہ بچ کر جا نہیں سکتا بعض اوقات حیرت ہوتی ہے کہ کچھ افراد اور معاشرے ایسے بھی ہیں جو انسانیت کی فلاح بقاء کیلئے فلاحی منصوبے بناتے ہیں اپنی جائدادیں وقف کر دیتے ہیں ٹرسٹ بناتے ہیں اپنی شاندار حویلیاں تعلیمی اداروں کو دے دیتے ہیں ہسپتال بناتے ہیں اور مریضوں کیلئے مفت حکومت کے حوالے کر دیتے ہیں گلاب دیوی ہسپتال اسکی مثال ہے میاں منشی ہسپتال اسکی دوسری مثال ہے سر گنگارام نے پہلے کالج آف کامرس لاہور کو اپنی شاندار کوٹھی دے دی نواب بہاولپور نے مال روڈ لاہور پر قائم اپنا محل پنجاب یونیورسٹی کے حوالے کر دیا آج یہ عمارات اربوں روپے کی مالیت کی ہیں آج کوئی محل نہ دے کوٹھی بھی وقف نہ کرے کم از کم سکول کے جانے والے راستے تو بہتر بنا دے تاکہ بچے خوشی سے سکول جا سکیں مگر ایسا کیسے ممکن ہے ہمارے معاشرے میں Synthelic مشروبات پر ۲۰۰۰ ملین روپے درآمد پر خرچ ہوتے ہیں اور پان چھالیہ کی درآمد پر ۳۳۲ ملین روپے اور بچوں کی کتابوں اور دیگر تعلیمی سامان پر صرف ۱۳۷ ملین روپے صرف ہوتے ہیں اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تعلیم سے تو پان چھالیہ بھی ترجیح لے گیا سکول کے راستے کشادہ صاف اور اچھے کب ہوں گے اور راستوں کی غلاظت کے خلاف کون آواز اٹھائے گا؟

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

مسئلہ کشمیر۔ مضامین گجرال کے آئینے میں

نئے بھارتی وزیراعظم کی سوچ وہی ہے جو نہرو، اندرا گاندھی اور شیخ عبداللہ کی تھی

اندر کمار گجرال کی تحریریں دیکھ کر مسئلہ کشمیر کے حوالے سے تمام امیدیں بلا جواز محسوس ہوتی ہیں

وہ مظلوم کشمیریوں کو ان کا حق دلانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو برصغیر کی تاریخ میں انہیں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکے گا

انہیں کشمیر کے سیاسی پس منظر میں بھارتی مظالم نہیں، دہشت گردی کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے

انہوں نے لکھا ہے کہ عوام ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو ان کے والد کا صحیح نعم البدل سمجھتے ہیں

جب سے اندر کمار گجرال بھارت کے وزیراعظم بنے ہیں امیدوں اور توقعات کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ اخبارات کے اداریے، تجزیے اور مبصرین کی آراء جاری و ساری ہے۔ کسی نے کہا ہے یہ [illegible] سالہ پنجابی وزیراعظم ایک [illegible] مشفق اور روشن خیال مدبر کی طرح بھارت اور پاکستان کے تعلقات کو معمول پر لانے میں اہم کردار ادا کرسکتا ہے۔ کسی نے جہلم کے حوالے سے مسٹر گجرال کے وہ ساتھی ڈھونڈ نکالے جو ان کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلا کرتے تھے۔ کسی نے اہل جہلم کی اپیل شائع کر دی ہے کہ مسٹر گجرال اب کشمیر کا مسئلہ حل کروا دیں۔ کسی نے کہا ہے کہ اب مسئلہ کشمیر حل ہونے کے روشن امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔ اب مظلوم کشمیریوں کی سنی جائے گی۔ "اور کشمیر بنے گا پاکستان" جیسی حقیقت معرض وجود میں آ جائے گی۔ بہر حال ابھی اخبارات، جرائد و رسائل کا یہ سلسلہ خوش نما اور خوش آئند پہلوؤں اور

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

دعووں سے بھرا پڑا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ۲۳ اپریل کے اخبارات میں بھارتی وزیر دفاع ملائم سنگھ یادیو نے پارلیمنٹ میں بیان دیتے ہوئے کہا ہے ''بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش کی کنفیڈریشن قائم کر دی جائے تاکہ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں میلی آنکھ سے نہ دیکھ سکے''۔ بے شک بھارت جی بھر کر میلی آنکھ سے دیکھتا رہے۔ مزید انہوں نے کہا پچاس سال کے بعد سہی اب اس خواب کی تعبیر ہونی چاہیے اور آج سے پچاس سال پہلے بھارت تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ان بیانات سے ہندو ذہن کی عکاسی بھرپور انداز سے ہوتی ہے کہ وہ آج بھی تقسیم ہند کو نہیں بھولے اور اب خوش نما، خوش ادا لفظوں سے اور اس کے اندر پوشیدہ زہر سے مسلمانوں کو پھر سے گمراہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کی دانشور نے کہا تھا کہ ہندو کیا ہے؟

"They Worship the Cow, then milk the Cow and put the milk to the Cobra"

ہندو گائے کی پوجا کرتا ہے اور پھر پوجا کیے جانے والے جانور کو بھی معاف نہیں کرتا اس سے بھی دودھ لے لیتا ہے اور پھر اس دودھ کو سانپ کے آگے ڈالتا ہے تاکہ اپنا دفاع مضبوط کر سکے۔ یہی ہندو ہے جو سوراج کے نام پر شیوو جی راج قائم کرنا چاہتا تھا۔ اسی ہندو نے بھارت کے مسلمانوں کا جینا حرام کر دیا ہے۔ گزشتہ پچاس سالوں میں ہزاروں کی تعداد میں ہندو مسلم فسادات ہو چکے ہیں۔

ہماری ایک زبان ایک تہذیب اور ایک ہی رسم و رواج پھر ہم کیوں نہ اکٹھے رہیں۔ مسلمان اللہ کہتا ہے اور بھارتی ہندو ایشور بھلا اس میں کیا فرق سیکولر سٹیٹ ہونے کے ناطے بھارت اپنے باشندوں کے حقوق اور رسم و رواج کے فروغ کا حامی ہے۔ اب حقیقت سے ان باتوں کا جائزہ لیا جائے مسلمان اور ہندو کی تہذیب ایک جیسی کیسے ہو سکتی ہے اور اگر ایک تہذیب تھی تو پھر تقسیم ہند کا مسئلہ کیا تھا؟ مسلمانوں نے اپنے تشخص کیلئے علیحدہ آزاد مسلم مملکت کا نعرہ کیوں لگایا اور لاکھوں انسانوں کے معصوم خون کا نذرانہ کیوں پیش کیا۔ آگ اور خون میں ڈوب کر آزادی کی منزل کیسے حاصل کی۔ کتنے سر کٹے کتنے دربدر ہوئے یہ سب ایک تہذیب ایک تمدن اور ایک کلچر کے مظاہر تھے۔ ''مضامین گجرال'' کے نام سے ایک کتاب دسمبر ۱۹۹۶ میں مطبوعات ہفت روزہ ''اصول'' کراچی نے شائع کی ہے جسے جناب

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

شائع کی۔ انور محمود نے کس نقطہ نظر سے شائع کیا ہے کہ اندر کمار گجرال سے ان کی شناسائی ایک عرصہ سے ہے اور یہ وہ مضامین ہیں جو اندر کمار گجرال نے روزنامہ سیاست حیدر آباد انڈیا میں شائع کرائے اور بعد میں انہیں کتابی شکل دی گئی۔ یہ مضامین ان کے وزیر خارجہ ہونے سے قبل میں شائع ہوئے جب وہ وزیر اعظم بھارت ہیں ان مضامین میں ان کی سوچ کشمیر کے حوالہ سے وہی ہے جو شیخ عبداللہ کی تھی جو فاروق عبداللہ کی اب ہے اندر کمار گجرال نے انہیں نقطہ نظر کو آگے بڑھایا ہے وہ ایک ترقی پسند ذہن رکھنے والے اور زبان انگریزی کے کھاری دنی، سماجی، سیاسی تہذیبوں سے تعلق رکھنے، سمجھنے اور سوچنے کی وجہ سے دیگر بھارتی وزرائے اعظموں سے مختلف ہو سکتے ہیں ان کے معتدل ہونے، پنجاب کی وضعداریوں اور سرزمین جہلم کے ناطے کشادہ دلی پیدا ہو جائے تو محض جغرافیائی اثرات ہو سکتے ہیں۔ ان کے ہندو ہونے اور بھارتی رہنما ہونے کے ناطے ان کے خیالات وہی ہیں جو پنڈت جواہر لال نہرو کے تھے اندرا گاندھی کے تھے اور دیگر وزرا کے تھے۔ وہ ان سے الگ یا مختلف نہیں۔ ہماری خوش قسمتی کہ اندر کمار جی کی پیدائش جہلم ہے۔ ان کی تعلیم ایم۔ اے، بی کام، پی۔ ایچ۔ ڈی، ڈی لٹ ہے۔ ادیب اور دانشور، قومی امور کے تبصرہ نگار، ممتاز شاعرہ اور ادیب مسز شیلا گجرال سے شادی کی۔ جن سے دو لڑکے ہیں۔ ان کا دلی گہرا انوں سے تعلق تو ظاہر کرتا ہے لیکن کشمیر کو آزاد کرانے اور پاکستان سے روابط کو بڑھانے کے عزم کا اظہار نہیں ہوتا۔ یہ درست ہے کہ وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتے سٹوڈنٹ یونین کے صدر رہے۔ تحریک آزادی میں بھی حصہ لیا۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ کی قرارداد پاکستان کے وقت منٹو پارک میں موجود تھے اور حضرت قائد اعظم محمد علی جناح کے خطاب کو سننے کا انہیں اتفاق بھی ہوا۔ لاہور سے جذباتی لگاؤ بھی رکھتے ہیں۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ ہمارے موجودہ وزیر اعظم میاں محمد نواز شریف صاحب کا تعلق بھی لاہور سے ہے اور گورنمنٹ کالج لاہور کے فارغ التحصیل ہونے کا شرف بھی رکھتے ہیں آئندہ ماہ ستمبر میں ہونے والی سارک سربراہی کانفرنس بلا شبہ مفید نتائج کی حامل ہو سکتی ہے کہ دونوں رہنما گزشتہ پچیس سالہ تاریخ کا جائزہ لیں جو جنگ ۱۹۶۵، اعلان تاشقند، پھر ۱۹۷۱ کی جنگ، سقوط ڈھاکہ اور سرحدی تنازعے اور سب سے بڑا مسئلہ کشمیر جس کی وجہ سے کشمیریوں کا مستقبل بھارتی حکمرانوں کی مثبت سوچ پر منحصر ہے۔ اس کے علاوہ اندر کمار گجرال کو جہاں بھارت کے اندر مضبوط، مستحکم حکومت کو قائم کرنے کیلئے محسوس

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

اقدامات اٹھانے ہیں اسی طرح انہیں خارجہ مسائل میں ترجیح کشمیر کے مسئلہ کو حل کر کے ہمسایہ ممالک کو یقین دلانا ہے کہ بھارت کی توسیع پسندانہ پالیسی بدل گئی ہے تنازعہ کشمیر پاکستان اور بھارت تعلقات میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کانگریس نے گزشتہ ۴۸ سالوں میں اس مسئلہ کو پیچیدہ سے پیچیدہ تر بنانے کی پالیسی اپنائے رکھی ہے اب موجودہ وزیراعظم بھارت کو اس مسئلہ کو حل فوری اور پائیدار تلاش کرنا چاہئے۔ یہ انکے تدبر، فکر اور ذہانت کا امتحان ہے کہ وہ روایتی بار ہویں وزیراعظم ثابت ہوتے ہیں جنہوں نے اس مسئلہ کو بھارت کا اندرونی مسئلہ قرار دیکر مسئلہ کی اہمیت سے انکار کیا۔

جناب اندر کمار گجرال کی خدمت میں نہایت سنجیدگی سے عرض ہے کہ وہ تنازعہ کشمیر کا ٹھنڈے دل و دماغ سے مطالعہ کریں اور اس سوچ پر بھی نظر ثانی کریں جس میں وہ بنیاد پرستوں کا مسئلہ کہہ کر عافیت تلاش کر لیتے ہیں۔ تاریخی حقیقت میں جموں و کشمیر سے متعلق تنازعہ نوآبادیاتی نظام کے خاتمہ کا بچا کھچا مسئلہ ہے۔ یہ دو اہم پہلوؤں کے اعتبار سے سامراجیت کی پیداوار ہے۔ سب سے پہلے ۱۹۴۶ میں سامراجی طاقت برطانیہ نے ایک بیع نامہ کے ذریعے جموں و کشمیر کا علاقہ ایک جاگیردار کے حوالہ کیا دوسری باری ۱۹۴۷ میں اس جاگیردار کے جانشین مہاراجہ کو ریاست کے پاکستان کے ساتھ قدرتی الحاق کو روکنے میں برطانیہ کے سوا اور کسی نے مدد فراہم نہیں کی۔ دم توڑتی ہوئی استعماری طاقت ہندوستان میں قائم ہونے والی حکومت اور کشمیر کے مہاراجہ کے درمیان سہ طرفہ گٹھ جوڑ ی مسئلہ کشمیر کی جڑ اور بنیادی وجہ ہے۔ اس وقت پاکستان ایک نوزائیدہ ملک کی حیثیت سے معارض وجود میں آیا اسے اپنی حکومت کی بنیادیں ڈالنے کا عظیم چیلنج درپیش تھا وہ ایسے وسائل سے محروم تھا جن کی مدد سے اس سازباز کو ختم کیا جا سکتا ہے اور اس مسئلہ کی وجوہ کو دور کر سکتا جو جنوبی ایشیا میں امن و ترقی پر مسلسل اثر انداز ہو رہا ہے۔ مسئلہ جموں و کشمیر جنوبی ایشیا میں ایک حل طلب بین الاقوامی تنازعہ ہے جب تک اسے منصفانہ طور پر حل نہیں کیا جاتا علاقہ میں عدم استحکام اور کشیدگی جاری رہے گی۔ اس طرح دونوں ملکوں کے وہ وسائل جو عوام کی بہتری کے لئے صرف ہونے چاہئیں وہ جنگوں، سرحدی تنازعوں اور ایک دوسرے کو سفارتی سطحوں پر الجھانے پر صرف ہوں گے۔ آیئے اندر کمار گجرال کی کشمیر پالیسی کا جائزہ لیتے ہیں انکی تحریریں کیا کہتی ہیں اور وہ آجکل کیا کہتے ہیں۔ ۱۸ اکتوبر ۱۹۸۹ کو انکا ایک مضمون جس کا

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ایک شعر علامہ محمد اقبال کا ہے

آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

دوسرا شعر یہ ہے۔

سینچا ہے اسے خون سے ہم تشنہ لبوں نے
تب جا کے اس انداز کا مے خانہ بنا ہے

خدا کرے کہ آزادی کا، مظلوم کی فریاد سننے کا اور کشمیریوں اور بھارتی مسلمانوں کی فلاح کا کوئی ایسا مے خانہ اندر کمار گجرال تشکیل دینے میں کامیاب ہو جائیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

تجوریوں کے تالے کب کھلیں گے؟

بے روزگاری بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ اس کا کرب اسی شدت سے وہی آگاہ ہو سکتا ہے جس نے کبھی رزق سے محرومی کی راتیں کاٹی ہوں، کبھی خالی جیب رہنے کا تجربہ حاصل کیا ہو، کبھی کسی سے مانگ کر سگریٹ پیا ہو، رشتے اور دوستوں میں تیکھے جملے برداشت نہ ہو اور کئی موڑ ملازمتیں، سے سے غلط سے کر کے بچا ہو۔

آئیں آپ کی ملاقات ایک ایسے نوجوان سے کراتے ہیں جو گزشتہ پانچ سال سے بے روزگار ہے۔ کبھی کبھار وقتی ویجز پر اسے کام ملتا ہے لیکن نوکری پکی نہ ہونے کی وجہ سے ایسے کاٹ دیا جاتا جیسے دودھ میں سے مکھی کو نکال باہر کیا جاتا ہے۔ اسکی تنخواہ میں سے کٹوتیاں ایسے کاٹی جاتی ہیں جیسے نوآموز صحافی کے مسودہ کا حشر ہوتا ہے میں نے اس نوجوان سے پوچھا کیا وجہ ہے آپ کو نوکری نہیں مل رہی اس نے آہ سرد کھینچتے ہوئے کہا ابھی تجربہ کار ہونے کا حصہ نہیں آیا تھا۔ اس نے کہا میں تو آپ کے پاس آیا ہی اس لئے ہوں کہ آپ مجھے اپنے کالم کا موضوع بنائیں۔ میری ذات میں فیچر نگاری کے لئے وسیع مشاہدات اور تجربات ہیں۔ اداریہ نویسی جیسے محنت طلب ہیں اور کالم میں چونکا دینے والے حالات و واقعات ہیں۔ کاش کوئی مجھے اپنے کالموں میں جگہ دیتا اور مجھے مثال بنا کر ان چار کروڑ نوجوانوں کے مسائل اجاگر کرتا جو نوکری کی تلاش میں صبح سے شام تک سرگرداں رہتے ہیں جنہیں گھر سے نیک تمناؤں کے ساتھ رخصت کیا جاتا ہے اور جب وہ شام کو منہ لٹکائے گھر آتے ہیں تو انہیں صبح سے زیادہ گرمجوشی اور مؤثر ابلاغ جس کا مظاہرہ کبھی آپ نے سبزی منڈی اور غلہ منڈی میں ہونے والے انداز تکلم سے لگا سکتے ہیں پہلے اس سے تواضع کی جاتی ہے اور پھر وہ ماں جو اپنے لال کے لئے تحفے اور دعائیں کرتی ہے اس لال کو صبح کے پکے ہوئے سالن اور روٹی سے سلا دیتی ہے۔ جناب میں اپنی نظروں میں خود گر گیا ہوں۔ جس دفتر میں جاتا ہوں وہاں سے جواب ملتا ہے کہ یہاں کوئی خالی جگہ نہیں۔ ابھی نوکریوں پر پابندی ہے۔ کہیں سے جواب ملتا ہے کہ مایوس نہ ہوں عنقریب کوئی جگہ نکلے گی۔ اخبار میں اشتہار دیں گے۔ آپ اخبار کا مطالعہ جاری رکھیں جونہی اشتہار چھپے دفتر ہذا سے رجوع کریں۔ چھوٹے ادارے ملازمت کے خواہشمندوں کو کہا جاتا ہے "دیکھئے جی ایک سکیم زیر غور ہے اس میں نوکریاں ہوں گی بس انتظار کریں

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کہ ہیڈ آفس سے اس سکیم کی منظوری آجائے" ہوتا یوں ہے کہ نہ کہیں سکیم ہوتی ہے اور نہ ہی منظوری کا مرحلہ درپیش ہوتا ہے اور امیدوار جوتیاں چٹخا چٹخا کر آدھ موا ہو جاتا ہے اور پھر

.....

جو تیری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

اگر کہیں واقعی نوکری کا امکان پیدا ہو جائے اور تعلیم بھی درست قرار پائے تو قسمت کی بات دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند۔ سارا بنا بنایا کھیل تجربہ کے خانہ میں بگڑ جاتا ہے۔ دفتر والے تجربہ مانگتے ہیں لیکن تجربہ کہاں سے لائیں۔ گزشتہ پانچ سال سے بے روزگار رہنے کا تجربہ تو ہے لیکن کام نہیں ملتا۔ انہیں ملازمت کا تجربہ چاہئے، میرے بے روزگار نوجوان نے بتایا نوکری کیلئے جہاں جہاں سے اطلاع ملتی ہے وہاں وہاں درخوستیں بھیجتا رہتا ہوں لیکن کہیں سے جواب آجاتا ہے کہ فلاں تاریخ کو انٹرویو ہے آجاؤ اور کہیں سے سرے سے جواب ہی نہیں آتا۔ شاید انہیں مجھ سے ہمدردی ہے کہ آنے جانے کے اخراجات کچھ زیادہ بڑھ گئے ہیں۔ ویسے بھی آجکل کا سفر غیر محفوظ ہے انکی اس سوچ پر خوشی بھی ہوتی ہے اور انکی حقیقت شناسی کا بھی علم ہوتا ہے۔ اگر وہ واقعی بلا لیتے سارا دن بھوکا پیاسا بٹھائے رکھتے تو میں انکا کیا بگاڑ لیتا، ایسے ہی موقعوں پر انگریزی کا وہ محاورہ یاد آتا ہے جو کچھ یوں تھا-Beggers are never choos ers لہذا صبر شکر کے ساتھ بیٹھ جاتا ہوں البتہ محلّہ کی جس ہستی سے ڈر لگتا ہے وہ پروفیسر صاحب ہیں جو گزشتہ پانچ سال سے میری اسناد، سرٹیفکیٹ تصدیق کرتے کرتے تھک گئے ہیں۔ جب میں اپنی اسناد کی فوٹو سٹیٹ کاپیوں ایک تھیلا بھر کر ان کے گھر جاتا ہوں وہ خوشی سے تصدیق کر دیتے تھے لیکن اب وہ کچھ دنوں سے اس کام کو بوجھ سمجھنے لگے ہیں۔ ایک بار میں جب ان کے گھر فوٹو سٹیٹ اسناد تصدیق کرانے گیا تو انہوں نے کہا "نعیم! تجھے کب نوکری ملے گی؟" جب میں چپ رہا تو وہ خود تصوف کی کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ شاید وہ کہہ رہے ہوں.....

خود بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

کبھی لوگ کہا کرتے تھے کہ درد دل رکھنے والے لوگ بھی اسی دنیا میں بستے ہیں اور جو خاموش دعاؤں سے لوگوں کو اپنا گرویدہ کر لیتے ہیں۔ ایسے دیدہ بینا نے قوم کو شاعر ان لفظوں میں خراج تحسین ادا کرتے ہیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

اب نہیں معلوم کہ آنکھ نے اشکبار ہونا کیوں چھوڑ دیا ہے۔ معاشرے میں نعمت تو ہے زندگی میں تمکینی کیوں ختم ہو رہی ہے۔ اہل درد تو ہیں لیکن تجوریوں پر تالے کیوں لگے ہیں۔ زر تو ہے لیکن گردش میں کیوں نہیں۔ بینکوں کے ڈپازٹ بڑھ گئے ہیں لیکن سرمایہ کاری کیوں نہیں۔ صنعتیں تو ہیں مگر پیداواری ہدف کیوں رک گیا ہے۔ زراعت تو ہے لیکن آٹا کیوں نہیں ملتا۔ وسائل اور ذرائع تو ہیں مگر صنعتیں کیوں نہیں لگتیں۔ کاروبار کیوں نہیں بڑھتے۔ سب کچھ موجود ہے تو تجوریوں پر تالے کیوں ہیں؟! انہیں کون کھولے گا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تالے کو زنگ لگ گیا ہے اور چابی کہیں کھو گئی ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

اعلیٰ سند اور قبائے فضیلت

کبھی جبہ و دستار ہمارے علمی وقار کی علامت تھا اور ہماری درس گاہیں نصاب و کتاب تک محدود نہ تھیں بلکہ دار العمل اور دانش کدہ کہلاتی تھیں۔ ان اداروں کے در و دیوار، سنگ و خشت، فکر و نظر، جذبہ حریت اور عزم و نظم کی علامت تھے بلکہ ہماری تاریخ شاہد ہے کہ انہیں اداروں سے تحریک آزادی اور قیام پاکستان کے قافلے مختلف منزلوں کو روانہ ہوئے تھے۔ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور، اسلامیہ کالج پشاور، مدرسۃ الاسلام کراچی، انجمن اسلامیہ ملتان غرضیکہ انہی اداروں کی خدمات کے ثمرہ میں ہمیں پاکستان ملا۔ یہ ادارے سکوت ساحل نہیں تھے تلاطم دریا تھے۔ بظاہر یہ معمولی نوعیت کے کیمپس پر مشتمل تھے اکثر انہی اداروں میں ایسے ادارے بھی تھے جو مٹی اور گارے کی کچی دیواروں اور کھجور کے پتوں سے بنی چھتوں سے تعمیر کئے گئے تھے مگر ان کے باوجود علم و عرفان کی ان میں ایسی شمعیں روشن تھیں جو وقت کی تیز آندھیوں میں بھی فروزاں رہیں۔ ان اداروں سے فارغ التحصیل طلباء جب اسناد حاصل کرتے اور قبائے فضیلت پہنتے تو ان کے وقار اور کردار کی بلندی کوہ ہمالیہ سے بھی اونچی نظر آتی اور پھر یہ قریہ قریہ، کوچہ کوچہ ابلاغ عام کیلئے اس طرح مصروف رہتے کہ انہیں دیکھ کر ایک متحرک یونیورسٹی کا گمان ہوتا۔ ان کے تجربات تاریخ کا حصہ بنتے۔ ان کے مشاہدات پر ایجاد، تخلیق کے مرحلے طے ہوتے۔ ان کے رشحاتِ قلم ان کے گہرے مطالعہ کا نچوڑ ہوتے۔ اس بات کی بھی تاریخ کے اوراق گواہی دیتے ہیں ان کی تصانیف آج بھی ان کے فکر کی صداقت اور افکار کی پختگی کی مظہر ہیں۔ شاید علامہ محمد اقبالؒ نے کچھ انہی ہستیوں سے متاثر ہو کر کہا تھا.....

حاصل کسی کامل سے یہ پوشیدہ ہنر کر
کہتے ہیں کہ شیشے کو بنا سکتے ہیں خارا

آج تاریخ کو ان قدسی صفات ہستیوں کی تلاش ہے مگر وہ سوز محبت وہ جوش و خروش نظر نہیں آتا۔ ایسا لگتا ہے کہ اجنبی تہذیب کی چکاچوند اور مادیت کی دلکشی نے ہماری صدیوں درخشندہ روایات کو مضمحل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی جس سے ہماری اقدار کا کہیں

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

شروع کر دیں اور پھر سے زوال پذیر اقدار کو پیغام نو کی نوید دی اور ملتان اور ڈیرہ غازی خان جیسے پسماندہ خطوں میں مسرت اور رجائیت کے لمحے دوبارہ لوٹا دیئے اور پھر اداروں میں رفعتوں اور علمی وقعتوں کا دور شروع ہو گیا۔ برٹرنڈرسل نے کیا خوب کہا تھا "صرف ایک نسل میں ہزار سال کا فاصلہ طے کر سکتے ہیں" اور پھر ۱۶ مئی کی کانووکیشن ہمیں اعلیٰ اسناد اور قبائے فضیلت کو طرف لے جائے گی جو ہمارے علمی ورثے کی خشت اول ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ہم کیا پڑھیں اور کیا نہ پڑھیں

آپ بھی اکثر محفلوں میں جاتے ہیں اور کئی طرح کی محفلوں میں شرکت کرتے ہیں۔ ہمیں بھی ایسے موقعے ملتے رہتے ہیں۔ محفل جیسی بھی ہو اور جس مکتب فکر سے بھی اس کا تعلق ہو اس میں شریک سیاست دان ہوں یا ادیب عام شہری ہوں یا کسی دانش کدہ کے دانشور۔ کسی درسگاہ کے استاد ہوں یا کسی اہم عہدے پر فائز سیکرٹری صاحبان ہوں۔ ایک سوال عموماً سننے کو ملتا ہے۔ اور پھر اس کا جس طرح حشر نشر ہوتا ہے اس کے لئے ایک الگ سے کالم کی ضرورت ہے۔ سوال مختصر ہوتا ہے اور جواب اتنے طویل ہوتے ہیں کہ ایک محفل برخواست ہو جاتی اور دوسری محفل میں سوال نامکمل ایجنڈے کی طرح موجود ہوتا ہے پھر شرکاء محفل اس طرح بحث شروع ہو جاتی ہے جیسے کسی ڈرامہ کی ادھوری قسط دکھائی جا رہی ہو اور کردار الجھ کر رہ گئے ہوں۔ یہ سوال کسی ایک مخصوص محفل کا محتاج نہیں شادی بیاہ سے لے کر موت و حیات تک پھیلا ہوا ہے۔ قبرستان سے لیکر تعزیت تک اور تعزیت سے قل خوانی تک۔ سبزی منڈی سے لیکر لکڑی منڈی تک اس کا سلسلہ جاری ہے۔ اس کے چھڑ جانے پر کسی کو اعتراض نہیں بلکہ ہر شخص بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے۔ اور اس میں اپنے حسب توفیق اضافے کرتا ہے اور اپنی معلومات کو پھیلاتا ہے کہ سننے والے اس کے علم، مشاہدہ اور تجربے کے قائل ہو جاتے ہیں۔ ادیبوں صحافیوں سے اپنے تعلقات اس طرح بیان کرتا ہے گویا یہ اکابر وقت کا ساتھی، ان کا دوست اور ان کی بچپن کی یادوں کا سرمایہ ہے۔ ان کی زندگی کے حوالے سے اس طرح بیان کرتا ہے کہ گویا صحافت کی ساری تاریخ اس کی نظروں کے سامنے ہے۔ فلاں کالم نویس کیا تھا اپنا یار تھا، ہمارے پولٹری فارم سے انڈے لے جاتا تھا۔ ہم اکثر اکٹھے چائے خان بابا کے ہوٹل پر پیتے تھے یا فلاں ادیب ہمارے مکان کے ایک حصہ میں کرایہ دار تھا تین چار مہینوں کا کرایہ بھی ابھی اس کی طرف نکلتا ہے فلاں اخبار نویس نے جب صحافت کے میدان میں قدم رکھا اس سے پہلے ہماری بستی میں معمولی سی دکان پر کام کرتا تھا۔ آج بڑا اخبار نویس بنا ہوا ہے۔ بڑے بڑے ایوارڈ لیتا ہے اور غیر ملکی دوروں میں پیش پیش ہوتا ہے۔ غرضیکہ کسی بھی کر صحافی کے فن اور شخصیت پر تبصرہ کیا جاتا ہے کہ سننے والے سنانے والے کے اس قدر قرب پر حیران ہوتے ہیں اور اسے علم دوست اور اہل قلم کا ساتھی سمجھتے ہیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

حقیقت خواہ کچھ بھی ہو لیکن محفل پر ہر بات معتبر ٹھہرتی ہے اور کہنے والا جو کہے اس پر کوئی تنقید کا لفظ نہیں لاتا۔

بات ہو رہی تھی سوال کی کہ وہ کونسا سوال ہے جسے ہر محفل میں اتنی پذیرائی ملتی ہے اور جس پر بحث کرنے والے اتنے مقرر دستیاب ہوتے ہیں۔ وہ سوال صرف اتنا ہے کہ ہم کیا پڑھیں اور کیا نہ پڑھیں ؟ آپ بھی حیران ہو نگے یہ بھی کوئی سوال ہے یا کوئی موضوع ہے۔ جناب ایسا نہیں۔ اس سوال کے پیچھے جو نظام فکر قائم ہے اسکی طرف بھی آپ نگاہ دوڑائیں۔ کسی شاعر کو شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا تھا وہ الگ بات تھی۔ اچھی کتاب، رسالہ، اخبار کا انتخاب واقعی مشکل ہے۔ لیکن بظاہر یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ یہ کیوں مشکل ہے۔ حالانکہ ہر شخص جسمانی اور ذہنی لحاظ سے اس قابل ہے کہ اس کا فیصلہ کر سکے اور اپنے رجحان کے مطابق اس کو اولیت دے سکے۔ ہر شخص جانتا ہے کونسا اخبار کتنا معیاری ہے کونسا رسالہ یا میگزین صوری و معنوی اعتبار سے بہتر ہے۔ کونسی کتاب مفید ہے پھر یہ الجھاؤ کیوں ہے ؟ جناب والا! ناراض نہ ہوں، آپ نے کبھی گنے کا رس پیا ہے ؟ اس گنے کے اندر جھانکا ہے جسکے چھ حصے زہریلے کیڑوں کے مسکن بھی ہوتے ہیں۔ اس زہر کو کبھی آپ نے الگ سے دیکھا، اگر نہیں تو آج سے دیکھنا شروع کریں لفظوں کے درمیان۔ کتاب کے اوراق اخبار کے صفحات بھی ایسے زہریلے کیڑوں سے بھرے پڑے ہیں ایسے لٹریچر ایسے فکشن اور ایسی نان فکشن تحریروں کو زہر سے پاک کرنا ہے ایسی تحریریں ہماری سوچ کی فصل کو سنڈیوں کی طرح چاٹ رہی ہیں۔ کیا آپ نے ان کتابوں کو پڑھا ہے جو معاشی ناہمواری، چائلڈ لیبر، طبقاتی نفرتوں کے خلاف لکھی گئی ہیں مگر ان کے اندر جو مواد ہے وہ کسی ایٹم بم سے کم نہیں۔ ایک ایک جملہ زہر آلود ہے۔ ایک ایک لفظ نفرتوں اور نقاطوں کا آئینہ دار ہے۔ کبھی آپ نے اجنبی تہذیب جسے آجکل اقوام غالب کی تہذیب کہتے ہیں اسکا مخصوص ذہنی اور نفسیاتی دباؤ دیکھا ہے اور اسکے اندر چھپا ہوا سامراجی ذہن کس طرح ہمارے درمیان نفاق پیدا کر دیا ہے کبھی آپ نے ان تحریروں کو دیکھا ہے جو کردار کشی، انسان دشمنی کی آئینہ دار بن کر سامنے آتی ہیں۔ انسان کا انسان سے رشتہ توڑ دیتی ہیں انسان کے اندر سے ہمدردی، درگزر اور برداشت کے حوصلے مٹا دیتی ہیں۔ کیا ان تحریروں کو بھی دیکھا ہے جو وطن عزیز کی اساس پر اسکی جڑوں پر نشتر چلاتی ہیں۔ پھر ایک عام قاری سوال کرتا ہے کہ ہم کیا پڑھیں ؟ اسکا جواب مشکل نہیں۔ آپ وہ

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

سب کچھ پڑھیں جس میں پاکستانیت کی بات کی گئی ہے۔ آپ ان صحافی، ادیب، دانشور، شاعر وغیرہ کو پڑھیں جنھوں نے عمر بھر پرورش لوح و قلم کی ہو۔ جو اس راستے پر چراغ جلاتے رہے ہوں، خود اندھیروں میں رہے ہوں اور فٹ پاتھ پر لیٹے ہوئے ایک مجبور بے کس کے غم میں بلکتے ہوں۔ ایسا ادب، ایسا کچھ پڑھیں جس میں مردم آزاری اور خلق بے زاری نہ ہو۔ بلکہ مسرت جیسے رواداری اور محبت ہو۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں رسالے، کتابیں، اخبار مہنگے ہو گئے ہیں۔ ایک عام قاری کی پہنچ سے دور ہیں کیا ایک اچھا اخبار سستا نہیں ہو سکتا۔ ایک اچھا رسالہ، اچھی کتاب کم داموں میں دستیاب نہیں ہو سکتی۔ اس کا فیصلہ حکومت نے کرنا ہے یا APNS نے۔ جناب صدر مجید نظامی صاحب نے سوچنا ہے کہ اگر حکومت سے ٹیکس کم ہو جائیں تو اخبار سستے ہو سکتے ہیں لیکن ایک کتاب آج بھی بہت سستی ہے اور اس کا مطالعہ ہم طویل عرصہ تک کر سکتے ہیں اگر وہ کتاب مل جائے تو اسے ضرور پڑھیے۔ وہ کتاب کون سی ہے؟ یہ سوال واقعی درست ہے اور اس کا جواب بھی مختصر موجود ہے یعنی The study of mankind وہ انسان جو لفظوں اور تصویروں کے درمیان گم ہو گیا ہے اسے بحال آپ تلاش کر سکتے ہیں۔ انسان سے زیادہ اچھی کتاب آپ کو نہیں ملے گی۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

جنریشن گیپ

کسی دانا نے کیا معنی خیز بات کہی تھی کہ ہمارے بزرگ روکھی سوکھی روٹی کھاتے سادہ زندگی گزارتے مگر اپنے بچوں کی اس طرح تربیت کرتے کہ وہ مثالی انسان بن جاتے۔ تاریخ کے اوراق میں نئے باب جنم دیتے۔ تہذیب و شرافت کی ایسی داستانیں تخلیق کرتے کہ دنیا انکی مثالوں سے روشنی اور نقوش آگہی پاتی۔ ایسے نوجوان اب نہ جانے کیوں ناپید ہو گئے ہیں۔ بیسویں صدی کے اختتام پر جو ہمیں تحفے ملے ہیں ان میں Angry generation اور Gen-eration Gaps کے علاوہ آلودگی، ماحولیاتی مسائل سب شامل ہیں اور اب اکیسویں صدی کا آغاز ہونے والا ہے اس سوال سے اس حوالہ سے پروگرام ۲۰۱۰ء اسکا تحفہ ہے لیکن نئی نسل کے کردار، سیرت اور نکھار کہیں کوئی پروگرام نظر نہیں آتا۔ بحث کی مدیں خاموش، تخمینے کے سارے اعداد و شمار جیب ہیں۔ حالانکہ ماضی میں اخلاق و کردار کی تعمیر کیلئے خصوصی توجہ، شفقت اور خاصی رقوم مختص کی جاتی تھیں۔ ماضی کے وہ بچے بڑے مختلف تھے۔ انہیں راستے میں کوئی تنگ کرتا تو وہ اپنی سیدھی راہ نہ چھوڑتے۔ اگر کوئی گستاخی کرتا تو یہ خندہ پیشانی سے پیش آتے۔ کوئی زیادہ زچ کرتا تو یہ اس شخص کو سلام کرتے اور اپنا راستہ لیتے گزر جاتے۔ زیادہ دیر وہاں نہ رکتے۔ اور نہ کسی سے الجھتے انہیں بچوں میں اگر کسی ایک بچہ کو کسی نے کہا کہ فلاں شخص تمہیں گالیاں دے رہا تھا اس بچہ نے بتانے والے کو کہا آؤ اس شخص کے پاس چلتے ہیں اور شکایت لگانے والا اندر سے خوش ہوتا ہے کہ اب دست و گریباں ہونے کا منظر پیش ہونے والا ہے۔ دونوں خوب لڑیں گے گالی گلوچ دیں گے زبان اور ہاتھ کے جوہر سامنے آئیں گے مگر اسے حیرت ہوتی ہے کہ وہ شخص جس کے بارے کہا گیا تھا کہ فلاں نے تجھے گالیاں دی ہیں وہ اس شخص سے پوچھتا ہے تم نے جو مجھ میرے بارے میں کہا ہے اگر وہ صحیح ہے تو خدا میری مغفرت فرمائے اور اگر جھوٹ ہے تو خدا تمہاری مغفرت فرمائے اور یہ کہا اور واپس لوٹ آئے۔ زبان و بیان کے معاملے میں ہمارے بزرگ کتنے محتاط تھے اور آج ہماری زبانیں کسی قدر آزاد اور ہمارے ہاتھ کس قدر بیباک ہیں کہ دونوں کو پکڑنے والا کوئی نہیں جو شخص آپس میں لڑ پڑیں ایک ظلم کے تلے دبا ہوتا ہے اور دوسرا ظلم کر رہا ہوتا ہے ارد گرد کے لوگ خاموش تماشائی کا کردار ادا کرتے ہیں۔ ایک یہ بھی زمانہ تھا کہ جب بچہ کو گھر میں یہ

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

اڑانے کی ساری حرکتیں کیا الیکٹرانک میڈیا کی بے بسی کی علامت ہیں۔ اگر آزادی نہیں تو روکنے اور ٹوکنے کی ذمہ داری کس پر ہے کون ان پروگراموں کو کنٹرول کرتا ہے۔ کون ان کو چلاتا ہے اور کون ان پروگراموں کو منظور کرتا ہے۔ کبھی کسی نے سوچا کہ ہماری نئی نسل اپنے اخلاقی طور سے اپنے بزرگوں کی میراث سے کیوں محروم ہو رہی ہے۔ کبھی کوئی ٹی وی کا اس حوالہ سے آؤٹ کرتا تو یہ ذہنی فاصلے یہ Generation Gap کی الجھنیں پیدا نہ ہوتیں مگر روکنے اور ٹوکنے والے شاید مزید ذہنی فاصلے چاہتے ہیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

حامل رقعہ زبانی عرض کرے گا

رقعہ اور بچہ دونوں معصوم ہوتے ہیں بچے کو چوسنی مل جائے تو نہ اس میں نہ دودھ ہوتا ہے نہ پانی مگر بچہ خاموش ہو جاتا ہے اور ماں جو بچے کے مسلسل رونے سے بیزار ہوتی ہے مطمئن ہو جاتی ہے کہ بچہ آسانی سے بہل گیا۔ یہی حال رقعہ بردار کا ہے رقعہ جس کو مل جائے اسکا چہرہ بھی کھل اٹھتا ہے۔ رگ و پے میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے اسے اپنی قسمت پر ناز کرنے کو جی چاہتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس رقعہ تک رسائی میں اسے کن کن رکاوٹوں کو عبور کرنا پڑا ہے۔ کبھی صاحب گھر پہ نہیں، کبھی آرام کر رہے ہیں، کبھی دوائی لیکر سوئے ہوئے ہیں۔ کبھی دفتر سے تھکے آئے ہیں۔ کبھی باتھ روم میں ہیں اور کبھی سفر کی تیاری کر رہے ہیں آج ملاقات ممکن نہیں۔ صاحب کی مصروفیت اپنی جگہ یہاں پہلا مرحلہ دربان کی مٹھی گرم کرنے کا بھی ہے۔ کبھی دربان کی مٹھی اتنی بڑی ہو جاتی ہے کہ سائل کا دامن تنگ ہو جاتا ہے اور وہ دربان کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے اپنی مجبوریوں کا واسطہ دیتا ہے کہ ایک بار صاحب سے ملنے دو صرف ایک رقعہ لینا ہے میرا کام بن جائے گا۔ ایک رقعہ پر میری کئی امیدوں کا تاج محل قائم ہے۔ بہر حال کئی دن کی تگ و دو کے بعد واقعی رقعہ ہاتھ آ جاتا ہے لیکن اب رقعہ کی تاثیر کی منزل باقی ہوتی ہے اور یہاں کسی شاعر نے

کی ذرا آبرو ان کی رکھیو!
چلے ہیں ہتھیلی پہ سرسوں جمانے
ستانے کا کب تک کرنے کا کب تک
ارے او زمانے ارے او زمانے

مگر یہ منزل بڑی کٹھن ہے۔ ہزاروں لغزشیں حائل ہیں لب تک جام آنے میں۔ مگر کسی نے ٹھیک کہا تھا کہ نادانوں کو جام نہیں ملتے جام اسی کو ملتا ہے جو آگے بڑھ کر تھام لینے کی ہمت رکھتا ہو۔ جام اور رقعہ ایک جیسی کشش ایک جیسی دلکشی کے حامل ہیں۔ دونوں کا حصول مشکل بھی ہے اور نشاط آفرین بھی۔ عمر بھر کی ریاضت کے بعد ہمیں زندگی کے جام کی سمجھ آتی ہے اور اسی طرح رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ گھس جانے کے بعد۔ یعنی رقعہ بھی ملتا ہے تو کی

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ٹھوکریں کھانے کے بعد۔ جب کوئی چیز مشکل سے ملے تو اس کی قدر بڑھ جاتی ہے اور جب رقعہ ہاتھ میں آجائے تو پھر جی چاہتا ہے کہ اسکے حصول کی کہانی ہر کسی کو سنائی جائے اور صاحب سے تعلق جوڑنے اور ان سے ملنے کے رقعت آمیز منظر بتائے جائیں کہ انہوں نے کس کمال شفقت سے رقعہ لکھا اور کس طرح سبز روشنائی سے اپنے دستخط کئے۔ ان کی لکھائی اور ان کے دستخط اتنے تاریخی تھے کہ جی چاہتا تھا کہ انہیں محفوظ کر لیا جائے اور جن کے نام انہوں نے رقعہ لکھا تھا انہیں پہنچانے کی بجائے رقعہ البم میں سجا لیا جائے۔ رقعہ بظاہر ایک سادہ، عام فہم لفظ ہے یہ تین حروف پر مشتمل ہے مگر تاریخی اعتبار سے یہ صدیوں پر محیط ہے۔ نا جانے دنیا کا وہ پہلا خوش نصیب کون ہوگا جس نے پہلے رقعہ لکھا ہوگا اور پھر جس کے نام لکھا ہوگا وہ بھی خوش نصیب ہوگا کاش ایسے رقعے تاریخ میں محفوظ ہوتے۔ ماضی کا ایک بیش بہا علمی خزانہ آج محفوظ کیوں نہیں محکمہ کا Archine کی ذمہ داری ہے اس قیمتی ذخیرے کو ایک جگہ جمع کرے یا قائداعظم لائبریری لاہور والوں کا فرض ہے کہ وہ ایسے تمام رقعے جو ہمارے قومی رہنما عوام کی دلجوئی کیلئے لکھتے رہتے ہیں انہیں لائبریری میں ماہرانہ دیکھ بھال کے ساتھ جمع کریں۔ ان کی فہرستیں مرتب کریں انکے سیاق و سباق کے حوالے ترتیب دیں کہ یہ کس ایم۔ پی۔ اے اور کس ایم۔ این۔ اے، کس صاحب اور کس ممبر کا رقعہ ہے کس کے نام لکھا گیا ہے اور کس مطلب کیلئے لکھا گیا ہے۔

احتساب مال و دولت جمع کرنے تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ ان رقعوں کا بھی احتساب ہو کہ یہ رقعہ کس فکر کی عکاسی کرتے ہیں بعض رقعے رعب داب والے ہوتے ہیں ان کا حامل جب رقعہ لیکر کسی صاحب کے پاس جاتا ہے تو سر پر سوار ہو کر کہتا ہے کہ جناب بتائیں کہ میں رقعہ لکھنے والے کو کیا جواب دوں۔ اگر رقعہ وصول کرنے والا افسر کمزور دل کا مالک ہے یا تبادلہ سے ڈرتا ہے تو وہ کہے گا کہ جناب آپ نہیں کہیں رقعہ پر سو فیصد عمل ہوگا اور اگر رقعہ وصول کرنے والا میرٹ پر بھرتی ہوا ہے اور اپنے اندر بے خوف جذبہ رکھتا ہے اور دفتری معاملات میں پاک صاف ہے تو وہ کہے گا کہ میاں جو جی میں آئے انہیں جواب دے دیں کہ یہاں فی الحال کوئی نوکری نہیں۔ کچھ رقعے قلمی ہوتے ہیں اور کچھ رقعے پرنٹڈ ہوتے ہیں مطبوعہ رقعے عوام کے بے پناہ رش کو دیکھ کر تیار کرائے جاتے ہیں بار بار ایک عبارت کو کیسے لکھا جائے صرف وہ جگہ چھوڑ دی جاتی ہے جو نام کی ہوتی ہے باقی سارا کام مطبوعہ ہوتا ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ہوتا اور سائل اس لئے مطمئن ہو جاتا ہے کہ جس بڑے افسر کے لئے زبانی عرض کرنے کا اجازت نامہ لے کر وہ جا رہا ہے اس سے بڑھ کر کوئی اور انعام نہیں مل سکتا کیونکہ وہ خود کلام کرے گا اور صاحب سنے گا کیونکہ لکھنے والے نے لکھ دیا ہے کہ حامل رقعہ زبانی عرض کرے گا اب ہوتا کیا ہے حسرتیں دل میں رہ جاتی ہیں اور زبانی کلام کا موقعہ نہیں ملتا دفتر کے اندر رقعہ جاتا ہے اور حقارتوں اور نفرتوں کے ساتھ رقعہ لوٹ آتا ہے اور حامل رقعہ زبانی عرض کرے کا ایک سوال ایک آرزو اور ایک حسرت بن کر رہ جاتا ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

لاہور، ملتان، کوئٹہ روڈ

ماہرین مواصلات کی صائب رائے ہے کہ سڑکیں رابطہ کا پل ہوتی ہیں نہ صرف شہروں کو ملاتی ہیں بلکہ لوگوں کو بھی قریب لاتی ہیں۔ اسی طرح ماہرین اقتصادیات کا خیال ہے ریلوے لائن، جہاز اور سمندری راستے ہماری معیشت کی اساس ہیں اور ان سب میں سڑکوں کو بڑی فضیلت حاصل ہے یہ شہر سے مصنوعات کو گاؤں تک لانے اور گھر گھر تک پہنچانے میں بڑی مدد دیتی ہیں دیہات سے روزانہ ٹنوں کے حساب سے دودھ آتا ہے سبزیاں اور پھل آتے ہیں اور اسی طرح شہر سے مصنوعات کا تبادلہ ہوتا ہے۔ اگر اچھی سڑکیں ہوں تو اشیاء ٹھیک ٹھاک حالت میں گھر پہنچ جاتی ہیں ورنہ ان کے سپیئر پارٹس تو ضائع نہیں ہوتے۔ گھر تک جب نہ پہنچے تو اس کے شیشے کے ٹکڑے تو بہر حال پہنچ جاتے ہیں ہمارے ایک دوست کو اکثر اپنی سڑک سے گلہ رہتا ہے کہ وہ اتنی خستہ حال ہے کہ وہ دکان سے دہی لے کر آتے ہیں تو وہ گھر تک لسی بن چکی ہوتی ہے۔ میرے دوست کو شاید اس بات کا خیال نہیں کہ ریڈی میڈ لسی بنانے کے لئے کتنی بڑی نعمت ہے۔ اس سے وقت بھی بچتا ہے اور لسی بنانے کی مشین کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ بات سڑکوں کی ہو رہی تھی۔ سڑکیں کئی قسم کی ہوتی ہیں بعض سڑکیں تاریخی ہوتی ہیں ان پر کبھی تاریخ نے سفر کیا ہوتا ہے کوئی بادشاہ، کوئی وزیر، کوئی شہزادہ یہاں سے گزرا ہوتا ہے کسی مناسبت سے وہ کبھی تغلق روڈ ہوتی ہے اور کبھی اکبر روڈ، کبھی بہادر روڈ اور کبھی شیر شاہ سوری روڈ۔ بعض سڑکیں بین الاقوامی درجہ اختیار کر لیتی ہیں جیسے شاہراہ ریشم جو پاک چین دوستی کی لازوال مثال ہے۔ واہگہ بارڈر گنڈا سنگھ سرحدی رابطے مضبوط کرتی ہیں۔ بعض سڑکیں اپنے ناموں سے پہچانی جاتی ہیں۔ جیسے فیروز پور روڈ، مولانا جلال الدین رومی روڈ نام دیا گیا ہے جیسے شاہراہ ادب شیخ عبدالحمید خان بادامی روڈ لاہور میں ایک نیا اضافہ ہیں۔ انہیں سڑکوں میں ایک تاریخی طویل سڑک لاہور، ملتان، کوئٹہ روڈ ہے جو ایک طرف کوئٹہ سے پشاور تک جاتی ہے اور دوسری طرف کراچی سے دہلی تک۔ یہ روڈ پاکستان میں سرحد، پنجاب، سندھ، بلوچستان کا دل ہوتی ہے اور بین الاقوامی سطح پر باب ہندوستان (Gate of India) کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کی تاریخی اہمیت، افادیت اپنی جگہ مگر یہ سڑک آجکل زبوں حالی کا شکار ہے۔ انہیں اسے روڈ ویزوں نے کاٹا ہے اور انہیں مسلسل

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

گڑھے ان کی جان کے دشمن ہیں۔ مگر آفرین ہے اس سڑک پر جو تحریک آزادی کے گمنام خاموش کارکن کی طرح نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پرواہ کا جذبہ لئے ہر عام و خاص کی خدمت گذشتہ کئی صدیوں سے کر رہی ہے۔ نہ اسے آج تک کوئی اعزاز ملا ہے اور نہ ہی کسی نے اسکا اعتراف کیا ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ یہ گمنامی کی چادر اوڑھے صبر و شکر کا دامن سمیٹے بڑی سے بڑی ٹریفک کا بوجھ اٹھائے زندگی گزار رہی ہے۔ جب ملتان کی آبادی بمشکل نو دس لاکھ تھی تو یہی سڑک تھی اور اب بیس لاکھ ہے تو یہی سڑک کلیدی کردار ادا کر رہی ہے۔ اس کیلئے نہ تو متبادل راستے بنے ہیں اور نہ ہی اس کی ٹریفک کا بوجھ کم ہوا ہے بلکہ ایک درد مسلسل کی طرح بڑھ رہا ہے۔ یہ غریب الدیار، مجبور و بے بس سڑک جسے میڈیا کی بھی کوئی کوریج حاصل نہیں اس کی ٹی وی والوں نے کبھی دستاویزی فلم بھی نہیں بنائی کہ کہیں یہ قومی سرمایہ نہ بن جائے یہ چھاؤنی سے لے کر عسکری جھیل تک ملتان کی آبادی کا سارا بوجھ اٹھاتی ہے۔ سارے کالجوں، سکولوں کی گاڑیاں اسی سڑک سے ہو کر جاتی ہیں کچہری، ہائیکورٹ، چھاؤنی، سبزی منڈی، غلہ منڈی، گراس منڈی، دفاتر، ذرائع ابلاغ کے ادارے ریڈیو، ہوائی اڈا، بینک، ہوٹل، کاروباری مراکز سبھی اسی روڈ پر ہیں اور سب کا راستہ یہی ہے۔ رکشا سے لیکر ویگن بس اور صبح سویرے ٹرک بڑی آن سے گزرتے ہیں۔ اسی کا بائی پاس ایک عرصہ سے زیر تعمیر ہے اگر بن بھی گیا تو اس کے لئے کیا سہارا بنے گا۔ پھر بھی ٹریفک کا یہی حال ہوگا اور اس بے چاری کو یہ ساری بپتا ایسے کاٹنی ہوگی۔ دنیا بھر میں کتنی سماجی تنظیمیں ہیں۔ کس قدر دکھ درد بانٹتی ہیں مگر ایل ایم کیو کیلئے کوئی بھی تنظیم نرم گوشہ نہیں رکھتی۔ اس پر بڑھتے ہوئے مظالم پر آواز نہیں اٹھاتی اسکی خستہ حالی پر کوئی کارکن بھوک ہڑتال نہیں کرتا۔ کوئی اس کے گڑھوں پر ماتم کناں نہیں حبیب جالب نے کیا خوب کہا تھا

چھوڑ دے اتنا سلگنا اے میرے دل چھوڑ دے
کچھ نہ کچھ ہوگا جہاں والے کو بھی فکر جہاں

لاہور کی مال روڈ پر ایک درخت کٹا تھا پورے شہر کے ادیب، شاعر حساس افراد سڑک پر آ گئے تھے یہ درخت نہیں ہمارا دل کٹا ہے آج گیس، پانی سیوریج والے جہاں چاہتے ہیں ایل ایم کیو کو کاٹ کے رکھ دیتے ہیں مگر کسی حساس دل پر چوٹ نہیں پڑتی۔ جیسے انسان ستر

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ابھی دنیا میں اچھے انسان باقی ہیں

اکثر محفلوں میں یہ ذکر سننے کو ملتا ہے کہ ہم دنیاداری میں ایسے الجھ گئے ہیں کہ موت بھول گئے ہیں اس طرح کے کام کرتے ہیں کہ گویا کبھی ہم نے اس دنیا سے جانا ہی نہیں۔ ہمارے طویل المقاصد منصوبے ہیں۔ ایک دوسرے سے الجھنے کے اور چھوٹی چھوٹی بات کو آگے بڑھانے کے ایسے نسخے موجود ہیں کہ کوئی ہمیں مات نہیں دیتا۔ ہم ہر میدان میں جیت جاتے ہیں ایسی دلیلیں اکٹھی کرتے ہیں کہ مخالف زچ ہو جاتا ہے ایسے ایسے شواہد سامنے لاتے ہیں کہ مخالف کو بچ نکلنے کا راستہ ہی نہیں ملتا اس زور شور سے اپنی آواز اونچی کرتے ہیں کہ بازار کا سارا مجمع ہمارے گرد ہوتا ہے کہ ہم ہی سچے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ہم ایسا کیوں کرتے ہیں ہمارا تو اس تہذیب سے تعلق ہے جس میں پتھر برسانے اور کانٹے بچھانے والوں کو دعائیں دی جاتی تھیں۔ قاتل کو شربت پلایا جاتا تھا طاقتور ہونے کے باوجود شعور کی حد تک موت کو قبول کرنے کا راستہ چنا جاتا تھا۔ ظلم کے اندھیرے اور گھٹاٹوپ جہالت میں انسانیت کی شمع روشن کی جاتی تھی۔ یگانگت اور محبت کے پھول چنے جاتے تھے۔ جب ہم ایک دوسرے کے دشمن تھے ہمارے دلوں میں الفت ڈالی گئی جب ہم آگ کے گڑھے کے کنارے پہنچ چکے تھے ہمیں خدائے بزرگ وبرتر نے اپنی کمال مہربانی سے اس آگ سے بچا لیا لیکن آج ہم نے پھر اپنے گرد آگ کے آلاؤ روشن کرنے کیلئے نفرت کی سوکھی لکڑیاں اکٹھی کر لی ہیں اور اس محبت کو جو ہمیں محسن انسانیت نے منشور اعظم کی صورت میں ایک گراں قدر تحفہ دیا تھا ہم نے اسے نفرت میں بدلنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ہمیں تو خیر وفلاح کا امین بنایا گیا تھا اور ہم انتشار کے سرمائے کے مالک بن بیٹھے اور اس موت کو بھول گئے جو ایک حقیقت ہے جس کا سلسلہ روز اول سے لیکر کائنات کے اختتام تک جاری رہے گا۔ ایک مفسر نے اس کی کیا عمدہ تعریف کی ہے موت کی تعریف کرنا بے سود ہے اور نادانی۔ موت وہی ہے جسے سب جانتے ہیں اور یہ نام ہے روح کی بدن سے مفارقت کا۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے ان ہی اجزاء کا پریشان ہونا

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

یعنی ہم موت کو بھولے نہیں زندگی کے ہر کام میں موت سے وابستگی کے جذبے ہمارے اندر موجود ہیں ابھی آپ نے دیکھا ہے کہ کوئی جنازہ سڑک پر جا رہا ہو لوگ کس قدر اس کا احترام کرتے ہیں سائیکل سوار سائیکل سے اتر جاتا ہے، کار والا کار کو ایک سائیڈ پر روک لیتا ہے ٹریفک کا سپاہی جنازہ گزرنے کیلئے راستہ بناتا ہے دروازے اور کھڑکیوں سے جنازے کا رقت آمیز منظر دیکھتی ہیں اور ان لمحوں کو ہر شخص جس جس انداز سے دیکھتا ہے سوچتا ہے تو ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا معاشرہ ابھی خوف خدا سے عاری نہیں ہمارے معاشرے میں ابھی یہ جذبہ ایسے انسان موجود ہیں جن کے دل انسان دوستی کے جذبے سے دھڑکتے ہیں آج معاشرہ کتنا سنگدل، بے رحم انسان کیوں نہ ہو جب کوئی مظلوم اس کے سامنے ہو اور یہ کہتا ہے کہ دیکھو تم میرا آج حق سلب کر رہے ہو لیکن کب تک؟ ایک دن جب روز محشر ہو گا اور میزان اور پل صراط کی دنیا ہو گی۔ تم میرا حق کیسے دبا سکو گے۔ میرا ہاتھ ہو گا اور تمہارا دامن۔ تو ایک دفعہ سننے والے پر ہیبت ضرور طاری ہو جاتی ہے اور وہ سوچنے لگتا ہے کہ کہیں اس کی آہ اس کے دل کو چیر کر ہی نہ رکھ دے۔

آیئے مل کر ایسے انسان تلاش کریں جو مادیت کی اس آندھی میں چراغ ہیں۔ جو نفرتوں اور انتشار کی اس فضاء میں ملی یکجہتی کو فروغ دیتے ہیں۔ جو زخموں پر مرہم رکھنے کا ہنر جانتے ہیں۔ مظلوم کے سر پر دست شفقت رکھتے ہیں اور ظالم کے سامنے ڈٹ جاتے ہیں جلتی آگ میں کود کر جلتے بچوں کو باہر نکالتے ہیں۔

دہشت گردی کی فضا میں بے گور و کفن لاشوں کو تجہیز و تکفین کی چادر سے ڈھانپتے ہیں اپنے معمولی اثاثوں سے کسی غریب، کسی بیوہ، کسی یتیم، کسی بے کس کی مدد کرتے ہیں۔ کبھی دوائی صورت میں کبھی دعائی صورت میں کبھی خیرات کی شکل میں کبھی خیر کی شکل میں کبھی فدیے کی شکل میں اس طرح ایک دوسرے کا ہاتھ تھامتے ہیں کہ گمان ہی نہیں ہوتا کہ یہ نیکی کی طرف بڑھنے والا ہاتھ کسی غیر کا ہے اپنے بھائی اپنے عزیز کا گمان ہوتا ہے۔ محلے اور گلی میں۔ شہر اور قریے میں اور ملک کے اندر ایسے درد مند موجود ہیں اور یہ کہنا درست نہیں کہ ہم موت کو بھول گئے ہیں ابھی دنیا میں اچھے انسان باقی ہیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ڈاکٹر صبور غیور

انسانی معاشرہ کی تشکیل افراد سے ہوتی ہے یعنی وہ افراد جو ایک دوسرے کے شانوں سے شانے ملا کر اس طرح کھڑے ہوتے ہیں کہ فرد کا فرد سے فاصلہ مٹ جاتا ہے اور بعض اوقات پانچوں انگلیاں برابر ہو جاتی ہیں تاکہ فرد کو ثانوی ہونے کے کرب سے بچایا جائے۔ تنہائی اور بے بسی کے احساس سے نکالا جا سکے ذہنی انجماد سے نکال کر تحریک اور قوت کی شکل دی جائے۔ ڈاکٹر صبور غیور ایک فرد کا نام نہیں بلکہ ایک ایسی تحریک کا نام ہے جو ذہنوں میں سوچ اور عمل میں جوش کو جنم دیتی ہے جو کسی بھی معاشرہ میں اور کسی بھی ملک میں غربت، افلاس، معاشی اور معاشرتی محرومی کا ازالہ کرتی ہے۔ ناموافق حالات سے دلبرداشتہ ہو کر اپنی قسمت کو آہ سرد، رنگ زرد اور چشم تر کرنے کی بجائے خود آگہی، خود انحصاری اور خود احتسابی سے روشناس کیا جاتا ہے اور اپنی قسمت کے فیصلے اپنے قلم سے خود اعتمادی کے ساتھ کیے جاتے ہیں۔ وسائل کی محرومی کسی فرد کا راستہ نہیں روکتی، غریب ہونا عیب نہیں۔ غریب بن کر زندگی گزارنا عیب ہے۔ ڈاکٹر صبور غیور ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جو اپنی کتابوں سے فکر معاش کی گتھیاں سلجھاتا ہے اور نئی فکر، منفرد سوچ اور مؤثر انداز نظر سے آگاہ کرتا ہے۔ یہ ایسا شخص ہے جو پاکستان میں عبدالستار ایدھی ہے بنگلہ دیش میں محمد یونس خاں ہے۔ جناب عبدالستار ایدھی میں خدمت میں عظمت کا راز دریافت کیا اور محمد یونس خاں نے گرامین بینک کے قیام سے بنگلہ دیش کی غربت کے خاتمہ اور خوشحالی کے آغاز کا نسخہ تلاش کیا ہے ڈاکٹر صبور غیور معیشت کو استحکام لیبر کو باوقار کردار اور مقام دینے کا آرزومند ہے اسے چائلڈ لیبر اچھی نہیں لگتی۔ لیکن وہ صرف تنقید اور برائے تنقید کا حامی نہیں وہ ایف ای ایس کے فورم سے اور پاکستان کی ۲۴ جامعات کی سطح پر فکر و نظر کے دیپ روشن کر رہا ہے تاکہ بے روزگاری کا عفریت کسی منصوبہ میں بند ہو سکے۔ غربت کی چکی مسائل کو پیسنے کی بجائے وسائل کو بڑھانے میں مدد دے ڈاکٹر صبور غیور بیداری خرات کا قائل ہے۔

واقف ہوا گر لذت بیداری شب سے
اونچی ہے ثریا سے بھی یہ خاک پراسرار

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ہم محض اعداد و شمار کے کھیل میں الجھے رہے اور عام آدمی کے معیارِ زندگی میں وہ تبدیلی نہیں سکتے جو حقیقی اور معاشرتی ترقی کا واحد معتبر پیمانہ ہے۔

ڈاکٹر صبور غیور اکیسویں صدی میں داخل ہونے کیلئے شرط طے کرتے ہیں کہ اکیسویں صدی میں داخل ہونے کی بنیادی شرط یہ ہے کہ ہم پاکستان میں بیسویں صدی کی کوتاہیوں اور محرومیوں سے دامن جھٹک کر تعلیم یافتہ، صحت مند اور متحد مسلم قوم کی حیثیت سے اکیسویں صدی میں داخل ہوں۔ ڈاکٹر صبور غیور نے اقوامِ عالم کی تاریخ، کلچر کو اپنے مطالعہ اور دورے سے سمجھا ہے وہ بنگلہ دیش، بلجیئم، جرمنی، بھارت، عراق، ایران، اردن، کویت، مالدیپ، نیپال، نیدرلینڈ، سعودی عربیہ، سری لنکا، سنگاپور، ترکی اور تھائی لینڈ کے ممالک کا دورہ کر چکے ہیں اور پائے مشاہدات اور گہرے مطالعہ کے اثرات قائم کر چکے ہیں۔ پاکستان ایک خوش نصیب خطہ ارض ہے جسے ایسا فرزند ملا ہے جو اپنے عہد کے مسائل کو آنے والے واقعات و حالات میں پرکھتا ہے۔ تحقیق کے پیمانوں سے ناپتا ہے اور پھر انہیں اپنے نوک قلم سے اوراق پر بکھیرتا ہے۔ ایسا مصنف، ایسا دانشور اگر کسی ملک کو میسر ہو تو اسے ایسے فرزند پر اور دیدہ ور پر ناز کرنا چاہیئے۔

ڈاکٹر صبور غیور کا شمار ہمارے ملک کے ان لوگوں میں ہوتا ہے جو فکر رسا بھی رکھتے ہیں اور جوشِ عمل سے بھی آشنا ہیں۔ مضبوط قوتِ ارادی سے فرد سے لیکر معاشرہ اور معاشرہ سے لیکر ریاست کے مسائل اور وسائل میں توازن پیدا کرتے ہیں۔ ثابت قدمی ان کی پہچان ہے اور حب الوطنی اسکی روحانی اور فکری سوچ کا ثمرہ ہے۔ علامہ اقبال نے شاید انہیں افراد سے متاثر ہو کر کہا تھا۔

حاصل کسی کامل سے یہ پوشیدہ ہنر کر
کہتے ہیں کہ شیشے کو بنا سکتے ہیں خارا

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ہر کلہ راشہ۔ پہ خیر راغلے

ہر شہر کی ایک پہچان ہوتی ہے۔ ہر خطے کی ایک شناخت ہوتی ہے۔ ایک مخصوص مزاج ہوتا ہے۔ اگر اس شہر سے اس مزاج کو اس پہچان کو اور اس شناخت کو الگ کر دیا جائے تو شہر صرف سنگ و خشت کا نام رہ جاتا ہے۔ باقی اس کے دامن میں کچھ نہیں بچتا۔ جیسے فیصل آباد شہر کی پہچان اس کا "گھنٹہ گھر" ہے کہ شہر کے سارے راستے شہر کی ساری سڑکیں گھنٹہ گھر پہنچ کر آرام کرتی ہیں۔ لاہور کی پہچان ایف سی کالج والی نہر ہے، شہر کے وسط میں ہونے کی وجہ سے لاہور کا دل بن گئی ہے۔ گرمیوں میں یہ نہر لاہور کی ثقافت کا مرکز بن جاتی ہے۔ ہر امیر غریب اس نہر پر جمع ہوتے ہیں۔ عمر کی کوئی قید نہیں، پانچ سال کے بچے سے اسی نوے سال کے بزرگ سبھی اکٹھے ہوتے ہیں تربوز ضیافت کی "ون ڈش" ہوتا ہے۔ تربوز کھانے اور چھلکے پھینکنے سے جو لطف پیدا ہوتا ہے اس کا بیان ممکن نہیں ویسے بھی اس بی آر بی نہر کے پانی میں دو خصوصیات نمایاں ہیں۔ ایک تو یہ بہت ٹھنڈا ہوتا ہے دوسرا اس پانی سے کپڑے دھوئے جائیں تو پوڈر سے بھی زیادہ صاف دھلتے ہیں۔ اسی طرح شہروں میں ملتان شہر کا نام آتا ہے۔ یہ شہر اللہ والوں کا مسکن ہے۔ آم، کپاس، سوہن حلوے کا شہر ہے اس شہر کے درمیان قلعہ کہنہ جو اب قاسم باغ کہلاتا ہے ملتان کی پہچان ہے، دانشوروں، بادشاہوں کا شہر ہے اہل ملتان جب کسی سے محبت کرتے ہیں تو یہ محبت عجیب انداز کی ہوتی ہے سر پر آموں کا ٹوکرا رکھ دیتے ہیں اور کہتے ہیں جل۔ جاؤ

منکہ بر سر نہ نہادہ بودم گل

تو بر سرم نہادہ و گفتا جل

امیر خسرو نے اپنی فارسی شاعری میں سرائیکی لفظ جل کو استعمال کیا۔ بہت شہروں کی پہچان کی ہوا کرتی تھی۔ انہیں شہروں میں ایک شہر پشاور ہے اور پشاور شہر کا اصل قصہ خوانی بازار ہے۔ یہ بازار کیا ہے، قہوہ خانوں، گرم میوہ جات اور پشاور کی مصنوعات کا مرکز ہے۔ کبھی اس بازار میں پشتو لوک ادب کے گیت، قصے اور کہانیاں سنائی جاتی تھیں خوشحال خان خٹک اور رحمان بابا کے اشعار سنائے جاتے تھے۔ یہ محبتوں اور ثقافتوں کا بازار ہے اس بازار کے ایک کونے پر دکان کے چھجے پر بیٹھے ہوئے ایک بزرگ سے میں نے پوچھا۔ خان بابا! ہم پنجاب سے آئے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ہیں، میرے ساتھ طالب علم ہیں۔ ہمیں کوئی سستا اور اچھا ہوٹل بتائیں۔ بزرگ کے چہرے پر رجائیت کی ایک ایسی لہر پیدا ہوئی جیسے کسی گھر کا بچہ ایک عرصہ کے بعد گھر لوٹا ہو۔ بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا ہر کلہ راشہ خوش آئے ہو۔ پہ خیر راغلے۔ خیریت سے ہو۔ اور پھر دعائیہ لہجے میں بولے "پہ خیر اوسے" تم خوش رہو۔ اور اسی لمحے انہوں نے ایک بچہ کو آواز دیکر کہا مہمانوں کیلئے چائے لاؤ۔ ہم نے شکریہ ادا کیا اور ان کے بتائے ہوئے ہوٹل میں پہنچ گئے۔ ہوٹل واقعی سستا تھا یعنی ایک سو روپے ایک رات کا کرایہ اور اسکی عمارت بہت اونچی تھی۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ پورے شہر کا مضافاتی پہلو ہمارے سامنے تھا۔ خوبصورت گھروں، دفتروں اور عمارتوں کا شہر پشاور ہمارے سامنے تھا۔ کئی زبانوں کا شہر، ہندکو (سرائیکی لہجہ والی زبان) پشتو، فارسی، اردو، محبت اور خلوص کا اظہار کرنے اور سمجھانے والی زبانیں البتہ ہوٹل کے مالک سے جو گفتگو ہوئی اس نے کچھ دیر پریشان کیا۔ ہوٹل کا مالک مطالعاتی دوروں پر آئے ہوئے طلباء کے رویہ سے شاکی تھا۔ موسم گرما میں ہر خطے سے طالب علموں کے قافلے آتے ہیں ہم انہیں بڑی محبت اور خلوص سے اور بہت ہی کم کرایہ پر ٹھہراتے ہیں لیکن یہ طالب علم ہوٹل میں کم ٹھہرتے ہیں، تاریخ زیادہ مرتب کرتے ہیں۔ ہر در و دیوار پر اپنی تخلیقات بال پوائنٹ اور مار کر سے اس طرح رقم کرتے ہیں جیسے وہ کسی سرائے میں بیٹھے اپنے سفرنامے تحریر کر رہے ہوں۔ اس سے ہماری دیواریں خراب ہو جاتی ہیں اور یہ تخلیقات بھی کچھ زیادہ معیاری نہیں ہوتیں کہ ہم انہیں محفوظ کر لیں بلکہ جب دوسرے مہمان یہاں آکر ٹھہرتے ہیں تو اس مجموعہ اشعار کی قلمی کاوشوں پر سخت ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں۔ خدا کیلئے ان طالب علموں کو منع کریں۔ آپ تو استاد ہیں۔ ان کو اپنی زبان میں سمجھا سکتے ہیں ہم انہیں کیسے سمجھائیں۔ ہم تو محبت کے شہر کے باسی ہیں۔ قدامتوں کے امین ہیں۔ مہمان آجائے تو اس سے بڑھ کر ہمارے لئے خوشی نہیں ہوتی۔ جان و دل نچھاور کرتے ہیں لیکن مہمان ہمیں یہ تحفے تو نہ دیں۔

یارانہ کلہ پیوا خلی
چہ یو سود خوردی بل غمخور دیاری وینہ

ایسی دوستی کیونکر نبھ سکتی ہے جبکہ ایک خود غرض ہو اور دوسرے کو دوستی کا غم کھائے جا رہا ہو۔

ہوٹل کے مالک کا ایک ایک لفظ ہمارے دل پر رقم ہو رہا تھا اور ایسے محسوس ہو رہا تھا

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

تحریروں کا مزاج مختلف ہے۔ انکی تحریریں انکے مکانوں کی اینٹوں پر جذبہ حریت سے رقم ہیں اور اس عزم کی علامت ہیں کہ یہاں کے باشندوں نے انگریزوں کی ثقافتی یلغار کو روکا ہے۔ روس کی توسیع پسندی کو مسمار کیا ہے۔ اس خطے کے لوگ اس تحریر سے ناآشنا ہیں جسکا گلہ ہوٹل کے مالک نے کیا تحریریں یہاں بھی بہت ہیں ہر پہاڑ، ہر کہسار، ہر مرغزار، ہر شجر اور ہر پتہ پر ایک تحریر موجود ہے اور وہ تحریر ہے آنے والے مہمان کے استقبال کے لئے۔

ہر کلہ راشہ۔ پہ خیر راغلے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

”یہ پیشکش ملتان کیلئے نہیں ہے“

لاہور کی ایک مشروب تیار کرنے والی کمپنی کی طرف سے ایک اشتہار جو کئی اخبارات میں شائع ہوا ہے جس میں لکھا گیا ہے کہ رمضان المبارک کی آمد کی وجہ سے خاص رعایت کی گئی ہے یعنی جو بوتل پہلے ۱۲ روپے کی تھی اب ۱۰ روپے کی کر دی گئی ہے اس طرح گاہکوں کا ۲ روپے کی بچت کی خوشخبری سنائی گئی ہے اس اشتہار کے نیچے یہ جملہ معنی خیز ہے

”یہ پیشکش ملتان کیلئے نہیں ہے“

ملتان کو اس پیشکش سے محروم کرنے کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں کمپنی کا علاقہ بھی ہو سکتا ہے لیکن اسے دوسرے طریقے سے بھی لکھا جا سکتا ہے لیکن اشتہار سے جو عام تاثر پیدا ہوتا ہے وہ ملتان سے بیگانگی کا ہے یقیناً اس کمپنی کا یہ منشاء ہرگز نہیں ہو گا کہ ملتان جیسے حساس خطے کے عوام کی دل آزاری کرے لیکن جس اشتہاری کمپنی کو انہوں نے اشتہار شائع کرنے کی ہدایت کی ہے یہ اسکی عملی جہالت ہے کہ اس نے اچھے بھلے اشتہار کو امتیاز کے اظہار کا ذریعہ بنا دیا ہے۔

ایک عرصے سے ٹیلی ویژن اور ریڈیو سے جو اشتہارات دیکھنے کو مل رہے ہیں ان کے بارے میں ناظرین اور سامعین کے جذبات کچھ اچھے نہیں انکا خیال یہ ہے کہ اشتہارات تیار کرنے والی کمپنیاں ابھی تک اپنے علم، تجربہ اور مہارت کو اس معیار پر نہیں لا سکیں جس سے پاکستانیت کا رنگ جھلکے اکثر اشتہارات ہمارے نظریہ فکر کی نفی کرتے ہیں مثلاً خاندانی منصوبہ بندی کے بھونڈے اشتہارات پورے خاندان کے افراد کو پریشان کر دیتے ہیں جب چائے کا استعمال غم میں کیا جاتا ہے اسی طرح گھی کے اشتہارات میں ماں کی محبت یاد آ جانے کا جملہ سمجھ نہیں آتا۔ سگریٹ کے اشتہارات میں سسپنس، مہم جوئی، ڈاکوؤں کا حملہ، بلی کی اچانک چیخ، سگریٹ پینے کے ماحول کو پریشان کن بنا دیتا ہے اگر سگریٹ کا اشتہار دکھانا ضروری ہے تو اس کے لطف اور سرور کی کیفیت بھی تو پیدا کی جا سکتی ہے اتنی الجھنیں، مشکل جوئی دکھانے سے کیا سگریٹ کے ذائقہ میں اضافہ ہو جاتا ہے ہمارے اشتہاربازی کے ادارے اپنے سٹاف کو Creativeness کی طرف دھیان دینے کی بجائے بعض بے مقصد سا اشتہار تیار کرا دیتے ہیں اور اس طرح انکا کام ختم ہو جاتا ہے۔ Product بکے نہ بکے انکا اس سے کوئی تعلق نہیں

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

سنڈیوں والے اشتہار کیا اثر دکھائیں گے اگر سنڈیاں دوائی سے ختم نہ سکیں White fly کا علاج تو نظر آتا نہیں ٹیلی ویژن پر سنڈیاں ہی سنڈیاں نظر آتی ہیں۔ لاہور کی مشروب تیار کرنے والی کمپنی کا اشتہار اس لئے دکھتی رگ پر چوٹ لگا کیونکہ ملتان پہلے ہی بڑا حساس ہو چکا ہے اسے گاہے بگاہے ایسے جھٹکے لگتے ہیں کہ ملتانی بڑے جذباتی ہو جاتے ہیں ایک ایک کر کے ان سے مادی ترقی کی اشیاء چھین لی جاتی ہیں ابھی چلڈرن کمپلکس کا صدمہ باقی ہے کہ یہ ملتان سے منتقل کر کے لاہور بھیج دیا گیا اور اب فیروز پور روڈ پر گلاب دیوی ہسپتال کے پاس نہایت شاندار عمارت کی تعمیر کی صورت میں موجود ہے جسے دیکھ کر حسرت بھی ہوتی ہے کہ ہمارے نمائندوں نے اس چلڈرن کمپلکس کو منتقل ہونے سے روکنے میں کوئی کردار ادا نہیں کیا ذرائع ابلاغ نے بھی کوئی واویلا نہیں کیا بہر حال ایک اچھے منصوبے سے ملتان محروم ہو گیا لاہور ہائی کورٹ ملتان بنچ کی منتقلی کا بھی کچھ لوگوں نے ذکر کیا ہے مگر اسکی کئی بار تردید ہو چکی ہے ٹیلی ویژن سنٹر کے قیام کی نوید پر فنی خرابی کئی بار سننے کو مل چکی ہے۔ ملتان کے دانشور تو یہاں تک بھی متفق ہو چکے ہیں کہ اگر ٹیلی ویژن سنٹر سر دست بنا مشکل ہے تو کم از کم Sub sta-tion قائم کر دیا جائے جگہ کا بھی مسئلہ نہیں ریڈیو سٹیشن کی عمارت میں یہ قائم ہو سکتا ہے اور یہاں پروگرام ریکارڈ کئے جا سکتے ہیں اور انہیں لاہور سنٹر سے ٹیلی کاسٹ کر دیا جائے۔

اہل ملتان کو ایک عرصہ سے یہ گلہ بھی ہے کہ یہاں ان کی ثقافت، تہذیب کے حوالے سے جو خزانے موجود ہیں انکو محفوظ کرنے کا کوئی عجائب گھر نہیں بہت سے قیمتی دفینے، دستاویزات، قلمی نسخے، نوادرات زمانے کے ہاتھوں برباد ہو رہے ہیں۔ آثار قدیمہ کے نادر نمونے، سنگ و خشت کی صورت میں کاشی گری کے شاہکار روز بروز ماند پڑتے جا رہے ہیں۔ ملتان سے تو کم از کم حیدر آباد ہی اچھا ہے جہاں سندھ یونیورسٹی جامشورو میں سندھیالوجی ڈیپارٹمنٹ موجود ہے جہاں موہنجوڈارو سے لیکر کوٹ جی کی تہذیب کے سارے شاہکار موجود ہیں۔ سندھ کے ظروف، اشیاء خورد و نوش اور انکے پیمانے سب موجود ہیں اور ادھر ملتان جو صدیوں کی تہذیب کا مرکز ہے اسکی تہذیب کا کوئی بھی حصہ محفوظ نہیں ان گنت اشیاء ضائع ہو رہی ہیں انکو سنبھالنے والا کوئی نہیں۔ ملتان آرٹس کونسل کہنے کو تو ایک عمارت بن گئی ہے مگر اسکی سرگرمیاں صرف خطاطی کی نمائش تک محدود ہیں آگے اسکا کیا عمل ہے اسکا کون تعین کرے گا الحمراء لاہور ثقافتی مرکز بن گیا ہے اور ملتان آرٹس کونسل سے بھی اور

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

پیشنل سنٹر سے بھی دونوں معنوں میں محروم ہے ضرورتوں کو پیدا کرنا ہے اگر ان میں سرگرمیاں مفقود ہوں۔ ملتان علم و فن کا شہر ہے تہذیب و تمدن کا مرکز ہے۔ اللہ والوں کا مسکن ہے یہ مزار، یہ مقابر، یہ کشادہ حویلیاں، وسیع و عریض مساجد سب مسلمانوں کی ثقافت کے علمبردار ہیں۔ یہاں کے ظروف، مٹی کے پیالے، گھڑے سادہ زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ لباس میں کرتا، چادر، سر پر پگڑی یا ٹوپی مسلمانوں کے ان ایام کا حوالہ بنتے ہیں جب محمد بن قاسم کے یہاں قدم پڑے تھے اور ایک وضعدار تہذیب نے جنم لیا تھا ملتان اپنے خلوص کے اعتبار سے ابھی انہیں قدروں کو اپنے سینے میں سمیٹے ہے ور جدید بننے کا اسے بھی بے حد شوق ہے مگر اسکے حصہ میں مرکزی و صوبائی گرانٹ نہ ہونے کے برابر ہے ابھی بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان کی کانووکیشن کا انعقاد ہوا ایسے موقعوں پر خطیر گرانٹ دینے کا اعلان ہوتا ہے بعض شہروں کے اداروں کو بہت کچھ گرانٹ ملتی ہے بعض علمی تنظیموں کو ۲۰ لاکھ تک کی گرانٹ مل جاتی ہے جب کہ جنوبی پنجاب کی اہم ترین دانش گاہ کو صرف ۱۰ لاکھ کیا کوئی بھی پیشکش ملتان کیلئے نہیں؟

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

پی۔ آر۔ او

جب کبھی ہم سکول کے طالب علم تھے ہمیں انگریزی کے پریڈ میں ہمارے شفیق استاد جس مضمون کی زیادہ مشق کراتے تھے وہ مضمون پوسٹ مین کا ہوا کرتا تھا اسکی وجہ ہم کبھی ان سے پوچھتے تو وہ بتاتے "بیٹا یہ عظیم انسان ہے سرد، گرمی، دھوپ، چھاؤں، نزلہ، زکام ہر حالت میں اپنی ڈیوٹی دیتا ہے۔ گھر گھر گھومتا ہے۔ صبح سے شام تک سائیکل پر گزار دیتا ہے۔ امانت، دیانت، صداقت جو کبھی اس محکمہ کے اصول مقرر ہوئے تھے وہ آج بھی ان اصولوں کا محافظ ہے یہ کبھی نہیں ہوا کہ سجاد کی ڈاک شہزاد کے گھر تقسیم ہو جائے بلکہ کبھی یہ تمہیں گلی محلے میں ملے تو اسے ادب سے سلام کیا کرو" استاد محترم کی باتیں آج بھی ذہن کے گوشوں میں محفوظ ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ ایک کردار اور بھی آنکھوں کے سامنے گھومتا رہتا ہے جسے مختصراً پی آر او کہتے ہیں اور تفصیل سے پبلک ریلیشن آفیسر اور اردو میں افسر تعلقات عامہ کہتے ہیں۔ یہ پی آر او بظاہر افسر کہلاتا ہے لیکن کام اور نام کے اعتبار سے پوسٹ مین کا دوسرا بھائی ہے۔ پوسٹ مین تو خوش نصیب ہے کہ اس کا معاشرہ میں بڑا نام ہے اور لوگ اس کا کئی کئی گھنٹے انتظار کرتے ہیں اور اس کے حوالے سے مضمون یاد کرنے کی مسلسل محنت کرتے ہیں۔ پیار کرتے ہیں۔ پی آر او خود پی آر کرتا ہے بلکہ اردو والا "پیار" کرتا ہے لیکن لوگ اس سے پیار چھ کم کرتے ہیں۔ اپنے بھی خفا سے بیگانے بھی ناخوش۔ دفتر آئے تو پہلی اس کی پیشی صاحب کے سامنے ہوتی ہے یہ خبر کیوں چھپی تصویر نمایاں کیوں نہ لگی۔ خبر چھوٹی کیوں لگی اور بڑی کیوں نہ لگی اور غم حالات کی تصویر بن کر جب وہ پریس کے اداروں کا رخ کرتا ہے تو صحافی برادری کے گلے شکوے اسے جینے نہیں دیتے۔ دن اداس اور راتیں پریشان۔ ایک بلا ہو تو سر سے ٹالے۔ دن بھر ناکردہ گناہوں کی سزا اور رات کو یہ خدشہ کہ صبح فلاں خبر لگ گئی تو کیا بنے گا۔ یہ خدشے اور یہ اندیشے اسے چین سے جینے نہیں دیتے۔ اور اس کے مقابلے میں پوسٹ مین دن بھر کام کرتا ہے اور جدھر سے گزرتا ہے سلاموں اور محبتوں کے انعام وصول کرتا ہوا گھر پہنچتا ہے۔ رات کو دن بھر کی اکٹھی کی ہوئی دعاؤں سے لوگوں کی چاہتوں سے آرام کی نیند سوتا ہے اور پھر صبح وہی کام اور وہی دعاؤں کا انعام۔ ادھر پی آر او صبح اٹھ کر اخبار کے صفحات کو ڈرتے ڈرتے کھولتا ہے ہر صفحہ پر ہر سطر پر نگاہ دوڑاتا ہے اور اس طرح اخبار

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

پڑھتا ہے جس طرح امیگریشن والے پاسپورٹ کو پڑھتے ہیں کہ کہیں سے کوئی غلطی تلاش کر لیں۔ اگر سارے اخبار میں کہیں کوئی غلط یا منفی خبر نہیں ہو صاحب کو بڑی تسلی کا احساس ہوتا ہے تو اس کا کچھ وحشت سے منہ اترتا ہے ورنہ حکم یہ ہوتا ہے کہ ہر بری خبر کی وضاحت اور وہ بھی صحیح سو پرسے بیان کرنی ہے اب خبر کے دفاع کیلئے جواز تلاش کئے جاتے ہیں تاکہ اپنی Skin محفوظ ہو سکے۔ اگر یہ حکم ہوتا ہے کہ اس کی وضاحت جاری کریں تو وضاحت کا دوسرا خبر میں ہوتا ہے اور اس پر پرچے کے کونوں کی صحافت کی طرح وضاحت کے ساتھ تبصرہ بھی جاری ہو جائے تو پھر پی آر او کے خودکشی کے دن قریب آجاتے ہیں۔ اس کے بعد اس کے دامن میں کچھ نہیں بچتا۔ اکثر لوگ خواہش کرتے ہیں کہ وہ کسی محکمہ میں پی آر او مقرر ہو جائیں۔ سمارٹ، فرض شناس، بھاگتا دوڑتا پی آر او کسی بھی تنظیم میں بہت اچھا لگتا ہے۔ صاحب تک اس کی رسائی بھی ہوتی ہے اور بڑے بڑے وفود کو خوش آمدید بھی کہتا ہے۔ صحافت سے تعلق مشاغل تک کی تقریبات میں وہ مدعو بھی ہوتا ہے کبھی کبھار تصویر بھی چھپ جاتی ہے کچھ لوگ خوش بھی ہوتے ہیں لیکن اکثر ناراض رہتے ہیں ان کی نظر میں کہنا ہے شوق مصاحب کچھ سے ہے اتراتا ہے کے مصداق ہوتا ہے۔ کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ اس کے پیچھے کتنے انسان کے ندر کٹے ارمان ہے ہیں دکھوں اور غموں کی کتنی بڑی داستان چھپی ہے جس کی تو پورا دیوان شامل ہے۔

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

اکثر لوگ خوش ہوتے ہیں کہ پی آر او جدید منصب میں بڑا امتیازی منصب ہے وہ پریس کانفرنس کا انعقاد کرتا ہے کوئی واقعہ ہو جائے تو پریس نوٹ جاری کرتا ہے اپنے محکمہ کی صفائی میں بیان جاری کرتا ہے اپنے محکمہ میں رابطہ کا پل ہوتا ہے۔ اعتماد اور محبت کی فضا پیدا کرتا ہے۔ اپنے محکمہ کے بارے میں غلط فہمیوں کو دور کرتا ہے اور ایک خوشگوار فضا کو تخلیق کرنے میں اپنی تمام توانائیاں صرف کرتا ہے۔ کبھی اپنے محکمہ کا ترجمان ہوتا ہے کبھی وزیر بنتا ہے۔ کبھی مشاورت کیلئے طلب کیا جاتا ہے۔ تعلقات کا ہر نقطہ نظر کی وضاحت کا ایڈوائزر ہوتا ہے بلکہ ہمارے ایک دوست تو اس کام کو ہمیں فرشتوں سے جا ملتے ہیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

خدا جانے وہ سچ کہتے ہیں یا محض پی آر او حضرات کی دلجوئی کرتے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ اسے بڑی بڑی آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے۔ روز جینا پڑتا ہے اور روز مرنا پڑتا ہے۔ خوش اخلاقی اس کا ماٹو ہے۔ مخالفتوں کے پہاڑ ہوں یا شکوہ شکایت کے انبار ہوں ان سب حالات میں اسے مسکرانا ہے بلکہ اگر کوئی زیادہ تنگ کرے اور اسے کوئی اس بات پر اکسائے کہ آپ برا کیوں نہیں مناتے تو اس کا نہایت مختصر جواب ہوتا ہے "I have to bear the insult" کیونکہ محکمہ مجھے اسی بات کی تنخواہ دیتا ہے۔ ملکی سطح پر ان کی ایک سوسائٹی بھی ہے جسے پاکستان پبلک ریلیشن سوسائٹی کہتے ہیں جو ہر سال تقریب کرتی ہے اور اپنے پی آر او کو میڈل دیتی ہے اگر اس پر چھ من جائے تو یہ سوسائٹی روم و شام تک نظر نہیں آتی۔ بیچارہ پی آر او کاغذی پیراہن بن کر اکیلا چھری چوک پر کھڑا اپنی داستاں سناتا ہے اور کوئی سن لے تو اس کی مہربانی وگرنہ نہ کہیں راستہ ہے اور نہ کہیں نشاں۔ اور اکیلا پی آر او ہاتھ میں استعفا لئے پھرتا ہے۔ یہ ہے ہمارا آج کا پی آر او۔ بے روزگاری کے اس دور میں سوچئے کہ کیا اگر آپ کو کوئی پی آر او بنائے تو آپ بننا پسند کریں گے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

سواری اپنے سامان کی خود حفاظت کرے

بڑے ہوٹلوں کی کشش بھی بڑی ہوتی ہے بعض اوقات فائیو سٹار کا لفظ متنفر طبیعت کا درجہ اختیار کر جاتا ہے جتنی کشش جلدی پیدا ہوتی ہے اتنی زیادہ اکتاہٹ بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ کون ایک جیسے کھانے کھائے وہی مت جلتی ڈشیں وہی شوں شوں کرتی گرم آگ کے شعلے بھڑکاتی ڈشیں وہی آخر میں گرین ٹی اور پھر چھٹی۔ ایسے ٹھکانے اور ایسے عشائیے اگر معمول بن جائیں تو انسان تھک جاتا ہے اور پھر اس کا دل چاہتا ہے کہ کسی دور سڑک کے کنارے کسی ایسے ہوٹل کا رخ کرے جہاں تنور کی روٹی ہو بیٹھنے کے لئے بڑی بڑی چارپائیاں ہوں مٹی کے گھڑوں میں پانی رکھا ہو اور ایسی ڈشیں کھانے کو ملیں جو دیسی مزاج اور دیسی انداز سے تیار کی گئی ہوں ایسے ہوٹلوں کی کمی نہیں کسی بھی بڑی شاہراہ پر ایک بار سفر کرکے دیکھیں ایسے پرکشش ہوٹل آپ کو نظر آئیں گے جہاں مسافروں کے لئے آرام اور قیام کی تمام سہولتیں میسر ہوتی ہیں۔ ٹائر ٹیوب پنکچر کی دکانیں، مکینک، حجام کی دکانیں اور چھوٹے موٹے جنرل سٹور جہاں سفر کی سہولتیں مہیا کرنے والی اشیاء دستیاب ہوتی ہیں۔ ان ہوٹلوں میں نماز پڑھنے کا بھی معقول انتظام ہوتا ہے یا تو ان ہوٹلوں کے پاس کوئی نہر گزر رہی ہوتی ہے اگر وہ نہ ہو تو ان ہوٹلوں کے مالکوں نے ٹیوب ویل نصب کر رکھا ہوتا ہے جہاں ٹھنڈا اور تازہ پانی ہر وقت دستیاب ہوتا ہے ان ہوٹلوں میں کڑاہی گوشت دال اور تنور کی تازہ روٹی جو ہر دور لطف مہیا کرتی ہے کاش آدمی ہر روز مسافر ہو۔

اک مسافر ہوں سفر ہے کام میرا
مجھے راہ طلب میں شام کیوں ہو

ویسے زندگی بھی ایک مرحلے کے مسافر جیسی ہے جو منزلیں طے کرتا ہوا آخری منزل کو پاتا ہے جس میں کہا گیا ہے اے نفس مطمئنہ لوٹ اپنے رب کی طرف وہ تجھ پر راضی اور تو اس پر راضی۔ ایسی منزل کب ملتی ہے؟ جب سواری اپنے سامان کی خود حفاظت کرے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

لٹنے کا خوف اور نہ رہزن کا ڈر مجھے
یہ فائدہ تو بے سروسامانیوں کا ہے

سفر ایک ایسی ضرورت ہے جس سے کسی کو بھی مفر نہیں اور ویسے بھی سفر میں ایک فضیلت یہ بھی حاصل ہے کہ سفر میں دعا قبول ہوتی ہے اور تین دعائیں تو ایسی ہیں جو تیر بہدف ثابت ہوتی ہیں ادھر دعا مانگی ادھر اسے قبولیت کا اعزاز مل گیا۔ مظلوم کی دعا مسافر کی دعا اور والد کی اولاد کے حق میں دعا۔

بات سفر اور سواری کی ہو رہی تھی یہ آج تک سمجھ نہیں آسکا کہ بعض چھوٹے ہوٹلوں پر بسوں کے اڈوں پر حجام کی دکان پر اور بس، ویگن کے اندانشا پردازوں کا یہ شاہکار جملہ کہ ''سواری اپنے سامان کی خود حفاظت کرے'' اس تحریر کے پیچھے کونسی حکمت پوشیدہ ہے ایسا کیوں لکھا جاتا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ مسافر ایک لمحہ کے لئے غافل ہو جائے اور سامان اس کا غائب ہو جائے اگر اس پر وہ احتجاج کرے تو اسے یہ تحریر پڑھا دی جائے کہ سواری اپنے سامان کی خود حفاظت کرے۔

اگر اتنی بے اعتباری کا یہ ہوٹل، یہ بس، یہ اڈا ہے تو پھر مسافروں کو یہاں آنے کی ضرورت ہی کیا ہے اگر مالکان اس کے سامان کے تحفظ کے لئے کچھ نہیں کر سکتے تو پھر سواری اور مسافر کے درمیان جو صدیوں کا رشتہ قائم ہے وہ ٹوٹ جائے گا۔ آخر مسافر کی بھی کوئی عزت ہوتی ہے وہ کب تک اپنا تھیلا اپنے گلے میں لٹکائے پھرے کوئی تو وہ جو اسے چند لمحوں کے لئے اطمینان دلائے کہ آپ کے سامان کو کوئی خطرہ نہیں۔ اطمینان سے کھانا کھائیں۔ آرام کریں اور اگلی منزل کی راہ لیں مگر محسوس یہ ہوتا ہے کہ یہ سرائے یہ ہوٹل اور یہ بسیں اور یہ اڈے صرف مسافر کو لوٹنا جانتے ہیں سکھ دینا نہیں چاہتے۔ مسافر کے پاس جو بھی پونجی بچی ہے وہ سب چھیننا چاہتے ہیں اگر اس کی حفاظت کرنا ہوتی تو بھلا ایسے دل آزار جملے لکھتے ہی کیوں کہ سواری اپنے سامان کی خود حفاظت کرے کیا اچھا دور تھا جب ملتان کے ایک نامور شاعر خلیق ملتانی کا بستر بس کی چھت سے ایسا گرا کہ گم ہو گیا جس پر اس نے ایک بستر مرحوم پر مرثیہ لکھا اور عوام میں بہت مقبول ہوا۔ خلیق ملتانی کو اتنے بستر عوام کی طرف سے اور بس مالکان کی طرف سے ملے کہ اس نے وہ بستر بیچ کر اچھی خاصی آمدنی کمالی۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

مرثیہ لکھے گا کون حسرت مرحوم کا
چشتیاں سے لے کر حاصل پور تک موجود تھا
میں تو بس میں تھا مگر بستر میرا بس میں نہ تھا

خلیق ملتانی نے چھ اس قسم کے شعر لکھ کر بس کمپنی کو احساس دلایا کہ مسافر کی ایک ایک چیز قیمتی ہوتی ہے اسے احتیاط سے جانا بس کمپنی کی ذمہ داری ہے صرف یہ لکھ کر جان چھڑا لینا کمال کی دانشمندی ہے کہ اگر سامان گم ہو گیا ہے تو ہم کیا کریں ہم نے تو پہلے ہی لکھ دیا تھا کوئی یہ بھی تو کہہ سکتا ہے کہ جیسے کسی غریب آدمی کا بیٹے میں مکمل چوری ہو گیا تھا جب کسی نے اس سے پوچھا کہ بیٹا کیسا تھا اس نے جل کر جواب دیا یہ کوئی بیٹا تھا یہ تو بس غریب رمضان کے مکمل چوری کا ذرمہ تھا جو کامیاب ہو گیا کہیں ایسا تو نہیں کہ مسافر کو منزل سے دور کرنے اور راستے میں الجھنے اور اس کے قیمتی اثاثے سے محروم کرنے اور پھر باقی کے سفر کے لئے ہر راہ چلتے آدمی سے پیسے مانگ کر سفر کرنے کی راہ دکھانے کا نام یہ تحریر ہے کہ "میں مسافر ہوں ابھی سفر باقی ہے میری امداد کریں" ایسی درد بھری اپیلیں کیوں پیدا ہوتی ہیں مسافر کی بے بسی مجبوری کا مذاق کیوں اڑایا جاتا ہے۔ ہمارے حکیم بخاری جو اولڈ کیلین ایسوسی ایشن کے صدر ہیں ایسے ہی ان کا بریف کیس بس والوں نے غائب کر دیا اور آج تک نہیں ملا۔ اس بیدردی کا ملال احتجاج کریں۔ ہر محفل میں وہ اس کا ذکر کرتے ہیں لیکن جس طرح درد کو جس طرح بھی اٹھاؤ درد ہی رہتا ہے اسی طرح مسافر کا احتجاج بھی۔ لیکن اور کانوں پر تحریر کردہ عبارت بھی اپنے اندر کئی معنی رکھتی ہے اور ہر معنی کی تاثیر بھی درد بھری ہے۔ وہ درد جس کے ازالہ کے لئے ابھی کوئی دوا کوئی ایجاد نہیں ہوئی Lost And Found سیکشن کی امداد نہیں بلکہ کسی دے سکتا ہے کہ بس کمپنی کر اور بھول جاتے کیا کوئی بریف کیس بھی تھا۔

فرصت نہ ملے جب ان کا ساتھی
ہمت ہار کے نہ جانا ساتھی
ملے گی منزل کے کی مشکل
یہ بھی وقت گزر جائے گا

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

لیکن مسافر کو اپنا سفر جاری رکھنا چاہیئے سامان کی حفاظت بس کا مالک نہیں کرے گا بلکہ کائنات کا مالک کرے گا۔ حضرت لقمان نے کیا خوب فرمایا تھا جو چیز اللہ تعالیٰ کے سپرد کی جائے وہ اس کی حفاظت خود کرتا ہے لہذا سواری اپنے سامان کی حفاظت نہ کرے بلکہ اپنی حفاظت کا خیال کرے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ہمارے کان اور بجٹ کا اعلان

وہ جب اعلان کرتے ہیں بجٹ کا غریبوں کا ہی ہو جاتا ہے جھٹکا

ہر سال جب جون کا مہینہ آتا ہے ہر شخص کو حسب توفیق تفتیش شروع ہو جاتی ہے والدین کو اپنے بچوں کی کہ گرمی بڑھ رہی ہے اور سکول بند نہیں ہوئے۔ خبروں میں چھپیں شائع ہوتی ہیں کہ معصوم بچے اس غضب کی گرمی میں کیسے پڑھیں اور کیسے سکول جائیں بالآخر محکمہ تعلیم موسم گرما کی تعطیلات کا اعلان کرتا ہے پھر ان چھٹیوں کے بعد خیال آتا ہے کہ انہیں کیسے گزارا جائے کئی صحت افزاء مقامات ذہن میں آتے ہیں اور جن کی جیب میں پیسے ہوتے ہیں اور ان کی گاڑیاں پیٹرول سے فل ہوتی ہیں ان کا رخ کوہ مری اور جن کی جیب خالی ان کی سیر قصبہ منہ تک محدود ہو جاتی ہے جن کی ٹھنڈے کمرے میسر ہوں وہ گھر سے باہر نہیں نکلتے اور جن کے کمرے گرم ہوں وہ سارا دن گلی کی دکان پر یا ستون ہٹ کی ریڑھی پر گزارتے ہیں گویا جون ایک ایسا مہینہ ہے جو ہر شخص کو ہر طبقہ فکر کو مصروف کر دیتا ہے۔ جاب ہے تو چھٹیاں منانے کا سوچتا ہے دوستوں سے پروگرام بناتا ہے۔ تاجر ہے تو سارے ٹاٹ اکٹھے کرتا ہے اگر صنعتی اداروں سے تعلق ہے تو ساری توجہ صنعت کی پیداوار کے بڑھانے اور مارکیٹ میں رسنے کی فکر ہوتی ہے تاکہ بجٹ کے آنے سے پہلے یا نہیں سٹاک کر لیا جائے یا نہیں فروخت کر دیا جائے غرض یہ کہ جون کا مہینہ ہر جگہ دکھائی دیتا ہے اور حالت کی جون تک بدل جاتی ہے۔

جون اور بجٹ کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے ادھر جون شروع ہوا ادھر بجٹ کے ڈرافٹ تیار ہونا شروع ہو گئے کہیں اعداد و شمار کا مرحلہ کہیں آمدنی سے زیادہ اخراجات کا بوجھ کہیں خسارہ اور اس کی سرمایہ کاری اور کہیں پیٹ پر پتھر اور خالی رکابی گویا بجٹ اور جون "ایسی ہستیاں" ہیں جن سے کمزور دلوں کو ڈر لگا رہتا ہے کہ خدا جانے اس دفعہ "جون" کس پر کرے کا۔ دل کے کمزور اور اختلاج قلب کے مریض جون سے اس طرح بھاگتے ہیں جیسے کوا غلیل سے بھاگتا ہے اور بجٹ سے غریب اس طرح بھاگتا ہے جیسے مرغی کا بچہ چیل سے بچنے کے لئے مرغی کے پروں میں چھپ جاتا ہے۔ غریب کو بجٹ سے اس لئے ڈر لگتا ہے کہ نجانے بجٹ کس کس طرف سے حملہ کرے گا کہاں کہاں چوٹ کھانے کا دل کے کونے سے تار ہلانے کا یا

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

سیدھا دل پر قبضہ جمائے گا۔ غریب کو کیا دے گا اور امیر کے لئے کن مراعات کا اعلان کرے گا۔ ہر کام بجٹ کے لئے وقف ہو جاتا ہے جونہی بجٹ کا اعلان ہوتا ہے بجٹ جیسا بھی ہو اور جس طرح کا بھی ہو ماہرین اقتصادیات کے تبصرے قابلِ ذکر ہوتے ہیں۔ ان حالات میں اس سے بہتر بجٹ ممکن نہ تھا وزیرِ خزانہ بلا شبہ مبارکباد کے مستحق ہیں دوسرا بجٹ پر منفرد تبصرہ ہوتا ہے۔ بچے گھروں کے دیپ بجھا دیئے گئے ہیں گویا یہ طنز بجلی کے نرخوں پر ہوتے ہیں۔ غریب کے منہ کا نوالہ چھین لیا گیا ہے اس کا اشارہ مہنگائی کی طرف ہوتا ہے۔ چولہے سرد پڑ گئے ہیں ہانڈی خشک ہو گئی ہے اس کا اشارہ گھریلو اشیاء پر مہنگائی اور گیس کے بڑھتے ہوئے نرخوں کی طرف ہوتا ہے۔ حبیب جالب نے شاید اسی حوالہ سے بجٹ پر اپنا ردِ عمل ظاہر کیا تھا اگرچہ بجٹ ۱۹۹۱ء کا تھا لیکن آج بھی یہ شعر درست محسوس ہوتا ہے۔

وہ جب اعلان کرتے ہیں بجٹ کا
غریبوں کا ہی ہو جاتا ہے جھٹکا

ہمارے وزیر خزانہ میاں سرتاج عزیز جہاں ایک طرف ماہر اقتصادیات ہیں دوسری طرف علم و ادب کی شخصیت بھی ہیں۔ انہوں نے اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کی ان تحریکوں میں حصہ لیا ہے جو قیامِ پاکستان کے لئے تھی اور پہلے کالج اور کامرس سے کامرس کی تعلیم نے انہیں ایک اعلیٰ پایہ کا اقتصادی ٹیکنوکریٹ بنا دیا ہے۔ وہ یقیناً جانتے ہیں کہ قوم کے کان کیسا بجٹ سننا چاہتے ہیں۔ ایسا بجٹ جس میں آمدنی کے وسائل اس طرح سے بڑھیں کہ ٹیرف اور ٹیکسوں کا بوجھ کم ہو جس میں زرعی شعبہ جیسے One Crop Economy یعنی کاٹن کی بنیاد پر چلا جا رہا ہے اس کاٹن کی پیداوار کو ۹۲-۱۹۹۱ء کی سطح پر لائیں یعنی ایک کروڑ ۲۳ لاکھ گانٹھیں ہم کاٹن سے حاصل کر چکے ہیں اب ۸۷ لاکھ ملکی سطح پر گانٹھیں ہماری اچھی کارکردگی کی علامت ہیں اس کے کیا اسباب ہیں اس کے بارے میں سوچنا ہمارے وزیرِ خزانہ کی ذمہ داری ہے ملک کو واقعتاً ایک صنعتی قوت بنانے کی ضرورت ہے اس کے لئے روزمرہ استعمال کی عام اشیاء بنانے کی بجائے بنیادی صنعتوں کی طرف توجہ دی جائے اور خود انحصاری کی کوشش کی جائے۔

ہمارا قومی بجٹ ہمیں اکیسویں صدی میں قدم رکھنے کے قابل بنانے ایک طرف وسائل میں اضافہ ٹیکس لگا کر انہیں بلکہ غیر آباد، ویران لاکھوں ایکڑ اراضی کو قابلِ کاشت بنا

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کر دیا جائے۔ بیمار صنعتی یونٹ کا جدید سائنسی سرجری سے علاج کیا جائے اور عوام پر پڑنے والی مہنگائی، بیروزگاری کے اثرات دور کئے جائیں۔ قومی بجٹ کا لفظ تقریروں میں بڑا استعمال ہوتا ہے لیکن عملاً پیشرفت نہیں ہوتی اس کی وجہ کیا ہے ہم جناب وزیر خزانہ سے ادب سے اور اشتہارات کی کمپنیوں سے معذرت سے عرض کریں گے کہ آپ نت نئے اشتہارات عوام کو Consnption کو بڑھا رہے ہیں جب ہر چیز خریدنے کے لئے آپ مارکیٹ کا رخ کریں گے تو بچت کہاں ہوگی یا بچت کرالیں یا اشتہارات سے عوام کو روشناس کرالیں۔ سادہ زندگی اپنانے کی تلقین نہیں کر سکتے۔ ہمارے وزیر خزانہ کا تعلق سے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے خازن رہے ہیں کیا وہ بتا سکتے ہیں کہ مہنگائی پر کیسے قابو پایا جا سکتا ہے بیروزگاری نے نوجوانوں کی آنکھوں میں جو بیزاری پیدا کی ہے اس کا مداوا بجٹ میں کیا ممکن ہے؟ قوم پر قرضوں کا بوجھ ہے اس میں غریب آدمی کا کس قدر دخل ہے اگر اس نے قرضے نہیں لئے تو اسے سزا بھی نہیں ملنی چاہئے اسے آسودہ حال زندگی دینا ہمارے قومی بجٹ کی ذمہ داری ہے حکومت کی آمدنی میں اضافہ کم کیوں ہے اور مصارف زیادہ کیوں ہیں؟ یہ بھی جناب سرتاج عزیز صاحب سوچیں عوام تو صرف گھر کے اندر اور باہر اپنے شہر میں اور اپنے صوبے میں پاکستان کے کسی بھی حصے میں پرسکون ماحول اور احساس تحفظ چاہتے ہیں اور ایک ایسی مثالی زندگی گزارنے کے آرزومند ہیں جس میں روزگار کے وسائل ہوں۔ کھانے پینے کی اشیاء سستی ہوں۔ ویگن اور بس والے ان کو سوار کریں اور کرایا کم لیں ان کے پیٹرول سستا کرنا جناب سرتاج عزیز صاحب کی ذمہ داری ہے۔ غریب آدمی گھر سے نوکری تک ویگن میں سیٹ چاہتا ہے کم کرایہ چاہتا ہے اور واپس گھر آتے ہوئے اسے روٹی اور سالن تیار ملے اور دفتر سے واپس آتے ہوئے اس کے ایک ہاتھ میں بچوں کے لئے قلم کتاب اور دوسرے ہاتھ میں آموں کا تھیلا ہو۔ اگر تو بجٹ میں ایسی Provisions موجود ہیں تو پھر کان بجٹ کے اعلان کے لئے تیار ہیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

یہاں تھوکنا منع ہے

ہم گولڈن جوبلی تقریبات منا رہے ہیں۔ ہمیں آزادی حاصل کئے ہوئے پچاس سال ہو گئے ہیں اس شاندار کامیابی پر اور اس مسرت و جانیت کے موقعہ پر ملک بھر میں جشن کا سماں ہے کیونکہ نہ ہو۔ ایک طویل آمریت کے بعد ہمیں ایک جمہوری ریاست ملی ہے۔ ایک عرصہ ادھر ادھر ہونے کے بعد ملک میں ایک جمہوری مملکت مستحکم ہوئی ہے وگرنہ ماضی میں ہم نے کیا کیا دکھ نہیں اٹھائے جس شعبہ حیات کو سامنے رکھیں ظلم اور زیادتی کی کئی داستانیں سامنے آتی ہیں گزشتہ برسوں میں ہم نے جمہوریت کو کم موقعہ دیا ہے اور مارشل لاء کا زیادہ دور دیکھا ہے۔ عوامی منشا کے قوانین کم بنائے ہیں اور آرڈی نینس زیادہ چلائے ہیں۔ انہیں آرڈی نینسوں میں ایک آرڈی نینس پریس اینڈ پبلی کیشن آرڈی نینس ۱۹۶۳ بھی ہے جسے عرف عام میں پریس کے کالے قوانین کہتے ہیں جس میں کئی اخبار بند ہوئے۔ کئی اخباروں کے ڈیکلریشن منسوخ ہوئے اور کئی صحافی قوت پرواز سے ایسے محروم ہوئے کہ پھر قلم پکڑنے کی سکت پیدا ہی نہ کر سکے اور کاغذ اور دوات ان کے ہاتھ سے چھوٹ گئے۔ کہتے ہیں ان دنوں اپیل، دلیل اور وکیل کی گنجائش دستیاب نہ تھی۔ ناقدین تو اور بھی بہت کچھ کہتے ہیں کہ ہمارے بنیادی حقوق سلب تھے۔ کہیں آزادی نہ تھی۔ مجید لاہوری نے شاید انہی دنوں کے حوالے سے بات کی ہے۔

76
کرتا نہیں کوئی کرم ، کھاتا نہیں کوئی ترس
پیتے ہیں خون جگر جیسے ، ہے یہ گنے کا رس

گزشتہ دنوں کو سامنے رکھنے مارشل لاء کے ۲۳ سال اور جمہوریت کے ماہ و سال کو میزان میں تولنے کے بعد ایک چیز سامنے آتی ہے ماضی کا کوئی عہد ہو۔ جیسے کوئی حکمران ہو ہمیں ایک آزادی ہر دور میں حاصل رہی ہے جسے کسی حکومت نے ڈسٹرب نہیں کیا بلکہ ہر حکومت نے ہماری اس آزادی کو عملاً تسلیم کیا ہے کیونکہ اس پر کوئی تعزیر یا سزا تو نہیں ہوتی۔ آزادیوں میں سے ایک آزادی ہر جگہ تھوکنے کی ہے۔ بلکہ "یہاں تھوکنا منع ہے" آپ مزے سے تھوکیں کوئی آپ کو نہیں ٹوکے گا اور نہ ہی کوئی روکے گا۔ ہم نے کس کس جگہ نہیں تھوکا

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

نہ کوئی جگہ چھوڑی اور نہ کسی شخصیت کو بخشا ہے۔ اقتدار اور کردار پر اس قدر تھوکا ہے کہ شخصیتیں مسخ ہوئی ہیں اور کئی کردار شہر خاموشاں میں جا سوئے ہیں۔ مگر اس کے باوجود ہماری تھوک کم نہیں ہوئی۔ ہمیں آزادی ہے ہم جب چاہیں اور جس جگہ چاہیں اور جس پر چاہیں تھوک دیں اس کے لئے ممکن ہے قانون ہو یا کوئی سزا بھی مقرر ہو مگر قانون تو اس لئے بنائے جاتے ہیں کہ انہیں توڑا جائے (ایک ذمہ دار شہری سے ایسی توقع نہیں) اور پھر بڑے فخر سے کہا جائے کہ قانون ہمارے سامنے بے بس ہے۔ سنا ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں اگر کوئی شخص ادھر ادھر مقررہ جگہ سے ہٹ کر تھوک دے تو اسے سزا ملتی ہے۔ تھوکے ہوئے کو چاٹنے کی سزا تو نہیں دیتے البتہ احساس دلا دیتے ہیں کہ ہر جگہ اور ہر وقت تھوکنا کوئی اچھا شغل نہیں۔ صحت مند معاشرہ ان عوارض سے بچتا ہے مگر ہمارے ہاں کچھ بلاوجہ آزادیاں میسر ہیں اور جن پر Chack And Balance نہیں مثلاً یہاں پارکنگ منع ہے ان بورڈز کے نیچے آپ کو ایک گاڑی اور اسے دیکھتے ہوئے اور کئی گاڑیاں کھڑی ہو جائیں گی۔ ''یہاں سگریٹ پینا منع ہے'' لیکن ایک ذمہ دار شخص مزے سے کش لگا رہا ہوتا ہے۔ آپ اس کا کیا بگاڑ لیں گے۔ سڑک پر جاتے ہوئے آپ کو ٹریفک کا ایک نشان دیکھنے کو ملے گا جو ہسپتال کا اشارہ دے رہا ہوگا یہاں اونچی آواز میں ہارن بجانا منع ہے مگر رکشا، ٹیکسی اور گاڑیوں والے جس طرح پریشر ہارن کا استعمال کرتے ہیں اور جس اونچی آواز میں آپ کو پنجابی کے بھڑکیلے گانے سناتے ہیں دل کے مریض بھی جھومنا اٹھتے ہیں اور داد دیتے ہیں کہ ہمارے معاشرے کی اقدار کی رفتار کتنی تیز ہے حالانکہ ہسپتال ہمارے لئے ترجیحات کی پہلی شرط ہے جسے آواز سے دور اور گرد و غبار سے بچانا پڑتا ہے تاکہ مریض جلد صحت یاب ہوں اور ایک تندرست معاشرہ پروان چڑھ سکے۔ اگر ہسپتال میں جگہ جگہ تھوکنا شروع کر دیا جائے تو پھر جو جراثیم پھیلیں گے اور ان سے جو بیماریاں پیدا ہوں گی وہ اس آزادی کو بھی ہڑپ کر جائیں گی۔ جو آزادی ہم یہ جگہ تھوکتے ہوئے محسوس کرتے ہیں اگر ہم نے یہ آزادی اس دھڑلے سے استعمال کرنی ہے تو پھر ایسے بورڈ لگانے کی کیا ضرورت ہے کہ یہاں تھوکنا منع ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

پگڑی

کچہری چوک میں عموماً ٹریفک والے ایسے موٹر سائیکلوں اور ایسی گاڑیوں کو روک لیتے ہیں جن کے ڈرائیور دیہاتی ہوں یا چھوٹے بچے ہوں ٹریفک والوں کے خیال کے مطابق ان کے پاس گاڑی کے کاغذات مکمل نہیں ہوتے یا ڈرائیور کے پاس لائسنس نہیں ہوتا۔

ایک دن ایسا ہی ہجوم اسی چوک میں دیکھنے کو ملا۔ ٹریفک والوں نے ایک موٹر سائیکل کے بابا جی کو روک رکھا تھا۔ بابا جی چالان کٹوانے کے حق میں نہیں تھے اور ٹریفک کا عملہ بابا جی کو چھوڑنے کو تیار نہیں تھا تکرار بڑھتی گئی اور ہجوم اکٹھا ہوتا گیا۔

اتفاق سے ہمارا بھی وہاں سے گزر ہوا میں نے پولیس کے عملہ سے پوچھا کہ بھائی! اس بابا جی کا کیا قصور ہے اس نے اشارہ کی خلاف ورزی کی ہے یا کاغذات مکمل نہیں۔

ٹریفک کے عملہ کا جواب تھا بابا جی جو کہہ رہے ہیں وہ ہمیں سمجھ نہیں آرہا وہ کہتے ہیں کہ میرا چالان اس لئے کر رہے ہو کہ میں نے پگڑی باندھی ہوئی ہے میری گاڑی کو اس لئے روکا ہے کہ میں دیہاتی ہوں اور اس سارے مجمع میں واحد پگڑی بردار ہوں۔

میں نے کہا وہ ٹھیک کہتے ہیں یہی وہ عظیم انسان ہے جس کی ہمیں صدیوں سے تلاش تھی ہمارے فکری اثاثے کا امین یہی شخص ہے جس نے فرنگی کی آج سے ڈیڑھ سو سالہ ثقافتی یلغار کو مسترد کرتے ہوئے اپنی پگڑی، اپنی فضیلت اور اپنی دستار کو محفوظ رکھا ہے۔

اس عظیم انسان کو مکمل "پروٹوکول" ملنا چاہئے جہاں سے گزرے ٹریفک کا عملہ سلام کرے۔ یہ پگڑی ہماری سچائیوں اور اچھائیوں کی علامت ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ ٹریفک کے عملہ کو میری بات سمجھ میں آگئی انہوں نے بابا جی سے معذرت کی اور اسے وہ سلیوٹ پیش کیا جو جنگِ آزادی سے آئے ہوئے غازی کو قوم پیش کرتی ہے۔

مجمع کی طرف سے ٹریفک پولیس زندہ باد کا نعرہ گونجا اور ہجوم منتشر ہو گیا۔ لیکن بابا جی کی شخصیت اور اس کی باتیں کئی سوال پیدا کر گئیں اور کئی الجھنیں ذہن میں ابھر گئیں۔

پگڑی کیا ہے؟ کہاں سے آئی اور کس حال کو پہنچ گئی کبھی یہ پگڑی غازیان اسلام کی فتوحات کا طرۂ امتیاز تھی۔

برصغیر کے حکمران مسلمانوں اولیائے عظام، صوفیائے کرام اور علمائے دین کی

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

وجاہتوں کا نشان تھی۔

انگریز بہادر نے جہاں ہمارے قلعے مسمار کئے ہماری فصیلیں برباد کیں وہاں ہماری ثقافت کو اور ہماری معاشرتی قدروں کو اس طرح روندا کہ عظمتوں کے سارے نشان تحلیل ہو گئے۔

فرنگی تہذیب اور مغرب کے کلچر کی نقالی ہمارے لئے اعزاز بن گئی اور اصل تہذیب جو انسانیت کی سچی روایات اور اصولوں کی اور تاروں سے جڑی ہوئی تھی وہ تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر گئی۔

ہمارے برصغیر پاک و ہند کے حکمران جس پگڑی کو اپنی آن سمجھتے تھے وہ پگڑی انگریز نے اپنے دربان کو پہنا دی۔ اپنے خانساماں کو تھما دی۔ اپنے دفتری اور اردلی کو وہ لباس دیا جو مغلیہ سلطنت کے شہزادوں کا کبھی ہوتا تھا اصول تو یہ تھا کہ ۱۴ اگست کی صبح سے ہمارے پرانے انداز بدل جاتے ہیں ہمارے دفتروں میں پگڑی ہمارے وقار کی علامت بنتی اور "صاحب" سر پر پگڑی کا تاج سجاتا مگر ایسا نہ ہوا۔

ہم نے اپنی شناخت کا یہ عمل نہ اپنایا بلکہ دفتر کے لئے "جناح کیپ" جو ہمارے بڑے افسران کے لئے ضروری تھی ان افسران نے نہایت دانشمندی سے اپنا نائب قاصد اپنے چپڑاسی اور اپنے بستہ بردار کو پہنا دی اور خود اس تہذیب کو سینے سے لگائے رکھا جو ایک بیورو کریٹ کے شایان شان ہو سکتی ہے۔

سر پر پگڑی، شلوار قمیض سے کیا کوئی بڑا افسر بن سکتا ہے! کیا وہ عوام جیسا نہیں ہو جاتا کا پھر فرق کیا ہوا۔

افسر اور عوام میں بہر حال ایک Distance ہونا چاہئے ورنہ موثر انتظامی صلاحیت پیدا نہیں ہو سکتی لیکن ایسے گورنر بھی تو تاریخ میں ہو گزرے ہیں جن کے سروں پر پگڑی، شلوار قمیض پہنی ہوتی تھی اور ان کی دہشت کا یہ عالم تھا کہ بلوچستان سے لے کر سرحد تک کسی دکاندار کو نرخ بڑھانے کی جرأت نہ تھی۔

جو نواب کالا باغ تھے تو آج کالا باغ ڈیم کیوں نہیں بنتا اس کی وجہ یہ ہے کہ سر پر پگڑی کا فقدان ہے۔

ہمیں ہر چوک میں ایسے بابے چاہئیں جو ذہنوں سے فرنگی کی پھیلائی ہوئی جہالت کو دور کر سکیں اور ان جھوٹی قدروں سے نجات دلا سکیں جو ہمیں اندر ہی اندر سے ٹوٹ پھوٹ کا

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

شکار کر رہی ہیں ہمیں باطنی سکون اور طمانیت قلب سے محروم کر رہی ہیں۔

پگڑی اگر کسی کے گھر جاتی تو بات رشتے ناطوں تک پہنچ جاتی، پگڑی اگر کسی کے قدموں میں رکھ دیتے تو مقتول کے وارثین قتل جیسے بھیانک جرم کو معاف کر دیتے اور کہتے کہ فلاں بزرگ نے اپنی پگڑی ہمارے قدموں میں رکھ دی اور اب کوئی چارہ نہیں رہا۔

پگڑی بدل دوستیاں زمانے بھر میں مشہور تھی لوگ فخر سے ایسی دوستوں کی مثالیں دیتے اب دوستی کی بنیاد کیا ہو۔ کنگا جو اکثر جیب میں رہتا ہے "چین" جو گلے میں لٹکتی رہتی ہے اسے کیسے بدلا جائے۔

جناح کیپ جو ہم نے چپڑاسی کو پہنا دی ہے۔ "صاحب" ننگے سر دفتر آتے ہیں اور بے چارہ جناح کیپ کی شان دکھاتے ہوئے بستہ ہاتھ لئے ہوئے چپڑاسی داخل ہوتا ہے۔

جی چاہتا ہے کہ اسے سلیوٹ مارا جائے اس کے سر پر شان سے ٹکی ہوئی جناح کیپ کو پیار کیا جائے کہ وہ میرے قائد حضرت قائداعظم محمد علی جناح ؒ کی عظمتوں اور رفعتوں کی علامت ہے اور صاحب کی طرف نظریں پھیر لی جائیں کہ وہ ہمارے کلچر کی نمائندگی نہیں کر رہا۔

اکثر افسران کو گلہ ہے کہ اب عوام ان کا احترام نہیں کرتے اگر افسران عوام میں آ جائیں تو عوام انہیں سروں پر بٹھائیں گے۔

عوام افسر کے سر پگڑی دیکھنا چاہتے ہیں اور جناح کیپ کو دفتری امور نپٹاتے ہوئے سر پر جلوہ افروز دیکھنے کے آرزومند ہیں۔

دیکھیں! پگڑی کب ہمارے گھروں میں اور جناح کیپ کب دفتروں میں نظر آتی ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

جون کا مہینہ - فیلڈ سٹاف کا پسینہ

سرکار انگلشیہ کی برکات پر ہم نے کئی مضامین لکھے شوق سے نہیں بلکہ وہ ہمارے نصاب تعلیم میں شامل تھے کہ انگریز بہادر نے ہمیں اور ہمارے نظام کو کیسے بدلا ہے۔ ہر چیز بالا کر رکھ دی ہے۔ ہم عربی فارسی کے سکالر تھے۔ انگریزی کو سرکاری زبان بنا کر ہمیں اس نے ان پڑھ بنا دیا ہے۔ ہمارے مالی و انتظامی معاملات کو بھی اپنے ماحول اور موسم کے ایسے تابع کیا ہے کہ اتنے سال گزرنے کے باوجود ہم نے کبھی سوچا ہی نہیں کہ یہ نظام ہمارے معاشرے مزاج سے مطابقت رکھتے ہیں یا نہیں۔ انگلستان میں مئی اور جون کے مہینے موسم بہار کے ہوتے ہیں۔ اسی لئے ان کے مالی سال کا خاتمہ جون میں ہوتا ہے اور نئے مالی سال کا آغاز جولائی سے۔ ہم نے بھی اس کی تقلید کی جاری رکھا ہوا ہے حالانکہ موسم جون ہمارے ہاں سخت ترین گرمی کے دنوں پر محیط ہے۔

آیا مئی جون کا مہینہ
لایا چوٹی سے ایڑی تک پسینہ

لیکن اس کے باوجود ہمارے بجٹ اسی مہینہ میں تیار ہوتے ہیں۔ تمام مالی و انتظامی اصلاحات اسی مہینہ میں مکمل ہوتی ہیں۔ ہمارا مالی سال جون کے اختتام اور جولائی کے آغاز سے ترتیب پاتا ہے اور کیلنڈر سال جنوری سے دسمبر تک محدود ہے۔ کیلنڈر سال سے ہمارے اوقات کار رہتے ہیں یعنی ہم دو نظاموں اور دو سالوں کی تقسیم میں بٹے ہوئے ہیں۔ انہیں یکجا کرنے میں ممکن ہے کوئی الجھن پیدا ہو لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سی ہماری حکمت عملی ہے کہ ہم نے جو کام مہینہ کے اختتام پر کرنا ہوتا ہے یا جون کے مہینہ میں مکمل کرنا ہے مثلاً بجلی، گیس، پانی کا بل ہم نے مہینہ کے اختتام پر ادا کرنا ہوتا ہے یعنی ۲۹، ۳۰، ۳۱ تاریخیں مقرر ہوتی ہیں اور پھر جرمانے کے ساتھ ادا کریں ورنہ بجلی، گیس، پانی کے کنکشن کاٹ دیئے جائیں گے اور ٹیلی فون کا بھی یہی حال ہے بلکہ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ اگر آپ نے بل ادا نہ کیا تو ٹیلی فون بھی کٹ جائے گا اور نادہندگان کی صورت میں نہ ابھی ملے گی۔ بل جیسا ہے ایک بار ادا کریں پھر اس کے بارے میں درخواستیں لکھواتے پھریں۔ داد فریاد کریں اگر تو

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

محکمہ کو رحم آگیا تو آپ کا بل درست ہو جائے گا وگرنہ Found Correct کا جواب آپ کو گھر کے اڈریس پر مل جائے گا۔ ہم نے بلوں کی ادائیگی کے لئے ایسے یک طرفہ نظام کیوں رائج کر رکھے ہیں کہنے کو تو ہم انہیں Utility Bills کہتے ہیں یوٹیلٹی سروس کا نام دیتے ہیں لیکن جس طرح وصول کرتے ہیں عوام کی چیخیں نکلوا دیتے ہیں۔ ہم سرکاری ملازم کے پاس مہینہ کی آخری تاریخوں میں وضعداری کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ جیب بھی تنگ ہوتی ہے اور ہاتھ بھی۔ ان دنوں میں بل کو تھامنا اور جیب سے کچھ نکالنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے اور اوپر سے حکم یہ ہوتا ہے کہ بل ادا کر دو ورنہ کنکشن کاٹ دیا جائے گا۔ ان حالات میں کس طرح یہ بل ادا ہوتے ہیں اس کا اندازہ وہ محکمہ نہیں کر سکتے جن محکموں کو سرکاری طور پر بجلی، گیس، پانی کی سہولت ہے۔ اس لئے کہ وہ اس محکمہ کے ملازم ہیں اور اتنے یونٹ کے مستحق ہو۔ یونٹ اتنی احتیاط سے شمار کئے جاتے ہیں کہ اس ادارے میں فٹ ہو جاتے ہیں جس دائرے کا ملازم ہوتا ہے نہ کچھ دینا پڑتا ہے اور نہ کچھ لینا پڑتا ہے بلکہ شیکسپیئر کی زبان میں نہ ادھار لو اور نہ ادھار دو، زندگی کا ماٹو بنا لو۔ اگر یہ بل مہینے کے شروع میں مل جائیں اور پہلے ہفتے میں ادا کر دیئے جائیں تو اس میں محکمہ خزانہ اور جناب میاں سرتاج عزیز صاحب کیا فرماتے ہیں۔ اس میں کوئی قباحت ہے۔ ہر اس قباحت پر قابو پایا جا سکتا ہے جو عوام کی فلاح و رفاہ کے راستے میں رکاوٹ ہو اور صارفین کی فلاح کے لئے اور کون سوچے گا۔

تمہیں نے درد دیا تمہیں دوا دینا

ہر ملازم کے پاس یکم تاریخ کو تاریخ موجود ہوتی ہے اور یہ بل آسانی سے ادا ہو سکتے ہیں انہیں مہینہ کے اختتام پر لے جانا ایسے ہی ہے جیسے خود بھی پریشان ہو اور مجھے بھی پریشان کر۔ بات جون کے مہنہ کے بارے میں ہو رہی تھی جون بڑا ظالم ہے جو فیلڈ سٹاف پر گزرتی ہے وہ بیچارے کس کو سنائیں اگر سنائیں تو جان سے اور نوکری سے جائیں۔ جون کی گرمی اور ٹارگٹ کا دباؤ انہیں کانے یرکان کا مریض بنا دیتا ہے۔ ایئر کنڈیشنڈ دفتر میں بیٹھنے والے افسران اور ارباب اختیار کو کیا معلوم کہ فیلڈ سٹاف جس میں ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن کا عملہ بھی شامل ہے بنک کے مینیجر اور ریکوری ٹیمیں کس طرح آندھی، طوفان، گرمی اور دھوپ میں سائیکلوں پر، موٹر سائیکلوں پر رواں دواں ایک گھر سے دوسرے گھر تک معمولی معمولی رقمیں وصول کرتے ہیں اور محکمہ کو جون کے مہینہ میں اپنا ٹارگٹ مکمل کر کے دیتے ہیں یہ ٹارگٹ مارچ میں کیوں

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

نہیں ہو سکتا۔ اس "مینوئل" میں اور کس مالی کتاب میں لکھا ہے کہ ٹارگٹ صرف اور صرف جون ہی میں مکمل کئے جائیں۔ بیشک فیلڈ سٹاف کی جان نکل جائے پھر جون کے مہینہ میں آخری وقت تک بنک کھلے رہتے ہیں اور عملہ انتظار کرتا ہے کہ کوئی ٹیکس جمع کرانے آئے۔ تو ہم اس کے حساب کو بے باق کریں آخری دن۔ آخری وقت عملہ کا بنک کا نظام کس ایمرجنسی کی علامت ہے۔ اسے سہل کیوں نہیں بنایا جا سکتا۔ کیا ٹیکس وصول کرنے اور عوام پر دباؤ ڈالنے کے اور طریقے نہیں ہو سکتے جو آسانی اور بہتری سے سرانجام پا جائیں۔ ضروری ہے کہ انہیں اس طرح ہراساں کرے اور ان کے اعصاب پر سوار ہو کر ہم کام کریں۔ اب ہم ایک ایسی فلاحی مملکت کے شہری ہیں اور ہمارے ارباب اختیار بھی فلاحی مملکت کے تحت نظام کو بہتر بنانے کی مساعی کر رہے ہیں۔ ہمیں اپنی خامیوں اور کوتاہیوں پر ایک نظر ڈال کر آئندہ کے لئے بہتر حکمت عملی اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ واجبات وصول کرنے والے محکمے بلاشبہ ہماری معیشت کی بہتری چاہتے ہیں۔ اور اپنے اہداف پورا کرنا چاہتے ہیں لیکن ایک چیز جو سارے اہداف پر بھاری ہے وہ ہے انسانی طرز سلوک وہ اذیتیں اور تکلیفیں ذہن میں رہنی چاہئیں جو عوام کو ان محکموں سے ہیں۔ اور خود ان محکموں کے فیلڈ سٹاف کو ہیں اگر محکمہ فیلڈ سٹاف اور صارفین مل کر نظام کی اصلاح کر لیں تو جون ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ورنہ یہاں چوٹی سے ایڑی تک پسینہ۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ملتان اپنی پہچان مانگتا ہے

ملتان مواصلاتی، جغرافیائی اور تاریخی اعتبار سے ایک ایسی شاہراہ پر واقع ہے جہاں سے تہذیب و تمدن، علم و دانش کے ان گنت قافلے گزرے ہیں۔ ملتان نے کوئی ایک صدی نہیں دیکھی بلکہ ساڑھے پانچ ہزار کے ماہ و سال اس کی نظروں میں ہیں۔ اس نے کسی ایک حملہ آور کو نہیں بلکہ سکندرِ اعظم سے لے کر نہ جانے کتنے حملہ آور اس شہر کی قدامتوں سے ٹکرانے کی کوشش کرتے رہے ہیں، مگر اس شہر نے حریت اور جرأت کی ایسی داستانیں رقم کی ہیں کہ حملہ آور اس شہر کو اپنا شہر نہ بنا سکے البتہ یہ شہر جب بھی فتح ہوا محبت سے ہوا، محمد بن قاسم نے اپنی محبت اور خلوص سے اس شہر کو ایسا فتح کیا کہ یہ شہر وضعداریوں اور محبتوں کا مرکز بن گیا۔ یہ اس نوجوان کی خوبیاں تھیں یا اس پیغام کی اثر آفرینی تھی جو وہ اسلامی اقدار کی صورت میں لایا تھا، اور اس شہر کو اس مٹھاس اور شیرینی سے متعارف کرایا جس کی ظاہری شکلیں کھجور، انار، کنو اور آم کی صورت میں آج بھی موجود ہیں اور ترقی کی یہ کپاس، گندم، چاول، پھل اور سبزیوں کی وافر مقدار کی صورت میں ایکسپورٹ کے تمام وسائل کی حامل ہیں۔ ملتان محبتوں کا شہر، وضعداریوں کا گھر، آنے والے مہمان کا خوبصورت میزبان، تحفے تحائف کی روایتوں کا امین، سوہن حلوہ، تیل دھنیاں، مہندی اور دستکاریوں کا انمول شہر ہے۔ اہلِ ہنر کا حسن و جمال، مصوری، خطاطی اور مٹی سے مختلف نقش تیار کرنے والا شہر اور "ملتانی مٹی" جو رعنائی اور لطافت کی صلاحیتوں کی مٹی ہے وسعتوں اور رفعتوں کی امین ہے۔ یہ محبت اور الفت میں کسی سے کم نہیں ہے۔ کوئی ہزار گلے شکوے کرے اس کی قدر پر، اس کی تاریخ پر، اس کے کلچر پر مگر بالآخر اسے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ملتان اپنی پہچان میں منفرد ہے۔ یہ عجز و انکساری والوں کا شہر ہے۔ اس نے روحانیت کے سہ چشموں سے انسان دوستی کا پانی پیا ہے۔

فریدا ایسا ہور ہیو جیسا گھ میت
پیراں بیٹھ ہٹاریئے اوہ کدی نہ چھوڑے پریت

ملتان صدیوں کے حملوں، زیادتیوں اور ظلم و ستم کے باوجود زندہ شہر ہے۔ لیل و نہار کے بدلتے تیوروں میں اس نے اپنی شناخت کو قائم رکھا ہے۔ اپنی تاریخ کو مسخ نہیں ہونے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

دیا۔ اسے جاننا ہے کہ یہ اللہ والوں کا شہر ہے۔ ان لوگوں کا شہر ہے جنہوں نے ملتان کو اسلام کی پہچان دی، پرپد دیوری کلچر سے نجات دی، سورج کنڈ جو اور بدھ مت کی جگہ اسے غوث کی نگری، حضرت شاہ شمس کا روحانی وقار اور حضرت شاہ یوسف گردیز کی پاکیزہ اقدار کا نکھار بخشا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب ملتان وہ نہیں جو کبھی ملوہی قوم کا ملتان تھا، اب یہ مدینۃ اولیاء ہے، علم و دانش کا گہوارہ ہے۔ دانش کدوں کا مرکز ہے۔ تعلیم و تدریس کو وقیع نام ہے۔ زراعت، صنعت اور تجارت کی اہمیت کا خطہ ہے۔ اس کی آبادی بیس لاکھ سے تجاوز کر رہی ہے۔ جب ۱۹۴۷ء میں پاکستان قائم ہوا اس کی آبادی تقریباً پانچ لاکھ انسانوں پر مشتمل تھی گذشتہ پچاس سالوں میں اس کی آبادی میں اضافہ اور شہری وسعت پر پھیلاؤ بڑھا ہے لیکن اس شہر کو گذشتہ سالوں میں کیا تمدنی سہولتیں ملی ہیں، آبادی کی نسبت سے اسے کتنی نئی سڑکیں، نئی سیں، نئے ہسپتال ملے ہیں۔ پانی کی فراہمی، شہر کی صفائی اور تفریح کی کتنی سہولتیں ملی ہیں، تفریح کا یہ حال ہے کہ کئی باغ اس شہر میں ایسے گم ہوئے ہیں کہ مورخ حیران ہے کہ انہیں تاریخ کے اوراق سے نکال کر شہادت اور ثبوت پر کیسے لائے، باغ لنگے خان، کبھی معلوم یہ کہاں تھا۔ اور اب کہاں ہے یہ کبھی عظیم خطیبوں، سیاستدانوں اور علم و ادب کے عظیم انسانوں کی خصوصیت کا مرکز تھا، اب یہاں چڑیاں بھی ہم کلام ہوں تو عجیب سا لگتا ہے۔ حضوری باغ، باغ عام و خاص اور قلعہ کہنہ کے باغات خشک گھاس اور ویرانی و پریشانی روشوں کا نام رہ گئے ہیں اگر کہیں ذرا سی بھی گھاس ہے تو ماش کے رسیاؤں نے تن سازی کا ایسا مظاہرہ کیا ہے کہ ان کے بھاری بھرکم جسم کی وجہ سے گھاس باہر نہیں نکلتی کہ کہیں پہلوان کے قدموں میں دم نہ توڑ دیں۔ ملتان درختوں سے بھی محروم ہو گیا ہے اس کی کوئی ایسی سڑک نہیں جہاں سے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا میسر آئے۔ آکسیجن کے یہ سارے ٹینٹ اٹھ گئے ہیں۔ شہر میں آلودگی کے خلاف کبھی کبھی "واک" ہو جاتی ہے لیکن واک والوں کا جو حشر ہوتا ہے وہ جو گرد و غبار ان کے اچھے لباس پر پڑتی ہے، وہ آئندہ کے لئے توبہ کر لیتے ہیں کہ اور انگریزی کا وہ محاورہ یاد کرتے ہیں جس کا اردو ترجمہ "الٹے بانس بریلی کو" 'To Carry the Dust to Multan' ۔

ملتان میں میونسپل کارپوریشن موجود ہے جس کا وجود کا اگرچہ پتہ نہیں چلتا، کیونکہ کارپوریشن کسی بھی شہر کی ثقافت اور کلچر کی نمائندہ ہوتی ہے۔ مگر ملتان کارپوریشن کے وجود کا اس وقت پتہ نہیں چلتا ہے کہ جب کسی چونگی پر ہونے والی بدعنوانی کی خبر چھپتی ہے، یا کسی فراڈ

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کا کھوج لگتا ہے۔ وگرنہ کارپوریشن کو شہر اور شہر کو کارپوریشن کا کوئی علم نہیں، نہ کبھی اس کی تعریف ہوتی ہے اور نہ اس نے صفائی اور فراہمی آب میں دلچسپی لی ہے البتہ ایک اچھی گاڑی کارپوریشن کے پاس موجود ہے جس میں اس کا بڑا حاکم بیٹھا ہوا ایسے نظر آتا ہے کہ جیسے والئ ملتان ہو، اور ہم خوش ہو جاتے ہیں کہ ہم اپنی مہربان حاکموں کے درمیان سعادت مند رعایا کے طرح زندگی گزار رہے ہیں۔ حاکم بھی خوش ہیں اور رعایا بھی، شہر میں ایم-ڈی-اے بھی موجود ہے جو نئی کالونیوں، سڑکوں اور پارکوں کی تعمیر و زیبائش کے لئے وجود میں آئی تھی، اس ادارے نے سب سے پہلے اپنی کالونی بنائی تاکہ ہر خاص و عام کو علم ہو جائے کہ یہاں ایم-ڈی-اے، جیسا ادارہ موجود ہے، پر اس ادارے پر زوال کے ایسے دن آئے کہ ابھی تک یہ اس انحطاط سے باہر نہیں نکل سکا، اگرچہ اس کے سربراہوں نے اس کا امیج بہتر بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی لیکن اب یہ ادارہ یونین کی سرگرمیوں تک محدود ہو گیا ہے، جو کبھی تنخواہ کے لئے اور کبھی اپنی بقاء کے لئے سرگرمِ عمل رہتی ہے۔ اب حالیہ بجٹ ۹۸-۱۹۹۷ء میں اس ادارے کو خطیر گرانٹ ملنے کا امکان ہے۔ انشاء اللہ امید کی جاتی ہے کہ اس ادارے کے پھر دن بدل جائیں گے۔ پھر شہر میں کالونیاں، راستے، تفریح مقام تعیر ہوں گے۔ پھر کوئی اسی سڑک تعمیر ہو گی جس کے گرد درخت، سبزہ اور خوبصورت ماحول ہو گا۔ سڑک بھی کوشادہ ہو گی، اگر ایم-ڈی-اے کے کرم فرما کسی نہر کو بھی اس سڑک کے ساتھ وابستہ کر لیں بے شک قاسم بیلا کی شجاع آباد نہر، ایسے خوبصورت ماحول کی رفاقت کے لئے تیار ہو جائے تو ملتان کے نوجوان کا گلہ جاتا رہے گا کہ ملتان میں تفریح کی سہولتوں کا فقدان ہے۔ ویسے تو یہاں کے نوجوانوں کو ون ڈے انٹرنیشنل کرکٹ میچ کا بھی گلہ ہے ہزار التجائیں کرنے کے باوجود ایسے میچ کا انتظام نہیں ہوتا، کبھی پورا چندہ اکٹھا نہیں ہوتا اور کبھی گراؤنڈ کی گھاس درست نہیں ہوتی، بہر حال میچ کا نہ ہونا یہاں کے نوجوانوں کو کرکٹ کے ابھرتے ہوئے مستقبل سے مایوس کرتا ہے۔ کبھی جب ہم بچے ہوا کرتے تھے تو ہمارے بزرگ بتایا کرتے تھے کہ وہاڑی روڈ پر ایک سپورٹس گراؤنڈ تعمیر ہو رہا ہے شاید وہ مکمل ہو چکا ہو گا لیکن ہماری لاعلمی کی انتہا ہے کہ ہمیں آج تک پتہ نہیں چل سکا ملتان آرٹس کونسل پر شکوہ عمارت کی صورت میں تعمیر ہو چکی ہے، نامور مصور فرح رحمان کی نادر، خوبصورت پینٹنگ کی نمائش بھی ہو چکی ہے مگر یہ عمارت کیا مکمل ہو چکی ہے اور اس کے اندر جانے کے لئے کون سا صحیح راستہ ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

جوبال کے اندر لے جاتا ہے۔ اس کا تعین ابھی باقی ہے، پر اسرار راستوں کی یہ عکاس عمارت اپنے مرکزی صدر دروازے کی تلاش میں ہے اس کا افتتاح کون کرے گا اور کون اسے ملتان آرٹس کونسل کی صورت میں ملتان کی ثقافت کا ترجمان بنائے نظریں اس مسیحا اور اس رہنما کی طرف لگی ہیں۔ جوبالآخر یہ نوید سنائے گا کہ صاحبو، آرٹس کونسل کا یہ مرکزی دروازہ ہے، آیئے آپ کو "جشنِ ملتان" کی ان تقریبات میں لے جائیں جو ۱۹۶۶ء سے گم ہو گئی تھیں اور اب آرٹس کونسل ملتان نے انہیں دریافت کر لیا ہے۔ ہمارے دوست در محمد خان کو ہم سے گلہ ہے کہ ہم اپنے کالم میں آثار قدیمہ، آرکیالوجی کے بارے میں نہیں لکھتے، ملتان کی ان دفینوں سنگ و خشت کا ذکر نہیں کرتے جو آج بھی ملتان کے اردگرد موجود ہیں، جلیل پور ہو یا ہڑپہ، قلعہ کہنہ ہو یا خضری پور کا وہ پرانا راستہ جو کبھی ملتان سے لاہور اور لاہور سے دہلی تک کی رہنمائی کرتا تھا، ہمارے دوست کا مطالبہ ہے کہ ملتان میں میوزیم کی شدید ضرورت ہے میں اپنے دوست کو کیسے بتاؤں کہ یہاں ٹیلی ویژن سنٹر کی بھی شدید ضرورت ہے۔ ہمارے ایک انتہائی محترم دوست اور شجاع آباد کے مرکزی رہنما سید جاوید علی شاہ ایم این اے کبھی کبھی ٹیلی ویژن کے قیام کی خوشخبری سناتے ہیں اور ہم بھی خوش ہو جاتے ہیں کہ ہمارا یہ نوجوان لیڈر جو وارث شاہ کی شعر کی لطافتوں سے آگاہ ہے، کبھی نہ کبھی ہمیں ٹیلی ویژن سنٹر دلائے گا۔ دیکھئے کیا گزرے ہے، قطرہ پہ گہر ہونے تک بہر حال ابھی ملتان کو مزید پہچان کی ضرورت ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

مائی بھاگاں

اہلِ علم اور اہلِ ہنر کو اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے گلہ رہتا ہے کہ یہ ادارے ان کے کمالات، ایجادات کو مناسب جگہ نہیں دیتے ان کی عملی اور فکری کاوشوں کو اپنے اخبارات میں اس طرح نہیں اجاگر کرتے جس طرح فلم، ٹی وی اور شوبز سے وابستہ آرٹسٹوں کو روزانہ جگہ دیتے ہیں۔ ان پر دستاویزی فلم بناتے ہیں اور ان کی معمولی معمولی باتوں کو اس طرح اونچا کرتے ہیں جیسے یہی معاشرہ کے لئے اور قوم کے لئے رہ گئے ہیں۔ ذرائع ابلاغ کے یہ ادارے عموماً یہی جواب دیتے ہیں کہ ہمیں اپنے قارئین کرام، اپنے ناظرین اور سامعین کے لئے تفریح مہیا کرنی ہوتی ہے اس لئے ان فنکاروں کو اہمیت دینا ضروری ہے۔ عوام تفریح چاہتے ہیں اور ذرائع ابلاغ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ تفریح کو زیادہ وقت دے۔ اگر ذرائع ابلاغ کا کردار تفریح، تعلیم اور اطلاعات اور ایڈورٹائزنگ کی خدمات سرانجام دینا ہے پھر تعلیم، انفارمیشن اور ایڈورٹائزنگ کو چھوڑ کر صرف Entertainment کے لئے وقف ہو جانا کون سی ترجیح ہے۔ معاشرے میں ان گنت کردار ایسے بھی ہیں جن کے انٹرویو، جن کے فیچر، دستاویزی فلم اور کالم چھپنے چاہئیں مگر اس طرف کس کی نگاہ جائے گی۔

پچھلے دنوں لاہور جانے کا اتفاق ہوا جس دوست کے ہاں قیام تھا انہوں نے ایک صائب مشورہ دیا کہ ایک ایسی شخصیت بھی ہے جس کا انٹرویو ہونا چاہئے۔ میں نے ان سے پوچھا وہ کون ہے؟ کوئی صاحبِ علم، کوئی سیاستدان، کوئی بڑا انتظامی آفیسر یا کسی کلیدی منصب پر فائز شخصیت، کوئی صنعت کار، کوئی بہت بڑا جاگیر دار میرے دوست کا جواب تھا کوئی ایسی شخصیت نہیں مگر اس کے باوجود وہ اپنی ذات میں ایک اعظم و ہمت کی شخصیت ضرور ہے۔ ہمیں اشتیاق ہوا کہ چلو اس شخصیت سے مل لیتے ہیں اور ہم اپنے دوست کے ہمراہ چل پڑے۔ ایک آدھ فرلانگ پر ہمارے دوست ہمیں ایک تنور پر لے گئے۔ کے ایف سی (KFC) اور ہانگ کانگ جیسے ہوٹلوں پر عوام کا رش تو سمجھ میں آتا ہے کہ یہ جدید کھانوں اور Status کا رعب جمانے والے ہوٹل ہیں مگر ایک عام دیسی تنور پر عوام کے ہجوم کو دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور وہاں اس منظر کو دیکھنے کی دلچسپی بھی۔ پروفیسر محمد افضل خان نے بتایا کہ وحدت کالونی کے سارے مرد و زن اس تنور پر ضرور آتے ہیں۔ بعض بڑے بڑے سیکشن آفیسر

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

اسی تنور کی روٹیاں کھا کر ڈپٹی سیکرٹری کے منصب تک جا پہنچے ہیں۔ اس تنور کی روٹی اور دال میں نہ جانے کیا تاثیر ہے جو ایک دفعہ کھالے پھر جدید ہوٹلوں کا رُخ نہیں کرتا۔ یہ تنور سستا بھی ہے اور معیاری کھانوں کا مرکز بھی جو روٹی تنور کے ٹمپریچر پر پکے تھی اس میں کسی قسم کی کثافت باقی نہیں رہے گی۔ اس تنور کی مالکہ مائی بھاگاں گذشتہ ۲۵ سال سے وحدت کالونی لاہور کے آخری سٹاپ سے پائلٹ سکول کو جانے والی سڑک کے چوک میں تنور پر اپنی خدمات سر انجام دے رہی ہے۔ اس کے کرم فرماؤں کی تعداد وحدت کالونی، امید کالونی اور پاک کالونی تک پھیلی ہوئی ہے اس کے تنور کی دال اور روٹی اپنی لذت میں منفرد ہوتی ہے۔ میں نے اس سارے پسِ منظر کو سامنے رکھتے ہوئے مائی بھاگاں سے پہلا سوال کیا کہ آپ کب سے اس تنور کو چلا رہی ہیں "مجھے تقریباً تیس سال ہو گئے ہیں"

اتنی گرمی میں اور اس موسم کی حدت میں روزانہ تنور پر روٹیاں لگانا کیسے لگتا ہے۔ مائی بھاگاں نے اپنے پروفیشن کے وقار پر پورا اعتماد کرتے ہوئے جواب دیا "کہ جب تنور پر بیٹھ جاتی ہوں مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے میں کسی اعوان اقتدار میں پہنچ گئی ہوں، میرے اختیارات کسی صدر، وزیر سے کم نہیں ہوتے۔ جب کوئی پانچ چھ روٹیاں مانگتا ہے دال کی خواہش کرتا ہے تو میں انہیں میرٹ پر پہلے آئیے اور پہلے پائیے کی بنیاد پر روٹیاں دیتی ہوں۔ اگر کوئی جلدی کرے تو میں روٹیاں ہرگز نہیں دیتی میں نے کبھی کسی کو ترجیح نہیں دی۔ میرٹ پر روٹی اور دال بانٹتی ہوں اگر کوئی مداخلت کرے تو میں اسے پانے تنور سے انکار کر دیتی ہوں۔ میں تنور کی ایک مرحلہ کی چوتھائی پر واقع اپنی راجدھانی میں بالکل آزاد ہوں نا ہی مجھ پر عالمی بنک کا دباؤ ہے کہ میں اپنی روٹی کے اور دال کے نرخ بڑھا دوں اور نہ ہی اندرونی پریشر ہے کہ میں اپنے تنور میں کوئی تبدیلی کروں لیکن میں انصاف کرتی ہوں۔ روٹی کے وزن اور دال کی مقدار میں ڈنڈی نہیں مارتی اور نہ ہی راتوں رات امیر بننے کے خواب دیکھتی ہوں اور نہ کبھی اس لالچ میں پڑتی ہوں کہ ایک دفعہ اتنا ہاتھ ماروں کہ آئندہ میری تین پشتیں عیش کریں اور پھر بھی وسائل ختم نہ ہوں۔ میں نے پائی پائی جوڑ کر علامہ اقبال ٹاؤن میں ایک کوٹھی بنائی ہے اور اس کوٹھی ایک حصہ میں چھ دکانیں بنائی ہیں مجھے کرایہ کی صورت میں اتنے پیسے مل جاتے ہیں کہ میں بھی خوش ہوں اور میرا میاں بھی۔ وہ گورنمنٹ کالج وحدت روڈ پر گذشتہ کئی سالوں سے مالی کے طور پر کام کر رہا ہے۔ میں نے اپنے بیٹے کو پڑھا کر پولیس میں

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

بھرتی کرادیا ہے وہ اس وقت تھانہ میں بطور اے ایس آئی کام کر رہا ہے میں نے اس کی شادی کر دی ہے اور اب صرف چھوٹی بیٹی رہ گئی ہے جسے میں نے روٹیاں پکانے اور تنور سے وابستہ امور کو نبٹانے کی ساری مشق کرادی ہے جونہی کوئی اچھا لڑکا نظر آیا اسے ''زیور تنور'' سے آراستہ تربیت سے رخصت کر دوں گی۔''

میرے دوست محمد افضل خاں کا موقف تھا کہ یہ محنت کش، یہ پُر عظم خاتون اپنے خیالات میں اور عمل کیسے یکسوئی رکھتی ہے۔اس کی ذات میں کتنی قناعت ہے اور محنت کے ثمر پر کتنا یقین ہے یہ ڈیوٹی کو ڈیوٹی سمجھتی ہے کبھی چھٹی نہیں کرتی۔ دھوپ چھاؤں میں، موسموں کی حدت اور شدت میں تنور جلاتی ہے۔ کبھی کسی ہڑتال کسی جلوس میں نہیں جاتی۔ اسے بجٹ سے کوئی گلہ نہیں اسے صرف اپنی محنت اور رزق حلال کھانے سے دلچسپی ہے۔ اسے اخبار والوں سے کوئی توقع نہیں کہ وہ اس پر فیچر یا کالم چھاپیں۔ ٹی وی والے سے کوئی امید نہیں کہ وہ اس کی زندگی کو موضوع بنا کر کوئی دستاویزی فلم بنائیں۔ ریڈیو والوں سے بھی کوئی واسطہ نہیں کہ وہ ہوا کے دوش پر اس پر کون سا پروگرام نشر کرتے ہیں۔ مائی بھاگاں کی کائنات صرف اور صرف تنور ہے جس کی آگ تیز ہو جائے تو وہ پانی کا چھٹا دے دیتی ہے تاکہ آگ تیزی نہ پکڑے اور روٹی جلنے سے بچ جائے۔ تنور کب آگ پکڑتا ہے اور روٹی کب جلتی ہے اس کا علم کسی کتاب میں نہیں اور نہ ہی کسی لیبارٹری میں اس کا تجربہ سکھایا جاتا ہے اس کا صرف ایک ادارہ ہے اور وہ ہے مائی بھاگاں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

جمعۃ الوداع سے جمعۃ الوداع تک

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

وابستہ رہے اور اس کی پیروی کرتے رہے تو پھر کبھی تم گمراہ نہ ہو گے۔"

آخر میں وہ مرحلہ بھی آن پہنچا جب Vote of Thanks کا ہوتا ہے۔ آپ نے لوگوں سے پوچھا کہ تم قیامت کے دن میرے بارے میں کیا کہو گے کہ میں نے تمہیں اللہ کا پیغام دے دیا ہے یا نہیں۔ سب نے اس بات کی تصدیق کی کہ بالا شبہ آپ نے رہنمائی، تبلیغ، اصلاح کا کام مکمل کر لیا ہے۔ اس پر آپ نے اپنی انگشت شہادت آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے اور لوگوں کے مجمع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تین دفعہ فرمایا "اے اللہ تو گواہ رہ کہ میں نے تیرا پیام اور تیرے احکام تیرے بندوں تک پہنچا دیئے ہیں اور تیرے یہ بندے اقرار کر رہے ہیں۔"

اسلام کی چودہ صدیاں بیت گئیں اور پندرہویں صدی کے ۱۸ سال ہو گئی ہے۔ اسلام دنیا کے ہر کونے اور ہر خطہ میں پہنچ رہا ہے۔ افریقہ، یورپ، امریکہ، روس اور ان خطوں میں بھی جہاں پہلے کوئی بھی نہیں گیا۔ آج برطانیہ کے بڑے بڑے لارڈ اسلام کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ اسلام تک رسائی حاصل کر رہا ہے۔ امریکہ کی بڑی بڑی ریاستیں اپنے تمام تر تعصب کے باوجود اسلام کی سچائی سے دور نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اسلام کو پوری دنیا میں غالب کیا جائے۔ مسلم تہذیب کے نقوش عام انسان تک پہنچائے جائیں۔ جو مادی نظاموں سے تنگ آ چکا ہے۔ مادیت کی اندھی قوتوں سے خوفزدہ ہے۔ اندر سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ اسے سکون قلب چاہئے۔ پوری دنیا کی انسانیت جس کرب انتشار سے دوچار ہے اسے حجتہ الوداع کا پیغام ملنا چاہئے۔ مہذب اور تہذیب کا راستہ ملنا چاہئے۔ عدل اور انصاف کی میزان نصیب ہونی چاہئے۔

جمعتہ الوداع سے حجتہ الوداع کا راستہ فلاح اور بھلائی کا راستہ ہے۔ ہمدردی، ایثار اور قربانی کا راستہ ہے۔ سرورِ کائناتؐ فخر موجودات نے فرمایا تھا "تمہارا قریب دور والے کو یہ بات پہنچا دے کیا ہم دین متین کا وہ پیغام دکھی انسانیت تک پہنچا رہے ہیں۔ کیا ہم نے وہ فریضہ سر انجام دیا ہے کہ مظلوموں کو انصاف ملے۔ بے گھروں کو گھر ملے اور معیشت کے بوجھ تلے دبے انسانوں کو اس سود در سود کی لعنت سے نجات ملے۔ کیا ہم دنیا کو وہ تعلیم، تربیت دے رہے ہیں جو انسان کو مسجود ملائک بنانے کی تلقین کرتی ہے۔

جمعتہ الوداع رمضان کی تجلیوں کو سمیٹنے اور انہیں حجتہ الوداع کو عملی شکل

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

دینے کا نام ہے۔ جمعتہ الوداع مل بیٹھ کر ایک ساتھ۔ ایک صف پر بیٹھ کر اللہ کی نعمتوں کو
ماننے، شکر بجا لانے کا نام ہے۔ تمیز بندہ و آقا نہیں بلکہ سب ایک ہیں اور ایک ہونے کی
اساس تقویٰ ہے۔ رنگ و نسل، حسب و نسب کے تمام امتیازات ختم ہو جاتے ہیں۔ جب
سلمان فارسی "ابن اسلام" بن جاتا ہے۔ حجتہ الوداع حضرت بلال کی اذان پر اختتام پزیر
ہوتا ہے اور حضرت بلال رنگ و نسب کے امتیازات سے ہٹ کر صرف اور صرف اسلام کا
فرزند بن جاتا ہے۔ آیئے ہم بھی جمعتہ الوداع سے حجتہ الوداع کا سفر کریں یعنی نیلی سے نیلی
کے چراغ کو روشن کرنے کا سفر۔ تجلیات ذات سے تجلیات کائنات کی حقیقتوں کا سفر جو ہماری
پہچان کا سفر ہے۔

ہم نے جمعتہ الوداع کے لئے مسجد کے دروازے پر قدم رکھتے ہوئے احساس کر لیا ہے
کہ آج ہماری منزل حجتہ الوداع کی ہے جس میں خون اور مال دوسرے مسلمان کے لئے حرام
کر دیئے گئے ہیں۔ ہماری عبادت گاہیں، ہماری سوچ کی راہیں اسی حجتہ الوداع سے عبارت
ہوں جس کی اساس پر مسلمان صرف ۲۳ سالوں میں بارہ لاکھ مربع میل پر حکومت کرنے
کے قابل ہوئے۔ تین براعظموں میں اسلام کی شمع روشن نظر آنے لگی۔ اگر ہم آج اس بنیادی اصول سے
رشتہ جوڑ لیں تو اسلام دیگر نظاموں اور خطوں میں اس طرح چھا جائے گا جس طرح سچ جھوٹ
پر غالب ہو جاتا ہے۔ جمعتہ الوداع سے لے کر حجتہ الوداع سچ کا راستہ ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

فالسہ کا جوس - سوانجڑاں کے پھول

جنوبی پنجاب پھلوں اور سبزیوں کے حوالے سے بھی دنیا بھر میں جانا پہچانا جاتا ہے

ہر خطے کی پہچان صرف انسان ہی نہیں ہوتے بلکہ ایسے درخت۔ ایسے پھل اور سبزیاں بھی ہوتی ہیں جو اس علاقے کی شناخت بن جاتی ہے اور اس علاقے کی وجہ شہرت بنتی ہیں ۔ جیسے خانیوال کے خربوزے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ میٹھے ہوتے ہیں لیکن جب کبھی خانیوال سٹیشن سے گزرنے کا اتفاق ہوا اور سنی سنائی بات پر عمل کرتے ہوئے خربوزے خرید لئے تو پہلی بار افسوس ہوا کہ سفر میں چینی رکھنا بھی ضروری ہے۔ اس طرح عارف والے کے خربوزے مارکیٹ میں خوب بکتے ہیں اور ان کے میٹھے ہونے کی روایات سنائی جاتی ہیں لیکن حیرت ہوتی ہے کہ خربوزوں نے رنگ بدلنے کا ہنر تو سیکھا تھا مگر تاثیر سے محروم ہونے کا فن انہیں کہاں سے اور کب سے نصیب ہو گیا۔ تربوز کے میٹھے ہونے اور لال کہلانے اوپر سے سبز اور اندر سے سرخ ہونے کا جو اعزاز دیا جاتا تھا وہ اب صرف کہانیوں تک رہ گیا ہے۔ جنوبی پنجاب کا خطہ خوش نصیب ہے کہ اس کا مزاج میدانی بھی ہے اور صحرائی بھی ہے۔ ایک طرف سرسبز و شاداب خطے ہیں اور دوسری طرف جنگل بیلے اور تھل کے ریگستان ہیں اللہ سلامت رکھے ان نمائندگان کو جنہیں ایسے علاقے الاٹ کرانے کا فن آتا ہے اور جس طرح آباد کرتے ہیں اور فضلیں اٹھاتے ہیں ان کی ترقی کی سمجھ کچھ گہری ہو جاتی ہے۔ اسی صحرائی خطہ میں ایک ایسا پھل بھی ہے جو اس علاقہ کے نامور بزرگ شاعر حضرت خواجہ فریدؒ کو پسند تھا جسے ''پیلوں'' کہتے ہیں پیلوں سے متعلقہ گیت گانے والوں کو خود اندازہ نہیں کہ یہ ''پیلوں'' کیا ہیں ؟ وہ شاید سمجھتے ہیں ''پیلوں'' صحرائی خاتون کا نام ہے جسے حضرت خواجہ صاحب خراجِ عقیدت اور خراجِ محبت ادا کر رہے ہیں۔ ایسا نہیں اس پھل کے بارے اور اس کے جغرافیائی اہمیت سے آگاہ وہ اونٹوں کے قافلے والے ہیں جو جانتے ہیں کہ یہ پھل کن حقیقتوں کو آشکار کرتا ہے اونٹ کو خوراک مالک کو پھل اور اس خطہ کے باسی کو ایسی لکڑی مہیا کرتا ہے جو کبھی اوزار بن جاتی ہے اور کبھی فنون مفیدہ کے ایسے شاہکار پیدا کرتی ہے کہ لوگ عش عش کر اٹھتے ہیں کہ حضرت غلام فرید نے پیلوں سے کیوں اس قدر محبت کا اظہار کیا۔

''پیلوں'' ایک مسکین الطبع درخت ہے جو خشک اور ہواؤں میں زندگی کے دن طے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کرتا ہے اور ایسی رومانی داستانوں کو جنم دیتا ہے جو جنوبی پنجاب کی محبتوں اور ازل سے دوستیوں سے عبارت ہوتی ہے۔ جنوبی پنجاب ایسے ہی انمول پھلوں، سبزیوں اور کئی [illegible] ملو پلوان بنانے والوں کا خطہ ہے۔ ایک طرف اس خطے کے میٹھے پھل ہیں دوسری طرف اچار کے کام آنے والے "سوڑے" ہیں یہ وہ سوڑے نہیں جو چمٹ جاتے ہیں اور جن سے جان چھڑانا ممکن نہیں ہوتا۔ سوڑے کی طرح چپکنے والا محاورہ انہی کی وجہ سے پیدا ہوا ہے اگر بھارت والوں کو پتہ چل جائے تو وہ "اٹوٹ انگ" کہنے والی رٹ سے باز آ جائیں اور سوڑے کی طرح چپکتے چلے جائیں۔

انہی پھلوں میں ایک پھل فالسہ ہے جس کے بارے میں حکماء نے بڑے فوائد بیان کئے ہیں کہتے ہیں کہ یہ وہ پھل ہے جو دل و دماغ کو تقویت دیتا ہے "ہائی بلڈ پریشر" سے بچاتا ہے اعصابی تناؤ کو دور کرتا ہے اس پھل کی ایک ایسی خصوصیت بھی حکماء نے بیان کی ہے جو ہمارے عہد کے ان لوگوں پر بالکل منطبق ہوتی ہے جن کے منہ میں اکثر رال ٹپکتی ہے کسی کو آسودہ حال دیکھ کر خوش نہیں ہوتے کسی کے تخت پر اور کسی کے مال پر بھی رال ٹپکاتے ہیں کہ [illegible] ہوتا ہے کہ انسان اس قدر [illegible] اس حد تک جا سکتے ہیں [illegible] ایسے لوگوں کے لئے فالسہ انتہائی مفید پھل ہے یہ ان کو [illegible] سے [illegible] کرتا ہے۔

یہ پھل [illegible] ہیں [illegible] پیدا ہوتا ہے [illegible] جاتا ہے [illegible] فالسہ [illegible] جنوبی پنجاب [illegible] پھل ہے [illegible] شریف [illegible] زندہ ہوتے تو ان سے [illegible]۔

فالسہ ایک ایسا پھل ہے جو [illegible] Slimming Centre [illegible] ورزش سے جان چھڑاتا ہے [illegible] ایسا مفید پھل آپ [illegible] روز نہیں [illegible] ایک غریب آدمی کا پھل ہے [illegible] ملتا ہے اور نہ ہی زیادہ قیمت ادا [illegible] ایک دفعہ [illegible] ملتان میں [illegible] روپے فی کلو بکتا ہے اور لاہور میں ۱۲ روپے فی پاؤ فروخت ہوتا ہے۔

یہ پھل حساس اتنا ہے کہ اگر اسے آپ موٹے لفافے میں لے جائیں تو راستے میں پانی

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

پانی ہو جاتا ہے بے عزتی برداشت نہیں کرتا اسے غریبوں سے پیار ہے دریائی لکڑیوں سے بنی ٹوکریوں میں یہ خوشی خوشی بڑے بڑے شہروں میں چلا جاتا ہے اور مجال ہے کہ اس کی طبیعت ناگوار ہو مگر اس کے ساتھ وابستہ لیبر کے جو اوقات ہیں اس حساس پودے کو بھی پسند نہیں۔ اس پھل کو ٹہنیوں سے توڑنے والی خواتین کو آج کی جدید دنیا میں "لوٹوں کی تعداد" پر مزدوری ملتی ہے مگر یہ خواتین اپنی نمائندہ تنظیم نہ ہونے کی وجہ سے خاموش ہیں کاش کوئی NGO ان خواتین سے ہونے والی بے انصافی پر بھی آواز اٹھائے۔

جنوبی پنجاب کا دوسرا پھل بلکہ پکوان "سوانجڑاں" ہے اس کے پھول پکائے جاتے ہیں اور سبزی کے طور پر کھائے جاتے ہیں اس سبزی میں اگر بکری کا گوشت شامل کر لیا جائے اور اسلام آباد کے کسی مہمان کو کھلا دیا جائے تو وہ کم از کم آپ کو امریکہ کا ویزا ضرور دلا دے گا۔ اس پکوان کی تاثیر اور اس کے لذیذ ہونے کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت کہ مہمان اسے اپنے ساتھ اسلام آباد بذریعہ جہاز لے جاتا ہے اور اپنے عزیزوں اور دوستوں کو کھلاتا ہے اور سب خوب لطف اٹھاتے ہیں اور جنوبی پنجاب کے اس پکوان پر داد دیتے ہیں کہ ملتان تیری عظمتوں کو سلام تیرے فالسے اور تیرے سوانجڑیں سدا پھلتے پھولتے رہیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

اللہ کرے سی-بیوروکریسی

اکثر سیاستدان اور عوام لفظ بیوروکریسی استعمال کرتے ہیں کہ بیوروکریسی ہمارے کام نہیں کرنے دیتی۔ بڑی منظم ہے۔ سیاستدانوں کو بے بس کر دیتی ہے وہ صرف ٹیلی فون سے سیٹ اور پرزوں کے انتخاب تک محدود ہو کر رہ جاتے ہیں اور بیوروکریسی جس طرح چاہتی ہے اپنے اختیارات استعمال کرتی ہے۔ بڑے بڑے منصوبے سرد خانوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔ ساری پالیسیاں فائلوں میں دب کر رہ جاتی ہیں اور سیاستدان جب کچھ نہیں کر سکتے تو سارا بوجھ بیوروکریسی پر ڈال کر عوام کی نظروں میں ہیرو بن جاتے ہیں۔ آخر یہ بیوروکریسی کیا ہے جس سے سیاستدان ڈرتے ہیں اور اسے درست کرنے کے دعوے کرتے ہیں اور پھر تھک ہار کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ بیوروکریسی کبھی محتسب ہوتی ہے اور کبھی مقبول ہوتی ہے کبھی اس کے خلاف نعرے لگتے ہیں کہ فلاں کو تبدیل کرو کہ عوام کی تحقیر کرتا ہے۔ سیدھے منہ بات نہیں کرتا عوام کا جینا حرام کر دیا ہے پورے شہر کو قبرستان بنا دیا ہے ایسے سخت احکامات جاری کرتا ہے کہ عوام کی چیخیں نکل جاتی ہے اور کبھی تعریفیں ہوتی ہیں کہ ایسا نیک دل عوام دوست افسر کو تبدیل نہ کیا جائے علاقہ کی ترقی کے لئے اس کی موجودگی بڑی ضروری ہے۔ اس کے اعزاز میں دعوتیں ہوتی ہیں۔ خبریں چھپتی ہیں کہ ان کا دور حکومت مثالی تھا اور معیاری تھا صحیح بیوروکریسی کیا ہے اس کا مزاج اور کردار کیا ہے اس سے آگاہ کرنا صحافت کی ذمہ داری ہے۔

بیوروکریسی انگریزی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی نوکر شاہی کے ہیں۔ اس کا یہ عاجزانہ ترجمہ کس نے کیا ہے شاید اسے بیوروکریسی کی طاقت کا اندازہ نہ تھا۔ بیورو کے معنی میز اور کریسی کو اصطلاحاً آپ کرسی کہہ سکتے ہیں۔ یعنی ایسے حکمران جنہیں میز، کرسی نصیب ہوئی ایسے مقتدر حکمران جنہیں عوام کے ووٹ کی ضرورت نہ ہو صرف صوابدیدی اختیارات ہوں جب چاہیں استعمال میں لائیں اسی بیوروکریسی سے بیوروکریٹ کا لفظ نکلتا ہے جو بیوروکریسی کو استعمال میں لائے بیوروکریٹ کی شان اس بات میں پوشیدہ ہوتی ہے کہ جس کے چہرے پر مسکراہٹ کا گمان نہ ہو اور اگر خفیف سی مسکراہٹ آ بھی جائے تو وہ اپنے صوابدیدی اختیارات سے اسے بھگا دیتے ہیں۔ بات مختصر کریں گے اگر کوئی زبردستی سنانا چاہے تو فوراً جھٹک دیں

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

گے کہ وقت ضائع کر رہے ہو کہ تمہیں معلوم نہیں کہ ہمارا کتنا قیمتی وقت ہوتا ہے کہ ضروری نہیں کہ سارے بیوروکریٹ ایسے ہوں خداترس۔ ہمدرد، مخلص بیوروکریٹ بھی موجود ہیں جو دوسرے کے راستے میں بکھرے کانٹوں کو اپنی پلکوں سے چنتے ہیں۔ بیوروکریسی ایسی مخصوص انتظامی یونٹ ہے جسے بہترین دماغ چلاتے ہیں جن کے نوٹ، جن کے ڈرافٹ تار کردہ سمریاں ان کے فہم و فراست کے شاہکار ہوتے ہیں۔ ان کے نوک قلم سے اختیارات ہی اختیارات ٹپکتے ہیں ان کی طرزِ زندگی پُرکشش اور انداز اتنا حاکمانہ ہوتا ہے کہ عوام کو ان کے قریب آنے کا موقع نہیں دیتا۔ عوام دور سے صرف ان کی زیارت کر سکتے ہیں۔ ایک Distance سے رہنا اور اعوام کو رکھنا یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر اتنی بے تکلفی ہو جائے تو امور سلطنت سرانجام دینا مشکل ہو جاتا ہے اور پھر افسران کا عوام سے مل کر کام کرنے سے کرپشن اور اقرباپروری کا مرض بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ اس لئے ان کو عوام سے اور عوام کو ان سے دور رکھنے کی حکمت یہی بیان کی جاتی ہے۔ انگریزی دور میں اس کا انداز اور تھا لیکن جب پاکستان بنا تو بیوروکریسی نے دیگر شعبوں کی طرح پاکستان کے لئے لازوال قربانیاں دیں ملک میں کوئی انتظامی ڈھانچہ موجود نہ تھا۔ دفتروں میں میز کرسی موجود نہ تھی اس بیوروکریسی کے بغیر، میز کرسی کے نظام چلایا۔ سٹیشنری کے بغیر اپنی جیب سے کاغذ، قلم سے احکامات لکھے۔ نامساعد حالات میں پاکستان کے استحکام کو عملی شکل دی۔ آج کوئی ان پر ہزار تنقید کرے لیکن ان کے یہ کارہائے نمایاں تاریخ کا حصہ بنیں گے۔

انحطاط کہاں نہیں؟ اس انحطاط کے سائے بیوروکریسی پر بھی پڑے ہیں۔ اگرچہ ''صاحب بہادر'' اور "Your Obedient Servant" کے لفظ متروک ہو گئے ہیں۔ بیوروکریسی کو عوام کا خادم بنایا گیا ہے مگر تمیز بندہ و آقا کا نظام تبدیل نہیں ہو سکا۔ بیوروکریسی نے اپنے مزاج میں کچھ لچک پیدا کی مگر تنقید سننے کا حوصلہ پیدا نہ کر سکی۔ برہمی کا اظہار اور مخالف رائے کو دبانے کا شوق اس کے اندر سے نہ نکل سکا۔ اگر کسی نے اصلاح احوال کی ضرورت محسوس کی تو اسے حکومت پر تنقید سمجھا گیا اور بیوروکریسی نے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کئی ایسے لیبل لگوائے کہ اس آدمی کا معاشرے میں جینا محال ہو گیا اور ان سختیوں کا جواز یہ پیش کیا کاروبار مملکت چلانے کے لئے کچھ لوگوں پر سختیاں کرنی پڑتی ہیں مگر مجموعی نتائج اچھے تو اس سے بیوروکریسی کے وقار میں اضافہ ہوتا ہے اور حکومت کا نظام بھی درست

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

چلتا ہے مگر ایسا ہے ممکن ہو جب صاحب دفتر میں نہ ہوں۔ میٹنگ میں رہتے ہوں اور اگر میٹنگ سے فارغ ہوں تو لنچ اور ڈنر انہیں سکھ کا سانس لینے نہ دے تو امور مملکت کیسے چلیں گے؟

ان کو ملتی ہی نہیں لنچ اور ڈنر سے فرصت
حال دل ان کو سنانے کی ضرورت کیا ہے
درد دل کھانے کو ہے خون جگر پینے کو
اور تفصیل میں جانے کی ضرورت کیا ہے

پھر وزیروں کے دورے انہیں مصروف رکھتے ہیں اور سائل نئی تاریخ لے کر دور دراز گاؤں میں چلا جاتا ہے اور پھر انصاف کی راہیں دیکھتا رہتا ہے جب نئی تاریخ ملتی ہے تو مقدمات کی بھرمار اس کا نمبر ہی آنے نہیں دیتی۔ Justice delayed justice dinied اگر انصاف میں تاخیر ہو جائے تو انصاف کرنے سے انکار ہو جاتا ہے اور دوسری طرف سے جواب آتا ہے کہ ایسا نہیں تاخیر ہی درست ہے تاکہ انصاف صحیح ہو جائے۔ جلدی کے فیصلے مبہم پیدا ہوتے ہیں۔

Hurried justice burried اس لئے سرخ فیتا دریافت کیا گیا تاکہ جی بھر کر تاخیر کی جائے۔ عوام کو دفتروں کے اس قدر دھکے پھیرے لگوائے جائیں کہ انہیں احساس ہو جائے کہ انصاف کا حصول ایک Painful Act ہے۔

ممکن ہے ماضی میں ایسا ہوتا ہو مگر اب خدا کے فضل سے ہمارا اپنا ملک ہے۔ اپنے عوام ہیں اور اپنے حاکم ہیں اور اپنی پیاری معصوم سی بیوروکریسی ہے۔ اس لئے ہماری توقعات بھی زیادہ ہیں۔ ہم عدل گستری کا وہ طریقہ اختیار کریں جس سے لوگوں کو بروقت انصاف مل سکے۔ دفتروں میں جلد کام ہو سکے۔

کئی کئی گھنٹے بھوک، پیاس اور دھوپ کی حالت میں انتظام نہ کرنا پڑے۔ مظلوم کی داد رسی ہو سکے اور مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچایا جا سکے۔ اگر ہماری بیوروکریسی دوبارہ سے اس احساس سے آگاہ ہو جائے اور تربیت میں بھی اس جزو کو شامل کر لیا جائے تو فلاح اور خیر کا معاشرہ وجود میں آ جائے گا جس میں افسر عوام کی خدمت کرتا نظر آئے گا۔ عوام کا نمائندہ صاحب کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ کر اعتماد سے کہہ سکے گا کہ جناب میں آپ کے ضلع کا ایک

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

باشندہ ہوں اور افسر اس پر خوشی کا اظہار کر کے کہے گا کہ مجھے آپ کی خدمت کر کے خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ میرے دروازے آپ کے اپنے دروازے ہیں آپ کے ٹیکس کی آمدنی سے بنے ہیں یہ دفتر۔ یہ کار، یہ کوٹھی، آپ کی ہے کہ آپ کے خون پسینے سے تعمیر ہوئی ہے میں اس میں چند روزہ مسافر ہوں مجھے آپ کی خدمت کے لئے تعینات کیا گیا ہے۔ جب تک آپ خوش ہیں اور میں آپ کے اعتماد اور توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا تو آپ بھی مجھے قبول کریں اگر آپ سمجھیں کہ میں انصاف میں، عدل میں، اپنے فرائض کے انجام دہی میں کوتاہی کا مرتکب ہو رہا ہوں آپ میری کھلی کچہری میں مجھ پر تنقید کریں میں اپنا تبادلہ کرالوں گا یا حالات کو ٹھیک کرلوں گا۔ مجھے احساس ہے کہ اب برطانیہ کا راج نہیں نہ ہی وہ روایتی ہیرو کریسی ہے اب تو اللہ کریسی ہے کہ جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ میں لوگوں کی دعاؤں سے پہلے ان کے مسائل حل کرلوں کہ جب وہ اللہ تعالیٰ سے کچھ مانگتے تو گویا میری کارکردگی کی شکایت ہوتی ہے کہ میں نے ان کے مسائل حل کرنے میں کوتاہی کی ہے۔ اللہ کریسی دراصل اس روایتی کریسی کو مشرف بہ اسلام کرنے کا عزم ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کیا ملتان میں احمد شاہ ابدالی کا کوئی ولی وارث نہیں؟

ملتان تاریخی یادگاروں کا شہر ہے اس کے سنگ و خشت عظمت رفتہ کے افسانے تازہ کرتے ہیں یہاں کے مقابر، مساجد، خانقاہیں، سرائیں، فصیلیں، دمدمے، گزرے ہوئے ایام کی شان و شوکت اور ان میں بسنے والے انسانوں کے سوز دل کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔

کسی شاعر نے کیا خوب ارض ملتان کی عظمتوں کو اجاگر کیا ہے۔

ارض ملتان، تیرے لاڈلے جانبازوں نے
اپنی شمشیر سے روکے تھے سکندر کے قدم
ان قبائل کے مقدر میں تھی ہر چند شکست
تیغ یونان کی یہیں آب ہوئی تھی مدہم
تیرے محلوں، تیری فصیلوں نے کبھی
ابدالی غزنی سے بھی افسانہ شمشیر سنا
کبھی نادر، کبھی غوری کبھی بن قاسم سے
نعرہ وحدت حق نعرہ تکبیر سنا

جائے پیدائش احمد شاہ ابدالی امیر افغانستان انہی یادگاروں میں شامل ہے ملتان کا ابدالی روڈ اس تاریخی شاہراہ کی مناسبت رکھتا ہے۔

کمشنر ہاؤس کے عین سامنے جائے ولادت احمد شاہ ابدالی قومی اسمبلی کے توجہ طلب نوٹس کی طرح موجود ہے۔ ہر روز اس سڑک سے کئی صحافی، کئی ریڈیو سے وابستہ پروڈیوسر اور کئی ٹیلی ویژن کے نمائندے گزرتے ہیں۔ کئی سرکاری و غیر سرکاری افسر اس راستے سے بالیڈے ان اور کینٹ کی طرف جاتے ہیں مگر کبھی کسی نے اس طرف دھیان ہی نہیں دیا کہ یہ چھوٹی سی یادگار اپنے اندر کتنی شکایتیں اور حکایتیں لئے موجود ہے۔

اس یادگار کو سب سے بڑی شکایت اپنے سدوزئی خاندان کے افراد سے ہے جنہوں نے کبھی اس یادگار کو اہمیت ہی نہیں دی۔ اس عمارت کی شکل مسخ ہو رہی ہے اور کوئی کوئی نہ کوئی کسی دوائی بیچنے والے کا اشتہار چسپاں ہوتا ہے۔ کہیں نہ کہیں کوئی نئی تحریر لکھی ہوتی ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

اینٹین بوسیدہ ہوتی جارہی ہیں عمارت کی لوح کی تحریر کے کئی لفظ اکھڑ گئے ہیں۔

یہ یادگار اپنے خاندانوں کے دانشوروں کو دعوتِ فکر دے رہی ہے کہ میں نے تمہیں ملتان کی حکومت دی سرسبز و شاداب کھیت اور کھلیان دیئے پر شکوہ عمارات دیں میرے نام سے تمہاری پہچان ہے مگر تم نے مجھے کیا دیا کہ ایک معمولی سی جائے پیدائش کی دیکھ بھال بھی نہ کر سکے۔

ایک آدھ اشتہار اتارنے کی توفیق نہ مل سکی ایک مختصر جنگلا ایک خوبصورت پارک ایک مختصر تاریخ اس یادگار سے وابستہ ہو لکھوا دیتے کہ اس یادگار کا مالک کتنا جلیل القدر تھا جس نے سدوزئی خاندان کو اتنا مقام دلایا۔

ابدالی خاندان کی پہچان کرائی۔ بلکہ بعض مقتدر شخصیات نے اپنے گھروں کے باہر احمد شاہ ابدالی کی مناسبت سے "ابدالی ہاؤس" کے بورڈ لگوائے مگر اس یادگار کو ایسے بھول گئے جیسے ان سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔

حالانکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ یہاں غیر ملکی سیاحوں کے لئے انگریزی، اردو اور فارسی میں خوبصورت تحریر ہونی چاہئے جس میں احمد شاہ ابدالی کی پیدائش سے لے کر کارہائے نمایاں کا ذکر ہو تاکہ پڑھنے والا اندازہ کر سکے کہ وہ کسی اہمیت کی یادگار پر حاضر ہے صرف جائے پیدائش اور امیر افغانستان کے الفاظ کافی نہیں۔

جائے پیدائش احمد شاہ ابدالی کے سامنے تبلیغی جماعت کی مسجد ہے۔ وہاں سے کئی نوجوان، بزرگ تبلیغ اسلام کے لئے قافلوں کی صورت گزرتے رہتے ہیں کبھی ان کی نگاہ اس عظیم تبلیغی پر نہیں گئی جو کابل و قندھار کے دور دراز علاقوں میں اسلام اور عالمِ اسلام کی بالا دستی کے لئے گھوڑے کی پشت پر بیٹھے سفر کی صعوبتیں برداشت کرتا تھا۔

ایک بار نہیں، کئی بار ملتان اور دہلی کے مضافات میں اسلام کو ایک قوت بنانے کے لئے سرگرم عمل تھا۔

ملتان کی تاریخی فضیلتوں پر جانثار ہونے والوں کو علم ہونا چاہئے کہ احمد شاہ ابدالی کو ملتان سے بے حد لگاؤ تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ملتان میں پیدا ہوئے اور سات سال تک ملتان میں رہے۔ بچپن کے دن یادوں کا حسین سرمایہ ہوتا ہے

دوسرا وہ ملتان اور ہندوستان میں حضرت شاہ ولی اللہ" کی دعوت پر آئے کہ یہاں ہندو

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

آمریت اور ظلم کا خاتمہ ہوا اس اعتبار سے انہوں نے برصغیر میں پاکستان کے لئے اساس فراہم کی اور ہندوؤں کے ظلم و ستم سے مسلمانوں کو نجات دی۔

آج یہاں ان کی یادگار ہے اس علاقے میں کئی شاندار دفاتر کوٹھیاں اور بینک موجود ہیں سب کی تعمیر بہتر ہے سوائے ان کی یادگار کے۔

پوری سڑک پر پسماندہ اور توجہ سے محروم عمارت احمد شاہ ابدالی کا کوئی ولی وارث نہیں۔اس عمارت کا کسی سے کوئی تعلق نہیں،ایسا نہیں ہو سکتا۔

اگر حق شفع کا قانون موجود ہے تو پھر سب سے فائق حق جناب ہر دلعزیز کمشنر ملتان ڈویژن جناب محمد عامر خان کا ہے۔وہ اس عمارت کے سب سے قریبی ہمسائے ہیں۔

جناب کمشنر علم دوست، تہذیب و ثقافت سے لگاؤ رکھنے والی شخصیت ہیں یقیناً اس عمارت کی فرسودگی پر انہیں رنج ہوگا ان سے ادب سے غرض ہے کہ وہ اپنے خصوصی اختیارات سے اس اہم تاریخی عمارت کو ایک خوبصورت بنگلہ ایک دلکش لان دلوا دیں تاکہ یہ جگہ دوسروں کی نظروں میں رعنائی اور دلچسپی کا باعث بنے۔

احمد شاہ ابدالی کے خاندان کے تین بزرگ ایسے بھی ہیں جو اس ضمن میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔جناب محمد سلیم خان سدوزئی جو چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے صدر رہ چکے ہیں جناب عمر کمال خان ایڈووکیٹ ایک محقق اور دانشور ہیں بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان کے وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر عاشق محمد خان درانی جن کا احمد شاہ ابدالی سے صدیوں کا رشتہ ہے یہ ہستیاں مل کر اس مقام کو تاریخ کا وہ نقطہ بنا سکتے ہیں جو تحریک پاکستان کی منزل بنا۔ جس نے مرہٹوں کو شکست دی جس نے ۱۱۶۵ھ میں ملتان پر اسلامی حکومت قائم کی۔ جس نے کوڑا مل کو اور اس کی آمریت کو ختم کر کے عام انسانوں کو عافیت اور امان دی۔

جو اسلام کے لئے اور دین متین کے لئے گہرا جذباتی لگاؤ رکھتا تھا وہ برصغیر پاک و ہند میں اسلام کو ایک قوت دیکھنا چاہتا تھا آج اس کی جائے پیدائش بے بسی اور لاوارثی کی علامت ہے۔

کیا ہم اپنے بزرگوں سے اور اپنے اثاثہ اور ورثہ سے یوں محبت کرتے ہیں؟

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

"ہور کی حال اے"

ہر زبان کی اپنی چاشنی ہوتی ہے۔ لفظوں میں مخصوص نکھار ہوتا ہے پنجابی بھی اس میدان میں پیچھے نہیں۔ اس میں نکھار اور پیار دونوں موجود ہیں۔ اور خاص طور پر ایسے جملے، ایسے الفاظ کبھی نہیں بولتے مثلاً آگے تیرے بھاگ لچھیئے۔

منڈا ویکھ لے کبوتر ورگا

کچھ اس قسم کا حال اس جملے میں بھی موجود ہے "ہور کی حال اے" یعنی اور کیا حال ہے اور پھر جال اتنا لمبا ہو جاتا ہے کہ اگر تحریر میں ہو تو دفتر کے دفتر بھر جائیں اور اق ختم ہو جائیں اور اگر تقریر میں ہو تو جہاں مواد ختم ہوا تو روائتی مقرر کی طرح "ہاں تو میں کہہ رہا تھا" اور مقصود یہی ہوتا ہے "ہور کی حال اے" یعنی جملے جوڑنے اور ٹوٹے سلسلوں کو بحال کرنے کا یہی انداز ہے۔ گرمی ہو یا سردی آندھی ہو یا طوفان ان جملوں کا وزن کم نہیں ہوتا اور اگر حسنِ اتفاق سے اس جملہ کا استعمال ٹیلی فون پر ہو جائے تو اس جملے کی طوالت زلف زنجیر سے کم نہیں ہوتی اگر کسی کو دعویٰ اختر شماری کا ہو یا ریاضی دان ہونے کا ہو تو وہ استعمال ہونے والے جملوں کی طوالت کو شمار کر کے بتا دیں تو ہم ان کے علم اور ان کے تجربہ کے قائل ہو جائیں گے۔ مگر ایسا ممکن نہیں؟ ٹرگنو میٹری، جیو میٹری، ریاضی اور کیلولیس کی مہارت اپنی جگہ مگر "ہور کی حال اے" کی وسعت اپنے اندر جہان معنی سمیٹے ہوئے ہے۔

ملتان کی گرمی جو ملتان کو Burning Desert ہونے کا درجہ دیتی ہے۔ کمرے کی لائٹ چلی جائے۔ بجلی کے پنکھے چلنے بند ہو جائیں آدمی پسینہ پسینہ ہو جائے مگر "کی حال اے" کی بات ختم نہیں ہوتی۔ ٹیلی فون کا بل جس قدر بڑھ جائے ضروری کالیں کتنی رک جائیں۔ ٹیلی فون فنی خرابی سے کٹ جائے مگر "کی حال اے" کا ابلاغ ختم نہیں ہوتا۔ "ہور کی حال اے" کے جملے میں نا جانے وہ کون سی لذت پوشیدہ ہے کہ جس شخص کے ہتھے یہ جملہ چڑھ جائے تو وہ باتوں میں غنی اور قلم کا دھنی بن جاتا ہے۔ گفتگو کی لذت تکلم کا انداز آجاتا ہے۔ لوگ عش عش کر اٹھتے ہیں کہ جس سلیقے سے اور وقت کا استعمال ہو رہا ہے۔ وقت گزرتا جا رہا ہے اور حسن کلام میں نکھار آتا جا رہا ہے۔ جہاں جملے میں بے ربطی پیدا ہوئی وہیں سے ٹھک سے یہ آواز آئی۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

"ہور کی حال اے"

آموں کی پیٹیاں ہوں یا کپاس کا بھاؤ ہو آٹے کا بحران ہو، ٹیلی فون کی کال طویل سے طویل تر ہو جاتی ہے اگر کسی PCO سے بات ہو رہی ہو تو دوسرے آدمی کی ٹرین پکڑنی ہو یا جہاز کی سیٹ محفوظ کرانی ہو کچھ بھی ہو جائے۔ ٹرین جا سکتی ہے جہاز کی سیٹ رہ سکتی ہے مگر کیا مجال ہے کہ "ہور کی حال اے" سے شروع ہونے والی گفتگو اختتام پذیر ہو جائے۔ وارث شاہ نے ہیر وارث شاہ لکھی تو لوگوں نے کہا کہ لافانی شاہکار ہے مگر وارث شاہ کو اس ابلاغ کا علم ہوتا تو ہیر وارث شاہ پر طبع آزمائی کرنے کی بجائے "ہور کی حال اے" کی رومانی اور طولانی مفہوم کو بیان کرنے پر ترجیح دیتے ہیں۔

ایک موقع پر کہا گیا ہے کہ "قسم ہے زمانے کی کہ انسان خسارے میں ہے" زمانے کی قسم اٹھانے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی کہ کوئی شخص وقت ضائع نہ کرے کہ وقت ضائع کرنے والا خسارے میں ہے لیکن ٹیلی فون کی کال کرنے والا جس قدر چاہے وقت ضائع کرے سننے پر ٹیلی فون کا گھاٹا ہوتا ہے اور سننے والے کی قوت سماعت متاثر ہوتی ہے۔ ایسے ٹیلی فون کسی حقیقت سے بھی ماورا ہوتے ہیں جس میں کہا گیا ہے "یک لحظہ غافل گشتم صد سالہ راہم دور شد" ایک لمحہ غافل ہو جاؤں تو اپنی راہ سے دور ہونے کا احتمال رہتا ہے مگر نہیں معلوم کہ ٹیلی فون کی کال کرنے اور بار بار موسم کا کیا حال ہے آم کا کیا بھاؤ ہے۔ بچے کیوں رو رہے ہیں۔ آج سبزی کیا پکائی ہے۔ کپڑے کہاں سے خریدتے ہیں میک اپ کا سامان کہاں سے ملتا ہے۔ اور پھر گفتگو میں وقفہ ڈالتے ہوئے کہیں گے۔

"ہور کی حال اے"

کیا یہ ممکن نہیں کہ جس طرح نپولین بوناپارٹ نے ڈکشنری سے لفظ ناممکن (Impossible) نکال دیا تھا۔ ہمیں بھی اپنی قوم کو اکیسویں صدی کے تقاضے سنبھالنے کے لئے اور زمانے کی رفتار سے ہم رکاب ہونے کے لئے اپنے کلام سے اور اپنے بیان سے اس جملے کو نکالنا پڑے گا۔ تاکہ ہم ترقی کر سکیں اور وقت کی قدر کر سکیں اور ایک دوسرے کو یہ کہنے سے جان چھڑا سکیں۔

"ہور کی حال اے"

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

جنوبی پنجاب میں صحافتی اقدار کا جائزہ

ملتان میں دو روزہ جرنلسٹس ورکشاپ کی رسم افتتاح آج جناب مجید نظامی ادا کرینگے

بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان کے شعبہ ابلاغیات اور ایف ای ایس اسلام آباد کے باہمی اشتراک سے ملتان میں جنوبی پنجاب کی تعمیر و ترقی اور جمہوریت کو درپیش مشکلات کے حوالے سے دو روزہ جرنلسٹ ورکشاپ منعقد ہو رہی ہے جس میں مختلف اضلاع سے نامہ نگار، مختلف ذرائع سے تعلق رکھنے والے نمائندے، ریڈیو، ٹیلی ویژن کے حضرات شرکت کر رہے ہیں۔ اس اہم قومی ورکشاپ کا افتتاح جناب مجید نظامی چیف ایڈیٹر روزنامہ نوائے وقت کریں گے۔ یہ خوش قسمتی ہے کہ ورکشاپ میں اٹھائے جانے والے نکات پر جناب مجید نظامی اس حوالہ سے اتھارٹی ہیں کہ وہ اے پی این ایس کے صدر بھی ہیں اور ملک کے قابلِ قدر صحافی بھی ہیں۔ اس حوالہ سے ان کی خدمات کا دائرہ کم و بیش نصف صدی کے ماہ و سال پر محیط ہے۔ انہوں نے صحافت کو ملک میں مضبوط کرنے اور اس کی اقدار کی اٹھان میں جو عہد ساز کردار ادا کیا ہے اس کی قدر و قیمت میں اہلِ صحافت نہ صرف باخبر ہیں بلکہ احسان مند ہے۔ اس کے علاوہ اس ورکشاپ میں جنوبی پنجاب کی غربت، ناخواندگی، معاشی اور معاشرتی استحصال پر خصوصی مقالے پڑھے جائیں گے اس۔ اور جمہوریت کو درپیش مشکلات کا جرئزہ لیا جائے گا اور خاص طور پر ایسے خطوں میں جہاں عوام کی تنقیدی صلاحیتیں اس حد تک بیدار نہیں ہوئیں جو دیگر ترقی یافتہ خطوں میں موجود ہیں۔ اس خطے کے لوگ غربت، افلاس اور پسماندگی کی وجہ سے لفظوں کے ہیر پھیر، خوشنما اور خوش اداد عوؤں میں آسکتے ہیں اس لئے جمہوریت کی اقدار کو استحکام دینے اور انہیں ان علاقوں میں موثر کردار ادا کرنے کے لئے ایک خوشگوار اور قابلِ عمل فضا پیدا کرنی ہے یہ دو روزہ ورکشاپ نہ صرف اخبارات کے کردار کو موثر بنائے گی بلکہ اس خطے میں اخبارات کے پھیلاؤ اور ذرائع ابلاغ کے نمائندوں کی بہتر جانکاری میں تعاون کرے گی۔ خاص طور پر الیکٹرانک میڈیا ان خطوں میں کسی سطح کا انقلاب لا سکتا ہے اور شعور واگہی کے لئے کیا وسائل پیدا کر سکتی ہے۔ اس حوالہ سے ڈاکٹر صبور غیور کے پُر مغز مقالے اس ورکشاپ میں سوچ کی اساس کو مضبوط کریں گے اور ملتان میں قائم ذرائع ابلاغ

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کے ادارے ان کے نمائندے اور بعض اپنی کارکردگی سے ملتان اور جنوبی پنجاب کی محرومی کی آواز اٹھا رہے ہیں۔ ایسے پروگرام پیش کریں کہ جن سے یہ علاقے وطن عزیز کے دیگر حصوں کے ہم پلہ ہو سکیں گے۔

صحافتی روایات اور ملتان

مدینۃ الاولیاء ملتان کو صحافتی دنیا میں ایک خاص مقام حاصل ہے یہاں سے کئی روزنامے ہفت وار اخبار اور ماہنامہ اخبارات و رسائل شائع ہوتے ہیں۔ صحافتی انڈسٹری میں ملتان کو ایک ترو تازہ زرخیزی کا درجہ حاصل ہے جس طرح مغرب میں علاقائی چھوٹے شائع ہوتے ہیں اسی طرح ملتان سے کئی مقامی علاقائی پرچے باقاعدگی سے جاری ہوتے ہیں اور ان کی سرکولیشن بھی قابل قدر ہے۔ یہ تحقیقات قدیمہ کے کرآن کے پرچوں کے بارے میں ہے مقصود کسی پر تنقید کرنا نہیں بلکہ ان کی اشاعت کو بڑھانا اور ان سے وابستہ توقعات کو پورا کرنا ہے۔

ملتان میں صحافت کی روایت

اسی پس منظر میں ملتان کی صحافت کی ارتقائی تاریخ سامنے آتی ہے۔ رشید احمد صدیقی نے کیا معنی خیز بات کہی ہے کہ "اب خواہ کسی ملک یا قوم کا ہو یا کسی ذہن کے اچھے لمحوں پر تجربوں کا مدار اور انحصار ہے۔ دنیا ترقی کی تیزی سے آگے کیوں نہ بڑھ رہی ہو انسان کا ذہن ہمیشہ اس سے آگے ہوتا ہے۔ انسانی ذہن اپنے کارنامے پیچھے چھوڑتا ہوا آگے بڑھتا ہے اور ان کارناموں میں نہ پناہ لیتا ہے اور نہ ان کو پناہ دینے کی خواہ مخواہ کوشش کرتا ہے۔ اچھے اور بڑے کارنامے اپنی حفاظت خود کرتے ہیں۔"

ملتان کی صحافت کی تاریخ بھی کسی اتفاق سے عبارت ہے۔ ملتان میں باقاعدہ صحافت کا آغاز ۱۸۵۲ء میں ہوا جب ماہنامہ [illegible] منشی محمدی [illegible] جنہوں نے اپنی صحافتی زندگی کا [illegible] سے پرچہ [illegible] ملتان سے [illegible] بعد [illegible] غلام نصیر الدین نے ملتان سے [illegible] جاری کیا اور یہ دونوں پرچے اپنی صحافتی خدمات سرانجام دیتے رہے اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ہنگامہ آرائیوں میں بند ہو گئے۔ ملتان سے [illegible] ہفت روزہ کی شکل میں [illegible] ۱۹۲۲ء میں جاری ہوا اس کے مدیر [illegible] ملتانی تھے [illegible] بعد ان کے بھائی محمد [illegible] خان نے اسے جاری رکھا اور آج بھی یہ پرچہ جاری و ساری ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ملتان میں اس وقت پریس کلب ملتان اور دفتر تعلقات عامہ کی فائلوں سے جن پرچوں کا پتہ چلا ہے ان کی تعداد اس وقت تقریباً ۲۰۰ کے قریب ہے اور ان کے وابستہ صحافیوں کی تعداد سینکڑوں میں پہنچتی ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ابھی راکھ میں چنگاریاں باقی ہیں

مسئلہ مقامی سطح کا ہو یا قومی سطح کا۔ بات قومی یکجہتی کا ہو یا صوبوں کے اختیارات کی ہو بات مقامی سطح کی ترقی کی ہو یا پورے نظام کی بہتری کی ہو۔ غرض یہ کہ مہنگائی سے لے کر غربت و افلاس تک بات جہاں کی ہو اور جس سطح کی ہو ہم اس کے حل کے لئے پریشان رہتے ہیں۔ ہم پریشان کیوں رہتے ہیں؟ اس کا ہمیں خود بھی اندازہ نہیں ہماری پریشانیاں کچھ ہماری خود پیدا کردہ ہے اور کچھ پریشانیاں ہمیں ماحول نے اس لئے دی ہیں کہ ہم ان کا مل جل کر حل نکالیں۔ اس ناخن تدبر کو تلاش کریں جس سے مسئلے حل ہوتے ہیں اس سوچ کو زندہ کریں جو تجویز سے پہلے اس کی تکمیل کے لئے کوشاں ہوتی ہے۔ پچھلے دنوں ہم نے ملتان کی مقامی انتظامیہ کو جائے پیدائش احمد شاہ ابدالی کی زبوں حالی کی طرف توجہ دلائی ابھی لفظوں کی روشنائی خشک نہیں ہوئی تھی کہ جائے پیدائش احمد شاہ ابدالی پر میونسپل کارپوریشن کی گاڑیاں عملہ اور افسران وہاں موجود تھے اور سارے شہر نے یہ منظر دیکھا کہ آثار قدیمہ جو ملتان کی پہچان ہیں ان کے محافظ میدان میں آ گئے ہیں۔ احمد شاہ ابدالی کی جائے پیدائش کے تمام پہلوؤں کو خوبصورتی سے درست کیا گیا اگرچہ ابھی جنگلہ اور احمد شاہ ابدالی کی شخصیت اور ان کے کارناموں کی تحریر باقی ہے جنگلہ تو محکمہ تعمیر کرا دے گی مگر تحریر کون آویزاں کرے گا؟ اس کام کے لئے بالآخر ان کے خاندان کے افراد کو سامنے آنا چاہئے ہر قوم، ہر قبیلہ اور ہر خاندان اپنے سربراہ پر فخر کرتے ہیں۔ اس کے کارنامے ان کے خاندان کی پہچان بنتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم سدوزئی خاندان کے افراد اپنے بزرگ (احمد شاہ ابدالی) سے اپنا تعلق جوڑنے میں کیا عار محسوس کرتے ہیں ایسے بزرگ صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں ان کی ذات پر اور ان کے کارناموں پر قومیں فخر کرتی ہیں۔ ہمیں نہ جانے کیوں شرم محسوس ہوتی ہے۔

بہرحال ابھی راکھ میں چنگاریاں باقی ہیں۔ مایوسی نہیں۔ امید کی کرن موجود ہے۔ اس امید کی کرن کو قلعہ کہنہ کی قدیم دیواروں، دمدموں اور غاروں کی طرف لے جانا چاہتا ہوں اور کھنڈرات میں اس روح کو تلاش کرنا چاہتا ہوں جو میاں محمد شفیع ناظم بلدیہ ملتان کی صورت میں موجود ہے جس نے پہلے پہل اس قلعہ کو اور اس کی گرتی دیواروں کو سہارا دیا پھر محترم جناب محمد عامر خاں صاحب کمشنر ملتان کی اس کاوش کو تلاش کر رہا ہوں جنہوں نے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

اپنے عہد میں اسے دوبارہ رنگ و نور بخشا اس سے پہلے کہ یہ رنگ و نور بکھر جائے اسے مضبوط اور سنبھالنے کی شدید ضرورت ہے۔ ہم ملتان کو تاریخ کا وہ شہر لکھتے ہیں جو گذشتہ ساڑھے پانچ ہزار سال سے زندہ ہے۔ آباد اور شاد ہے اور ہمارے اس دعوی کی دلیل صرف اور صرف قلعہ کہنہ ابن قاسم باغ ہے جس کے کھنڈرات اور آثار ہمارے دعوی کی تصدیق کرتے ہیں کہ واقعی یہ تاریخ برصغیر کے دیگر شہروں پر اپنی قدامت اور تاریخی عظمت کی وجہ سے برتری رکھتا ہے۔ قلعہ کہنہ کے در و دیوار، دمدمہ اور اس کی ساتھ کی عمارتیں ہماری فوری توجہ چاہتی ہیں۔ اس کے لئے میونسپل کارپوریشن کے ایڈمنسٹریٹر کی ذمہ داری ہے کہ وہ حکام بالا کو احساس دلائیں کہ یہ تاریخی ورثہ کی اگر اب حفاظت نہ کی گئی تو ملتان کی پہچان گم ہو جائے گی اس کے لئے عالمی اداروں کو احساس دلانے اور ان سے امداد حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ ایشین ڈیویلپمنٹ بنک اگر ڈیرہ غازیخان کے درختوں کو بچانے کی کوشش کر سکتا ہے تو ملتان کے آثار و صنادید کو بچانے کا ہم انہیں خیال کیوں نہیں دے سکتے۔ موہنجوڈارو پر ساری توجہ ہو سکتی ہے جو اب کھنڈرات پر مشتمل ہے اور جو شہر آباد ہے اور قلعہ کہنہ پر جس کی زندگی کے آثار نمایاں ہیں اسے مسلسل فراموش کرنا عقل و دانش کے خلاف ایک اقدام لگتا ہے۔ ملتان کسی طرح بھی موہنجوڈارو سے کم نہیں بلکہ یہ ہم عصر شہر ہے اور اب جو اسے مدینہ اولیاء ہونے کا شرف ملا ہے اس کی پہچان اسلام سے قبل اور اسلام کے بعد جو ذہنوں میں آتی ہے وہ حوالے مضبوط کرنے ضروری ہیں اس لئے کہ ہم آئندہ نسلوں کو بتا سکیں کہ ہم نے کس طرح اپنی شناخت کا سفر طے کیا ہے۔

ملتان کا چوک فوارہ اگرچہ اتنا قدیم نہیں لیکن اس کے اردگرد جو آبادی موجود ہے وہ صدیوں کی تاریخ کی امین ہے۔ یہاں ایک ایسی ہستی کا مزار ہے جسے صدیوں کی فضیلت حاصل ہے اگرچہ "اراضی ملتان، ملتان ذیشان" اور مرقع ملتان جیسی کتابوں میں اس کا ذکر نہیں ملتا لیکن اس کے باوجود "مائی مہربان" کا مزار قدیم طرز تعمیر کی علامت ہے "مائی مہربان" ایک بزرگ خاتون کا مزار ہے جہاں مردوں کا داخلہ قطعی بند ہے یہ بزرگ خاتون کون تھیں کہاں سے آئی کاش اس پر تحریری صورت میں کچھ مواد ملتا اگر کہیں ہے تو وہ مواد گمنامی کی صورت میں ہے۔ بہر حال ان کے عہد کو محمود غزنوی کے عہد سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس مزار کو آج کل جو خطرات لاحق ہیں کاش کوئی اس کا ازالہ کر سکتا۔ یہ پردہ دار خاتون

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

"But"- "However"- "Other Wise"

آپ بی اے کا کسی بھی یونیورسٹی کا رزلٹ اٹھا کر دیکھ لیں آپ کو انگریزی میں فیل ہونے والے طلباء و طالبات کی ایک لمبی قطار نظر آئے گی۔ طلباء و طالبات انگریزی میں کیوں فیل ہوتے ہیں ؟ حالانکہ ہم انہیں کے جی اور نرسری سے انگریزی شروع کراتے ہیں سارا سارا سال مغزماری کرتے ہیں گلی کوچوں میں پھیلی ہوئی اکیڈیمیوں میں اپنے بچوں کو پڑھاتے ہیں گھر پر بھی ٹیوٹر کا انتظام کرتے ہیں اور کسی ریٹائرڈ فاضل انگریزی کے پروفیسر سے بھی مسلسل رجوع کرتے ہیں۔ خلاصے ، گیس پیپرز اور "میڈی ایزی" جیسی کتابیں بھی پڑھتے ہیں ایک جیسی لکھی ہوئی اور ایک دوسرے کی کاوشوں سے ترتیب دی ہوئی گرائمر کی کتابیں بھی پڑھتے ہیں۔ امتحان کے سنٹر میں یہ واحد مضمون ہے جس میں "ناجائز ذرائع" اختیار کرنے کا شوق بھی چراتا ہے۔ کئی بچے پکڑے بھی جاتے ہیں کیس بھی بنتے ہیں ایک آدھ سال کے لئے امتحان نہ دینے کی سزا بھی ملتی ہے اتنے جتن کرنے کے باوجود بھی انگریزی نہیں آتی اور انگریزی میں مہارت پیدا نہیں ہوتی۔ ری چیکنگ اور ری مارکنگ (Remarking) میں بھی کچھ نہیں بنتا اور اگر کچھ فرق پڑ بھی جائے تو محض دو تین نمبروں کا ہوتا ہے۔ یقین نہیں آتا کہ انگریزی اتنی مشکل زبان کیوں ہے ؟ جس طرح برصغیر میں انگریزوں نے ڈیڑھ سو سال حکومت کی اسی طرح آج کی دنیا میں انگریزی بین الاقوامی زبان بن گئی ہے جس طرح فرانسیسی زبان کو معاہدوں کی زبان کہتے ہیں اسی طرح انگریزی کو ڈپلومیسی کی زبان کہا جاتا ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ ڈپلومیسی ،سفارت کاری اور شوگر کوٹیڈ ہوتا ہے پڑھتے ہوئے خوشی ہوتی ہے اور جب پڑھ چکتے ہیں تو دکھ ہوتا ہے کہ ایسی منافقت کیا لفظوں میں بھی ہو سکتی ہے ؟ مکتوب یا ڈرافٹ اس طرح شروع ہوتا ہے۔

محترم جناب

آپ یقیناً یہ سن کر خوش ہوں گے کہ ہمارے ماہرین نے آپ کے کاغذات کو بڑے غور سے دیکھا ہے اور آپ ہمارے معیار پر پورا اترتے ہیں۔(BUT) لیکن محدود وسائل کی وجہ سے سر دست آپ کو بلانا مشکل ہے۔ آپ ہماری (Waiting List) میں موجود ہیں۔ امید

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ہے کہ آپ کا تعاون ہمارے ساتھ جاری رہے گا۔ اور آپ آئندہ بھی خط و کتابت کرتے رہیں گے۔

آپ کا مخلص

تھامس بی ڈبلیو

اس خوبصورتی کا اظہار کسی اور زبان میں ممکن نہیں۔ ڈپلومیسی اور پر لطف سفارت کاری بلکہ کاروباری مراسلات کی اور کیا مثالیں ہوں گی۔

اسی طرح انگریزی زبان کی ڈپلومیسی کی وسعت، خوبصورتی سے بہت کچھ آشکار کرنے کی صلاحیت ان دو لفظوں میں بھی موجود ہے جن میں (However) تاہم کا لفظ موجود ہے جس میں کسی شخص کے بہت کچھ کہنے کے باوجود کہا جائے کہ ابھی گنجائش باقی ہے یہ چند نکات بیان ہونے سے رہ گئے ہیں تو سننے والا اور کہنے والا اس ڈپلومیسی پر مسکرا کر رہ جاتے ہے۔

اسی طرح (Other wise) کا لفظ دوسری ڈپلومیسی کی وضاحت کرتا ہے پہلے کسی بھی شخص کی برائیاں بیان کریں پھر کرخت الفاظ میں پیش کریں اور آخر میں مطمئن ہو جائیں کہ وہ اپنے آپ کو معتبر خیال کرتا ہے [illegible] یہ محض تاثر ہے کہ وہ شخص اچھا ہے [illegible] برائیوں کے بعد ایک سچائی سے یہ حقیقت [illegible] ہے [illegible] تعریف [illegible] کے بعد [illegible] بھی پیدا ہو جاتا ہے (Other wise) [illegible] کی [illegible] ہوتی ہے۔ انگریزی [illegible] زبان [illegible] آپ [illegible] ہونے کا موقع [illegible] کسی [illegible] میٹنگ [illegible] آپ [illegible] خوبصورت انگریزی [illegible] کا موقع [illegible] آپ [illegible] معلومات [illegible] انگریزی کے چند [illegible] الفاظ [illegible] آپ کسی بھی محفل میں جب چاہیں بول سکتے ہیں [illegible] سننے والے [illegible] متاثر [illegible] آپ نے کسی [illegible] بنا لیا [illegible] آپ اپنی اردو سے خود محظوظ ہوں گے [illegible] اس کا اثر [illegible] جس نے کام کرنا چاہیں گے وہ آپ سے [illegible] آپ [illegible] گیا ہے اور آپ کو پہلی دفعہ محسوس ہوتا ہے۔ انگریزی واقعی بین الاقوامی زبان ہے اور آپ کو اپنی تعلیم پر اور ذات پر فخر کرنے پر سخت کوفت ہوتی ہے۔ آپ نے [illegible] سے چالیس سال ضائع کر دیئے۔ ہمارے اساتذہ کرام نے ہمیں تختیاں دھونے اور انہیں خشک کرنے سے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

طریقے بتائے اور وہ انگریزی سکھائی کہ جب ہم انگریزوں سے بولتے ہیں تو وہ خوش ہو کر ہمیں داد دیتے ہیں۔

(You are very innocent)

ہمیں اپنے معصوم ہونے پر ناز ہونے لگتا ہے اور انگریز بہادر ہمارے لہجہ اور الفاظ کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ بھول جاتا ہے کہ اس کی اردو بولنے کی کوشش بھی ہمیں مسکرانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ جس انگریزی پر وہ نازاں ہے وہ ہمیں معلوم ہو گئی ہے وہ صرف تین لفظوں کی مکاری اور اداکاری سے عبارت ہے بلکہ زخموں پر مرہم لگانے کے لئے ان لفظوں سے زیادہ معزوں لفظ نہیں۔

"But' However' Otherwise"

جسے یہ لفظ زبانی یاد ہو گئے وہ انگریزی کا ماہر ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

"سوری"

لفظ کہاں پیدا ہوتے ہیں اور ان کی تاثیر کب پیدا ہوتی ہے آج کی دنیا لفظوں کے درمیان اٹک گئی ہے ایک منٹ میں اس کرۂ ارض میں پانچ ارب لفظ لکھے اور بولے اور پڑھے جاتے ہیں۔ لفظوں کا ہر طرف ہجوم ہے ذرائع ابلاغ نے ہماری مختصر کائنات کو اس طرح گھیر لیا ہے جیسے کوئی طاقتور فوج کسی کمزور گاؤں کا محاصرہ کر لیتی ہے صبح سے رات گئے تک اخبارات، ریڈیو، ڈش، فلم، وی سی آر، سیٹ لائٹ، الیکٹرانک میل کی حکومت ہے کسی فلم کا عنوان تھا کہ "دن کو راج فرنگی کا اور رات کو راج ملنگی کا" لگتا ہے کوئی ایسی فلم انسان کے جہانِ صغیر میں چل رہی ہے۔ اسے فرنگی سے نہیں ابلاغ سے خطرہ ہے اس کے دل و دماغ پر کسی طاقتور حکمران کا راج نہیں بلکہ لفظوں کا عذاب ہے۔

اس مشکل لفظوں میں ایک معصوم لفظ "سوری" ہے یعنی "معاف کیجئے" اس لفظ میں جانے کیا طلسماتی تاثیر ہے کہ بسیار خرابیوں کے باوجود جونہی یہ لفظ سوری زبان سے ادا ہوا اور ہونٹوں نے اسے ابلاغ کے حوالے کیا تند و تیز جملے، جارحانہ انداز ٹھنڈے پڑ گئے۔ غصیلی آنکھوں میں شفقت چہرے کی سختیاں حلیمی کے اثر سے مسکراہٹوں میں بدل جاتی ہے۔ "سوری" نہایت پیارا لفظ ہے بڑے سے بڑے جرم میں اور بڑے سے بڑے نقصان پر سکون فراہم کرتا ہے۔ زخموں پر مرہم کا کام کرتا ہے بولنے والے کی عزت بڑھاتا ہے سننے والے کو حسنِ آداب بخشتا ہے درگزر کی فضا پیدا کرتا ہے۔ دھکا دے کر اور کیچڑ میں لت پت کرنے کے باوجود لفظ "سوری" دوسرے کو مسکرانے پر مجبور کر دیتا ہے جی چاہتا ہے کہ اس لفظ کو ہر چوک پر ہر سڑک پر ہر دکان پر آویزاں کر دیا جائے کہ آؤ ہم ایک دوسرے کو معاف کر دیں بخش دیں کر خسارے کوئی

کہتے ہیں کہ کسی جیل میں ایک بہت بڑا مجرم قید تھا اسے ہر قسم کی سزاؤں سے نوازا گیا مگر اس نے اقبالِ جرم نہ کیا جیل کا پورا عملہ عاجز آ گیا ایک دن کمانڈنگ آفیسر جیل سے معائنے کے لئے آیا اس نے سارے قیدیوں کے احوال سنے اور دیکھے اور اس مجرم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اسے کون کون سی سزا مل چکی ہے۔ سپرنٹنڈنٹ جیل نے ساری سزائیں سنا دیں اور کہا کہ اب تو کوئی سزا باقی نہیں جو اسے دی جائے۔ کمانڈنگ آفیسر نے کہا صرف ایک

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

سزا باقی رہ گئی ہے کہ اسے ''سوری'' کہہ کر فارغ کر دیا جائے۔

چنانچہ اسے بلایا گیا اور اسے کہا گیا کہ تمہیں ہم نے ناجائز جیل میں ڈالا ہم اس پر ''سوری'' کرتے ہیں وہ قیدی دھاڑیں مار مار کر رونے لگا کہ حضور یہ آپ نے مجھے کیا سزا سنا دی میں تو اس لفظ سے نا آشنا تھا یہ بڑی سزا ہے اور ہمیں اس سزا کی لاج رکھوں گا اور آئندہ لفظ سوری کہنے کا موقع نہیں دوں گا۔

لفظ ''سوری'' "SORRY" پانچ الفاظ پر مشتمل ہے اور "Five gates of knowledge" کا درجہ رکھتے ہیں پانچ انگلیاں بھی اسی سے عبارت ہے اگر ایک انگلی کسی کے لئے آپ اٹھائیں گے تو باقی تین انگلیاں سراپا ''سوری'' بن جائیں گی اور انگوٹھا خاموش تماشائی کا کردار ادا کرے گا۔

اگر ہم ایک دوسرے کو ہر وقت سوری کہتے رہیں اس سے دو نتیجے نکل سکتے ہیں ایک تو یہ غلطیوں کا ارتکاب ختم ہو جائے گا دوسرا یہ کہ پورا معاشرہ ''سوری'' سے بھر جائے گا کہ پھر یہ دیکھنا ممکن نہ ہو گا کہ غلطی کہاں ہے اور سوری کہاں ہے اور غصے سننے والا گالی بھی دے سکتا ہے کہ غلطی کے بعد سوری کرتا ہے شرم نہیں آتی۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ہم چلتے پھرتے خواب کیوں دیکھتے ہیں؟

کیا ایسا ممکن نہیں کہ ہم گھر سے باہر قدم رکھیں اور ایک نوٹوں سے بھرا ہوا بٹوہ ہمارا منتظر ہو۔ اسے اٹھانے کے لئے کوئی رکاوٹ موجود نہ ہو۔ دور دور تک کوئی آدمی دکھائی نہ دے۔ یا ایسا بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ ہماری اچانک لاٹری نکل آئے اور گھر میں بیٹھے بٹھائے ہم لاکھوں کے مالک بن جائیں۔ کوئی امیر کبیر قریبی عزیز جس کی جائیداد کا کوئی ولی وارث نہ ہو اچانک انتقال کر جائے اور ہم اس کے حقیقی وارث ٹھہرائے جائیں تو پھر زندگی کا کیا لطف ہو گا۔ اس نوعیت کے کئی ملتے جلتے خواب ہم اکثر دیکھتے ہیں۔ ان خوابوں کی کیا تعبیر ہوگی اور ان سے زندگی کی کیا تصویر بنے گی اس کا اندازہ کون لگائے گا؟ بہر حال خواب دیکھنا ہر انسان کا بنیادی حق ہے اور اس پر کسی بھی حکومت کو پابندی یا ٹیکس لگانے کا نہ آج تک نہ کوئی خیال آیا ہے اور نہ آئندہ ایسے خیال کے آنے کا امکان ہے۔ خواب کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض ایسے خواب ہیں جن کی تعبیر جلد مل جاتی ہے ان خوابوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ صبح صادق کے وقت ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ سچے خواب ہوتے ہیں ان خوابوں میں معصوم خواہشات کی تکمیل نظر آتی ہے ان خوابوں میں پوشیدہ ہمیں زندگی کے جلوے ملتے ہیں۔ اچھے کام کرنے اور اچھائی کی راہ چلنے کا اشارہ ملتا ہے۔ یہ خواب اللہ کے برگزیدہ انسانوں پر گزرتے ہیں۔ جن کے دماغ روشن اور باطن صاف ہوتے ہیں۔ وہ کسی ادھورے مشن کی تکمیل کا اشارہ پا کے خلق خدا کے لئے بھلائی کا سامان پیدا کرتے ہیں۔ کوئی پل، کوئی مسجد، کوئی کنواں (صرف پانی حاصل کرنے کے لئے) تعمیر کراتے ہیں تاکہ خلق خدا کو سکون ملے۔ ایسے خواب پیغمبروں، نیک بندوں اور بزرگوں نے دیکھے جیسے کہ ایک خواب ہم نے برصغیر میں علیحدہ وطن پاکستان کے لئے دیکھا کہ ہمارے مرشد علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء میں الہ آباد کے مقام پر ایک خواب دیکھا جس کی تعبیر نے ہمیں پاکستان دیا۔ اس کے بعد ہم نے خواب دیکھنے چھوڑ دیئے جس کی وجہ سے ہمیں وسعت نہ مل سکی اور ہم اپنے فلسفہ کو آگے نہ بڑھا سکے۔ ایک منزل ملنے تک ہمارے خواب پاکیزہ اور سچے تھے اور اب ہمارے خواب نیک شکل اختیار کرتے ہیں۔ پہلے ہمیں ملت کا مفاد عزیز تھا اور آج ہمیں اپنا مفاد عزیز ہے اور اس مفاد کو حاصل کرنے کے لئے ہم نے محنت اور کاوش کا راستہ چھوڑ کر صرف خوابوں کے سہارے ڈھونڈ لئے ہیں اور یہ خواب ہمیں

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

آگے بڑھنے کی بجائے در در خوار کر رہے ہیں۔ خود انحصاری سے محروم کر رہے ہیں۔ خود کفالت کی منزل سے محروم ہو کر بڑی طاقتوں سے اپنی ترقی کی تعبیر پوچھتے ہیں۔وہ کشتی ہی کیا جو کسی کے سہارے چلے اور وہ بھی کنارے کنارے ہواؤں کی مرضی۔ یہ کشتی کی منزل کبھی اس کنارے کبھی اس کنارے ایسے خواب ہم کیوں دیکھتے ہیں ؟ جب جسم و جان میں ہمت نہ رہے جب خون جگر سے کمانے کی بجائے محض سہانے خوابوں کے سہارے ڈھونڈ لیں اور دن کو خواب دیکھیں حالانکہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو رات کو بھی خواب نہیں دیکھتے بلکہ ساری رات تاروں میں ہونے والی سرگوشیاں سنتے ہیں۔ کائنات کے راز جاننے کی کوشش کرتے ہیں اور بڑے دعوی سے کہتے ہیں کہ آؤ ہم تمہیں بتائیں کہ رات بھر کیا ہوا۔

ہم سے سنیئے تو ستاروں کی کہانی سنیئے
خواب کی بات کرے وہ جسے نیند آئی ہو

لیکن ایسے لوگ بھی دیکھے جو ہمیشہ اپنی آنکھوں میں خوابوں کو پالتے ہیں۔ آنے والے لمحوں کو اپنی آنکھوں میں سجاتے ہیں اور ایک ایسے جہان کی باتیں کرتے ہیں جس کا لمحہ موجود میں امکان نہیں ہوتا۔ کچھ خواب ترقی کے اس پہیئے کو آگے کی منزل بتاتے ہیں جس کا وجود ظاہراً موجود نہیں ہوتا۔ یہ خواب فلسفیوں اور دانشوروں کے ہوتے ہیں لیکن عام لوگوں کے خواب غریبانا انداز کے ہوتے ہیں۔ جس میں چھوٹی چھوٹی پوشیدہ خواہشوں کا اظہار ہوتا ہے۔ مثلاً ہمارے گھر میں اچانک رنگین ٹی وی آجائے ،وی سی آر کوئی مفت دے جائے ، کوئی ایسا مہربان مل جائے جو کہے ایک تعمیر شدہ عالی شان کوٹھی میں آپ کو مفت دینا چاہتا ہوں یا حکومت مہربان ہو جائے اور کسی بڑے خالی عہدہ پر تعینات کر دے یا کسی خالی ہونے والے عہدے پر نامزدگی کا اعلان کر دے۔ ایسے خوابوں کے بارے بڑے بڑے ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ جب ہاضمہ درست نہ ہو معدے میں گرانی ہو یا بسیار خوری کی ہو تو ایسے خواب قطار اندر قطار اترتے ہیں۔ زندگی ایک مقتدر روحانی شخصیت ایسے ہی خوابوں کے لئے مشہور ہے۔ اکثریت کا خیال ہے کہ وہ بسیار خوری کرتے ہیں۔ جی بھر کر کئی ڈشیں کھا جاتے ہیں اور ڈکار بھی مشکل لیتے ہیں تو ایسے خواب ان پر پیش گوئی کی صورت میں اترتے ہیں۔ شاذو نادر ہی ان کی کوئی تعبیر نکلتی ہو لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ ان کی وجہ سے بہت مشہور ہیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ملتان کی سہ پہر دو پہر سے زیادہ گرم ہوتی ہے

شمس اور شمسی توانائی

سہ پہر دو پہر سے زیادہ گرم ہوتی ہے یہ محکمہ موسمیات والوں کا خیال ہے۔ اس سے پہلے علم جغرافیہ کے ماہرین ایسی باتیں کرتے تھے اب علم جغرافیہ آہستہ آہستہ معدوم ہو گیا ہے اور اس کے طالب علم یا تو موسمیات کے شعبے میں چلے گئے یا زیادہ باشعور ہوئے تو شعبہ جیالوجی (ارضیات) میں داخلہ لے لیا، یا مرکز کی کسی درس گاہ کے قریب ہونے کی وجہ سے Sciences of Earth کے طالب علم کہلانے پر فخر کرنے لگے۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ شعبہ کوئی بھی ہو سہ پہر دو پہر سے زیادہ گرم ہوتی ہے اور خوش نصیب وہ لوگ ہیں جو اس لذت سے محظوظ ہوتے ہیں اور اس قدر محظوظ ہوتے ہیں کہ انہیں یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ سہ پہر گرم ہے یا صبح۔ رات گرم ہے یا دن، جاہ و جلال کی علامت ہے۔ جتنی سہ پہر ملتان کی گرم ہے اس پر تحقیق کے انبار لگ جاتے۔ کوئی اس کی صبح کو موضوع بناتا کوئی دوپہر پر تحقیق کرتا اور کوئی شام کو اتنی تحقیق فراہم کرتا کہ مغربی دنیا کے لوگ ترستے کہ چلو ملتان چلو جہاں گرمی چوبیس گھنٹے رہتی ہے جس کی صبح جس کی دوپہر، جس کی سہ پہر اور شام اور پھر رات ایک جیسی ہے ملتان اس اعتبار سے خوش نصیب ہے کہ یہاں ہمیشہ ایک ہی موسم رہتا ہے یعنی گرمی کا۔ اگر سردی آبھی جائے تو پھر بھی گرمی اپنا وجود منا لیتی ہے موسمِ بہار بھی اپنے اندر گرمی جیسی تلخی ضرور رکھتا ہے گویا ملتان گرمی کے معاملے میں خود کفیل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر اچانک بادل آجائیں اور دو تین دن مسلسل بارش ہو جائے تو ملتان کی مسجدوں کی اذانیں، دعائیں شروع ہو جاتی ہیں کہ اے خدا ہمیں سردی سے بچا اور ہمیں گرمی عطا کر یہ گرمی موسم کی تو ہے ہی، یہاں گرمی گفتار بھی شامل ہے۔ یہاں کے شاعر، ادیب، صحافی اتنے زوردار ہیں کہ ان کے کلام سے اور ان کے بیان سے کوئی متاثر ہوئے بغیر رہ نہیں سکتا۔ ان کے افکار میں حضرت شاہ شمسؒ، حضرت شاہ یوسف گردیزؒ، حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ، حضرت شاہ رکنِ عالمؒ کے حسن و کمال اور جاہ و جلال کا عکس بھی دکھائی دیتا ہے۔ ان بزرگوں کے مقابر پر صبح، دوپہر، شام گرمی کا احساس نہیں ہوتا کیونکہ ان کی تعلیمات ہی گرمی کردار کا سامان فراہم

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کرتی ہیں اور یہ گرمی موسم کی گرمی سے برتر ہوتی ہے۔

ملتان پورے جنوبی پنجاب کو وہ خطہ ہے جس نے گرمی کی قوت سے وہ کمالات دکھائے ہیں جن کی وجہ سے وطن عزیز ترقی کی راہوں پر گامزن ہے۔ گندم، کاٹن، چاول، مکئی، جوار، گنا، آم، کھجور، انار، کنو انہی گرمیوں کا وہ تحفہ ہے جو پورے ملک میں اور باہر کی دنیا میں ملتان کی پہچان بھی ہیں اور زرمبادلہ کے حصول کا ذریعہ بھی جس طرح ملتان کے مضافات سے آنے والے پھل، اناج ٹرانسپورٹ کی مناسب سہولت نہ ہونے کی وجہ سے منڈیوں تک پوری تعداد اور مقدار میں نہیں پہنچ پاتے اور ملک کثیر سرمایہ سے محروم ہو جاتا ہے اسی طرح ملتان شمسی توانائی سے روزبارروز محروم ہوتا جا رہا ہے۔ سورج کی اتنی گرمی کی مناسب پراجیکٹ میں شامل نہیں ہوتی وگرنہ اس سے نا جانے کتنے کارخانے دفاتر، ادارے اور تعمیراتی منصوبے مکمل ہو جاتے ہیں۔ مگر پورے جنوبی پنجاب میں ایک بھی شمسی توانائی "سولر انرجی" کا پروجیکٹ موجود نہیں۔ اچھے وقتوں میں موج گڑھ چوستان میں سولر انرجی کا مرکز قائم کیا گیا تھا مگر نا مناسب دیکھ بھال کی وجہ سے وہ موج گڑھ کی تاریخی آثار کی طرح بذات خود تاریخی مرکز بن گیا ہے سولر انرجی فراہم کرنے کی بجائے سولر انرجی سے محفوظ ہونے والا ادارہ بن گیا ہے۔ ملتان کے لوگوں کو یہ گرمی اتنی عزیز ہے کہ مجال ہے کہ وہ اس کو دور کرنے کی ذرا سی بھی کوشش کریں۔ کوئی درخت کوئی فوارہ اگرچہ چھ فوارے موجود ہیں مثلاً (چوک فوارہ ابدالی روڈ پر) مگر چلتے نہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ ٹھنڈک کا سماں پیدا ہو جائے ہم گرمی کو ہر طرح عزیز رکھتے ہیں یہاں دنیا حیران ہے کہ ملتان میں اتنی گرمی ہے اور پھر بھی لوگ خوش ہیں۔ بہت سے لوگ اسلام آباد اور دیگر سرد خطوں سے آتے ہیں اور ملتان والوں کو داد دیتے ہیں کہ گرمی کو برداشت کرنے کا یہ اہتمام قابل ذکر ہے۔

جب کسی خطے کی گرمی کسی کام میں یا پروجیکٹ میں استعمال نہ ہو اور پوری کی پوری ضائع ہو جائے اور اس پر کسی کو افسوس بھی نہ ہو تو ایسے موقعوں پر ایسے محاورے استعمال ہوتے ہیں کہ

سہ پہر دوپہر سے زیادہ گرم ہوتی ہے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

لفظ تاثیر سے کب محروم ہوتے ہیں

جب کسی درخت کی ٹہنیوں پر شہد سے خالی چھتہ نظر آئے وہ اس قدر سوکھ گیا ہو کہ اس میں سے موم کی خاصیت بھی ختم ہو جائے تو سمجھ لیجئے کہ لفظ بھی اس طرح تاثیر سے محروم ہو جاتے ہیں جس طرح نمک میں سے نمکینی ختم ہو جائے احسانوں کا بدلہ ناقدری، مہربانی کا صلہ بے مروتی عمر بھر جس دستر خوان کے نعمے کھانے میں لطف اٹھایا ہو اسی دستر خوان پر طرح طرح کی باتیں کرنے والا جب آپ کو ملے تو یقین کر لینا کہ لفظ تاثیر سے محروم ہو گئے ہیں اور لفظوں کی حرمت کو زوال دینے والا شخص آپ کے سامنے ہیں۔ ایسا کیوں ہوا ہے کچھ لوگ اسے مادہ پرستی کی دوڑ کہتے ہیں جب یہ اندھی دوڑ شروع ہو جائے تو اخلاق، شرافت اور انسانیت کے اجزاء منتشر ہو جاتے ہیں انسان اپنی ذات کے خول میں ایسا بند ہو جاتا ہے کہ اسے وہ سب لوگ اجنبی لگتے ہیں جنہوں نے اس کے ساتھ برسہابرس کام کیا ہو۔ اور اس شخص کو جو اس شہر میں اجنبی تھا جسے لکھنا پڑھنا نہ آتا ہو اسے لکھنا پڑھنا سکھایا گیا ہو پھر وہی شخص اس قلم سے اسی روشنائی سے اور اسی فکر اور ورق سے اپنے محسن کو لیرہ لیرہ کرنے کی ٹھان لے۔ یعنی اسی طرح جس طرح کوئی استاد اپنے شاگرد کو تمام ہنر سکھادے اور وہ شاگرد استاد کے سامنے کمر ٹھونک کر کھڑا ہو جائے۔ یا اسی طرح جس طرح کوئی مالک مکان کسی کو اپنی دکان یا مکان کرایہ پر دے اور وہ کرایہ دار لوگوں کو یہ کہتا پھرے کہ میں کرایہ دار نہیں مالک ہوں۔ مالک مکان یا دکان میں ہمت ہے تو مجھے اٹھا کر دکھادے اور واقعی مالک مکان بے بس ہو جاتا ہے جب کرایہ دار Stay Order لے آتا ہے اور پھر عدالتوں کے پھیرے دعویٰ اور جواب دعویٰ کی تحلیلیں تنقیبات اور نہ جانے کیا کیا مراحل پیش آتے ہیں اور آدمی زچ ہو جاتا ہے اور پچھتاتا ہے کہ میں نے مکان یا دکان دینے کی غلطی کیوں کی؟ لیکن اس وقت پانی سر سے گزر چکا ہوتا ہے۔

اسی طرح ایک حساس شاعر اپنے شاگرد کو شاعری کے رموز، آداب و وزن سے آگاہ کرتا ہے وہی شاگرد چند دنوں کے بعد اپنے استاد کے خلاف بجو لئے محفلوں میں گھوم رہا ہوتا ہے استاد شاعر پر کیا گزرتی ہے کاش اس ناہموار کو کوئی بتائے کہ تم نے کتنے حساس دلوں کی آرزوں کو توڑا ہے کتنی امنگوں کا خون کیا ہے اور اسی تننے کے خلاف بغاوت کی ہے جس کی

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

طاقت سے شاخوں کا وجود قائم ہے شاخ کیسے تنے کے خلاف بغاوت کر سکتی ہے اگر وہ نہیں کر سکتی تو پھر شاگرد کس طرح اپنے استاد کے خلاف محاذ بنا سکتا ہے اس طرح ادارے کے پرانے ملازم کو اپنے مالک کے خلاف چھپ لکھتے ہوئے اور چھپتے ہوئے احساس ہونا چاہئے کہ اس مالک کے خلاف لکھتے ہوئے اسے یہ کیوں بھول گیا کہ وہ کل تک اسی کے رحم و کرم پر تھا۔ اسی کے خوان نعمت سے لقمے اٹھا اٹھا کر کھاتا رہا ہے رشتوں کو اس قدر کمزور اور بے بس نہیں ہونا چاہئے مگر کیا کیا جائے۔ کوئی چیز بھی تو خالص نہیں رہی۔ ہر چیز میں ملاوٹ اور ہر چیز نمبر دو بلکہ نمبر تین ہو کر رہ گئی ہے اس لئے ایسے جھٹکے برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ چھپ ایسے مہربان آج بھی معاشرے میں موجود ہیں جو میزبان کا پورا گھر رات کو صاف کر دیتے ہیں چھپ مہربان ایسے بھی ہیں جو چادر زیرہ اور دیگ اویں چرا لیتے ہیں۔ ہماری اشیاء تو کسی شمار و قطار میں نہیں آتیں۔ ایسا لوگ کیوں کرتے ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں انسان معاشرے میں غائب ہو جائے اور اس کی جگہ ابن الوقتی رہ گئی ہو۔ خود غرضی، وقت پرستی کا راج رہ جائے اور عدل کے وہ معیار کہ "لوگو جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگے تو انصاف سے فیصلہ کرو۔" اللہ تمہیں بہت خوب نصیحت کرتا ہے اور بے شک خدا سنتا اور دیکھتا ہے وہ ہمارے کیسے گم ہو گیا۔ کسی فرد کی یا کسی ادارے کی معمولی سی چیز گم ہو جائے تو انکوائریاں بے بیٹھتی ہیں۔ کاروائی ہوتی ہے اور ایک پورے معاشرے کا جذبہ احسان مندی گم ہو جائے تو کسی کو کانوں کان خبر ہی نہ ہو۔ اور ہماری آنکھوں میں کسی انسانی بستی کی بجائے ایک ایسے جنگل کی طرف چلی جائے جہاں درندے رہتے ہوں اور وہ کسی ایسے لفظ سے آشنا نہ ہوں جو انسان کی توقیر بڑھاتے ہیں۔

ہمارے ذہن پر چھائے ہیں حرص کے سائے
جو ہم محسوس کرتے ہیں وہی تحریر کرتے ہیں
بنے پھرتے ہیں چھ ایسے بھی شاعر اس زمانے میں
نہ غالب کی کرتے ہیں نہ ذکر میر کرتے ہیں

بڑی حیران کن بات ہے کہ جو زندگی بھر کسی ایک کو چائے کا کپ بھی پیش نہ کر سکے لیکن جب بات کرتے ہیں تو بڑے بڑے واقعہ کو اور بڑے سے بڑے اجتماع کو اس طرح لا دیتے ہیں جیسے یہ ان کی بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ لیکن قدرت انہیں ایسے کام کرنے کی توفیق نہیں دیتی وہ

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

محض زبانی تنقید کر سکتے ہیں خاک اڑا سکتے ہیں لیکن کوئی بھی خاک اُڑانے والے سوچ لے کہ لفظ اس کے پاس امانت ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو؟ یہ یہی لفظ اس کے سفید کپڑوں پر ایسے گریں کہ کوئی پاؤڈر اس خرابی کو دور نہ کر سکے۔ اتنی منافرتیں نہ پھیلائیں کہ لوگ آپس میں دست و گریباں ہو جائیں اتنی مکروہ تحریریں نہ لکھیں کہ لوگ ان کی آخری عمر پر تھوک دیں کہ تم نے عمر بھر کیا کمایا ہے اور کیا کھایا ہے۔ زندگی وابستگی سے عبارت ہے۔ کچھ لوگ اپنے دوستوں عزیزوں سے ایسے تعلق نبھاتے ہیں کہ پہچان کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کون کس کا بھائی تھا اور کون کس پر جاں نثار کرتا تھا۔ لیکن آج کے عہد کی نوبت یہ ہے کہ بیس بیس سال ایک ادارے میں گزرنے کے بعد لوگ اس طرح جدا ہوتے ہیں کہ ساری تحریریں جو انہوں نے اپنے مالک کے حق میں لکھی ہوتی ہیں باقی عمر ان تحریروں کی تردید میں گزار دیتے ہیں ایسے ہی جیسے مرحوم مولانا کوثر نیازی نے اپنی کتاب "دیدہ ور" اپنے آقا کے فضائل میں لکھی اور بعد میں اس کتاب کے ایک ایک حصے کی تردید کرنے میں زندگی گزار دی۔ آج ہماری صحافتی تاریخ بھی ایسے ہی صحافیوں سے بھری پڑی ہے جو آج ایک اخبار سے نکل کر دوسرے اخبار میں اور دوسرے سے تیسرے اخبار میں اپنے مضمون اپنے فیچر اپنے کالم کے ساتھ پہنچ جاتے ہیں اور پھر ساری تحریریں اپنی سابقہ تحریروں کی تردید میں گزار دیتے ہیں اور اس طرح وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اعلیٰ صحافت کو فروغ دے رہے ہیں حالانکہ ایک زمانہ ان کی ایک حرکتوں پر ہنس رہا ہوتا ہے اور مرنے کے بعد تاریخ صحافت ان کے ذکر سے محروم ہوتی ہے اس لئے نہیں کہ وہ صحافی نہ تھے اس لئے نہیں کہ انہوں نے کسی اخبار میں کام نہیں کیا تھا بلکہ اس لئے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لفظ اپنی تاثیر کھو گئے ہیں جن کے پاس الفاظ تو ہیں مگر معنی نہیں۔ وہ ایسے ہیں جیسے کسی درخت کی ٹہنی پر شہد کا خالی چھتہ رہ گیا ہو اور شہد غائب ہو۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

نشتر کالج ایک اور عبدالرب نشتر کا منتظر ہے

ملتان کی تہذیبی پہچان کے دو نشان ہیں۔ ایک تو یہ ہے جو صدیوں سے مشہور ہے کہ ارضِ ملتان قدسی صفات ہستیوں کی جلوہ گاہ ہے روحانیت اور تجلیات کا یہ عالم ہے کہ فرشتے یہاں سر بسجود ہیں۔ "ملتان ما" جنتوں اپنائیتوں کا اظہار ہے۔

ملتان ما بجنت اعلیٰ برابر است
آہستہ پا بنہ کہ ملک سجدہ می کنند

دوسری پہچان وہی ہے جسے چہار چیز از تحفہ ملتان کہتے ہیں یعنی ملتان اپنی انفرادیت رکھتا ہے۔ اپنی تہذیب سے جدا خد و خال کا شہر ہے۔ یہاں کے افراد انسان دوستی، شرافت اور وضعداری کے امین ہیں۔ پرانی وضعداریوں کو اس طرح نبھاتے ہیں جیسے کوئی بڑے بزرگ کو سنبھال سنبھال کر رکھتا ہو۔ یعنی کوئی ضائع نہ ہو جائے۔ ان چہار تحفوں کا ذکر اس تواتر سے کیا جاتا ہے کہ ملتان سے پہچانے ہیں جانے والے۔ ممکن ہے عقیدت سے کہا ہو۔ سننے والے اسے ملتان کی شکایت سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ہم اسے اپنا تعارف خیال کرتے ہیں۔ ہمیں گرد سے لگاؤ ہے اس میں روحانیت کا سرمہ شامل ہے۔ ہمیں گرمی سے پیار ہے کہ ہمارے بقاء کی علامت ہے۔ ہمیں گداؤں سے محبت ہے کہ یہ گدائے اولیائے عظام ہیں۔ ہمیں قبرستان سے لگاؤ ہے کہ یہ آخرت کی نشانی ہیں۔ یہ چاروں تحفے ملتان کو رموز زندگی سے آشنا کرتے ہیں۔ جبکہ اہلِ مغرب بیماری سمجھتے ہیں۔ Dust Heat Beggars Grave Yards گرد و گرما، گدا و گورستان ملتان کی چار معروف پہچان ہیں۔ جو شہر اولیاء کی نشانیاں ہیں۔ زندگی سے آشنا ہونے کی شرطیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ہر صاحب دل ان کو پا سکتا ہے۔ کوئی نبھانے کو تیار نہیں۔ اس لئے کہ یہ روحانی سرمایہ جتنا گہرا ہے اتنا انسانی فرق کا باعث بنے گا۔ کارپوریشن کا عملہ اس سرمایہ کی ارزانی کو دیکھتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔

گرمی الحمدللہ ۹۳۰۵ درجہ حرارت کو ملتان صدیوں سے قائم رکھنے میں کامیاب رہا ہے۔ معمولی معمولی لوگوں کا ذکر آتے ہی آف شدہ میں بیمار ہو جاتا ہے۔ ملتان جو صدیوں سے درجہ حرارت کی بلندیوں پر رہا ہے اس کا یہ فخر ہونا چاہئے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

گدا، یہ بھی نمایاں صفت ہے لوگ آزادی کی بات کرتے ہیں کہ ہمیں تحریر و تقریر کی آزادی چاہئے وہ ملتان کے گداؤں سے یہ حاصل کریں۔ انہیں ایسی آزادی حاصل ہے کہ جس کا کپڑا دامن جس طرح کھینچ سکتے ہیں کھینچ لیتے ہیں اور جو چیز چاہیں حاصل کر لیتے ہیں۔

گورستان، البتہ گورستان کا معاملہ انحطاط پذیر ہے۔ بہت سے قبرستانوں پر کئی سڑکیں بن گئی ہیں جن میں حسن پروانہ روڈ چونگی نمبر ۸ قبرستانوں کو کاٹ کر سڑکیں تعمیر ہوئی ہیں اسی جذبہ کو دیکھ کر بعض لوگوں نے بھی قبرستان پر دکانیں پلازے اور گھر بنائے ہیں۔ پہلے لوگ قبرستانوں سے ڈرتے تھے اب جدید ضرورتوں نے زندوں اور مردوں کو اکٹھے ایک گھر ایک مکان میں رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔

ملتان کی دوسری بڑی پہچان درج ذیل شعر ہے۔

گر شوی بیمار ہرگز کس نی پرسد ترا
شہر نا پرساں کہ میگویند ملتان یا قسم

اگر آپ کبھی بیمار پڑ جائیں تو اہلِ ملتان سے یہ توقع نہ رکھیں کہ وہ آپ کو پوچھنے آئیں گے۔ مقصود یہ تھا کہ ملتان کے لوگ شاید کم بیمار ہوتے ہیں۔ اس لئے مزاج پرسی کا معاملہ پیش نہیں آتا۔ ایک دوسرے کی مزاج پرسی اور تیمار داری سے آشنا کرنے کے لئے درد دل رکھنے والے پنجاب کے گورنر سردار عبدالرب نشتر نے (کروٹ کروٹ انہیں قبر میں راحت ملے) اکتوبر ۱۹۵۱ء کو نشتر میڈیکل کالج کا آغاز کیا۔ اسے پنجاب کا تیسرا کالج اور پاکستان کا چھٹا کالج کہلانے کا شرف ملا بعد میں اسے ایشیاء کا بہترین میڈیکل کالج قرار دیا گیا۔ اس کی ساری عمارت میں آپ گھوم پھر لیں آپ کو بارش کا ایک قطرہ نہیں ملے گا۔ کہیں دھوپ نہیں لگے گی۔ ساری عمارت دوسری عمارت سے متصل ہے۔ اس مربوط اور مضبوط طریقے سے تعمیر ہوئی ہے کہ اس کے ستون اس کے دروازے، اس کی عمارتیں ان معماروں کی ہنر مندی کی مرہون منت ہیں ان کے سوز دل اور جذبہ ایمانی سے عبارت ہیں۔ نشتر میڈیکل کالج ملتان ۔۔۔ ڈاکٹروں، طالبِ علموں نے پوری دنیا میں ایک نام اور ایک مقام بنایا ہے اس کے بانی ڈاکٹر محمد جمال بھٹہ جو اپنی ذات میں تحریک، ایک مشن، ایک قوت متحرکہ تھے ایسے جذبوں کے لوگ، ایسے رفعتوں کے علمبردار اور ایسے مقاصد سے آگاہ لوگ اب خال خال رہ گئے ہیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ڈاکٹر محمد جمال بھٹہ نظریہ پاکستان اور مقاصد ''نوائے وقت'' سے آگاہ انسان تھے۔ انہوں نے ان سرچشموں سے فیض پایا اور اسی فیض کو نشتر میڈیکل کالج ملتان کے سنگ و خشت کے ایسے جذبوں سے ڈھالا کہ آج نشتر میڈیکل کالج رفعتوں اور عظمتوں کی علامت ہے۔ جو ملتان سے بلوچستان سکھر اور ڈیرہ اسماعیل خان تک اپنی طبی خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ مجبور، بے بس انسانیت کی شفایابی میں اس ادارے کا کردار بے مثال ہے۔ اگرچہ ادارے کے ارد گرد چھ مرکزی ادارے موجود میں آگئے ہیں جو نشتر میڈیکل کالج اور ہسپتال کے نئے ادوار کے نام کے لئے کسی وقت بھی مسئلہ بن سکتے ہیں۔ اس کے بارے میں سوچنا موجودہ پرنسپل صاحب کی ذمہ داری ہے یا میڈیکل سپرنٹنڈنٹ صاحب کی کہ ادارے کے تشخص اور وقار کے راستے میں اگر کہیں کوئی کانٹے ہیں تو انہیں دور کیا جائے اور اس روح کو زندہ رکھا جائے جو اس ادارے کے مرکزی وجود کا حصہ ہے۔

اکثر خیال ذہن میں آتا ہے کہ ایک پنجاب کے گورنر، شاعر، ادیب اور تحریک پاکستان کے نامور سپوت جناب عبدالرب نشتر مرحوم نے ۱۹۵۱ء میں ایک ہسپتال اور میڈیکل کالج کا اضافہ ملتان میں کیا اور جو توقع قائم کی وہ اس ادارے سے پوری ہوئی اس کے بعد کتنے گورنر یہ منسٹر یہ گورنر ''آئے'' آئے لیکن نشتر میڈیکل کالج کے بارے میں کسی نے نہ سوچا اور پوچھا کیا کہ اس عظیم الشان ادارے کو کتنے نئے جدید یونٹ چاہئیں۔ کتنے ساز و سامان کی ضرورت ہے اور کتنے اچھے ڈاکٹر اس کے لئے ضروری ہیں کتنی ادویات سٹور میں موجود ہونی چاہئیں۔ اس کے وارڈوں میں صفائی اور بہتری کے کیا اقدامات ضروری ہیں۔ اس عرصہ میں لاہور کے اندر کئی نئے ہسپتال کھل گئے۔ علامہ اقبال میڈیکل کالج کا ہسپتال، سروسز ہسپتال، جناح ہسپتال، میاں محمد منشی ہسپتال، گلاب دیوی اور سر گنگا رام ہسپتال تو پہلے سے موجود تھے اور میو ہسپتال کا نام تو پورے برصغیر میں مشہور ہے۔ جس طرح لاہور کی آبادی بڑھتی اسی طرح ملتان اور اس کے مضافات کی آبادی بڑھتی ہے۔ ملتان ۱۹۵۱ء کے Status قائم ہے اور دوسرے شہر ۱۹۹۰ء کے دور میں داخل ہو گئے ہیں۔ ملتان کے مریضوں کی تعداد جس تیزی سے بڑھی ہے اس تیزی سے علاج معالجہ کی سہولتیں نہیں بڑھیں۔ آج بھی آدھے مریض نشتر میڈیکل کے ہسپتال کے دالان میں چٹائیوں پر لیٹے ہوئے ہیں اور آدھے خوش نصیب ہسپتال کے اندر ہوتے ہیں۔ حالت دونوں کی ایک جیسی ہوتی ہے۔ ایک کو کھلی ہوا ملتی ہے اور

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

دوسروں کو پنکھے کی ہوا۔ جس میں حبس اور مخصوص "بو" شامل ہوتی ہے۔ ملتان خوش نصیب خطہ ہے جسے دو وزارتیں نصیب ہوئی ہیں اور دونوں کا تعلق صحت سے ہے۔ دونوں وزیر نوجوان، باصلاحیت اور کچھ کر دکھانے والے ہیں۔ اس لئے حافظ محمد اقبال خاکوانی اور مخدوم محمد جاوید ہاشمی کے لئے پہلا ایجنڈا یہی ہے کہ وہ نشتر میڈیکل کالج اور ہسپتال کو فوری توجہ دیں۔ پنجاب کے گورنر جناب شاہد حامد وزیر اعلیٰ پنجاب، میاں شہباز شریف وزیر اعظم پاکستان، میاں محمد نواز شریف جہاں دیگر شعبوں میں تعمیر و ترقی اور اصلاحات کو ترجیحی بنیادوں پر نبٹا رہے ہیں وہاں نشتر میڈیکل کالج ملتان جس کی ۴۶ سالہ خدمات اور کردار اس بات کا متقاضی ہے کہ اسے ملک بھر میں میڈیکل یونیورسٹی کا درجہ دیا جائے۔

۱۹۵۱ء سے لے کر ۱۹۹۷ء تک کے اس عرصہ میں اس کالج کو کوئی اچھی خبر کوئی اچھا تحفہ نہیں ملا۔ چھوٹی چھوٹی خوش خبریاں ملی ہیں۔ لیکن وہ بھی ابھی ابھی تعبیر کی مرحلہ میں ہیں۔ یہ کالج اس بطل جلیل کے اس مشن کی تکمیل چاہتا ہے جو آج سے ۴۶ سال قبل سردار عبدالرب نشتر نے شروع کیا تھا۔ یہ کالج ایک ایسے عبدالرب نشتر کا منتظر ہے جو اسے واقعی ایشاء کا عظیم کالج اور ہسپتال بنا دے۔ عبدالرب نشتر مسلم لیگ کے عظیم رہنما تھے اور آج مسلم لیگ کی حکومت ہے یقیناً سربراہ مسلم لیگ جو وزیر اعظم پاکستان بھی ہیں اس ادارے کو مسلم لیگ کی امنگوں اور آرزوں کا مرکز بنا دے گا۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

پھول توڑنا منع ہے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

شعور حاصل کریں گے۔ کتنے بے بس، پریشان، اداس لوگ دفتروں کے باہر دھکے کھا رہے ہوتے ہیں ان کے معمولی کام نہیں ہوتے ایک واپڈا کا بل درست نہیں ہوتا اوپر سے بل ادا نہ کرنے کی صورت میں بجلی کٹ جاتی ہے حالانکہ بل ادا ہوتا ہے۔

جو تیری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

دفتری نظام میں کبھی فائل نہیں ہوتی۔ کبھی فائل کا پیٹ نہیں بھرا جاتا کبھی صاحب کے دستخط ہونے باقی ہیں اور کبھی فائل متعلقہ اہلکار کے پاس ہے جو دو ہفتے کی چھٹی پر ہے جب آئے گا تو فائل کو ہاتھ لگائے گا یعنی فائل کوئی مقدس کتاب بن جاتی ہے کہ جس کی زیارت کے لئے ہر وقت نذرانہ مطلوب ہے ورنہ فائل کے صفحات کم بھی ہو سکتے ہیں صفحے مسخ بھی ہو سکتے ہیں مسائل خوف و ہراس کی صورت میں فائل اور فائل سے متعلقہ عملہ کے درمیان ایک سوالیہ نشان بن جاتا ہے۔

ہمارے مضامین ہمارے تجزیے ایک فلاحی معاشرہ کی تشکیل کی آرزوں تک محدود ہوتے ہیں عملہ کیا ہوتا ہے کاش اس کی اصلاح آہنی ہاتھ سے ہو ویسے تو آج تک یہ بھی نہیں معلوم ہو سکا کہ آہنی ہاتھ کیا ہوتا ہے اس کا استعمال اخباروں کی خبروں میں بہت نمایاں ہوتا ہے کہ مجرموں سے قانون شکنوں سے آہنی ہاتھ سے نبٹا جائے گا اور ایسے محسوس ہوتا ہے کہ اب کوئی مجرم باقی نہیں رہے گا۔ پھر یہ آہنی ہاتھ کمزور ہو جاتا ہے اور مجرم عین سڑک پر پوری طاقت اور حماقت سے موجود ہوتا ہے ہم نظام کی بہتری سیاسی استحکام' لیڈروں اور حکومت پر بڑی تنقید کرتے ہیں افسران پر بھی اپنا غصہ نکالتے ہیں لیکن بات سوچنے کی یہ ہے کہ ہم نے اپنے فرائض کب سرانجام دیئے ہیں؟ صرف ہمیں گلہ کرنا آتا ہے دوسروں پر غصہ نکالنا آتا ہے ہر فرد اور ہر ادارے پر گز بھر کی زبان سے چیخنا آتا ہے ہم نے معاشرہ میں کیا کردار ادا کیا ہے۔ صرف کوڑا کرکٹ کو دیکھ لیں ہم اپنا کوڑا کرکٹ اٹھا کر ہمسائے کی چوکھٹ کے پاس پھینک دیتے ہیں مردہ بلی اور چوہے دوسرے کے گھر کی طرف سرکا دیتے ہیں اور اکثر یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی کالے بکرے کی سری عین سڑک کے درمیان رکھ دیتے ہیں جو اس سڑک سے گزرے گا دنیا بھر کی بلائیں اسے چمٹ جائیں گی۔ کیا کیا ٹونے اور کیا کیا حربے ہم دوسروں کو اذیت دینے کے لئے تلاش نہیں کرتے اور پھر باتیں عالمی بنک' افراط زر اور عالمی نظاموں کی کساد بازاری پر کرتے ہیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

بڑی طاقتوں اور عالمی نظام سے مضمرات کی باتیں کرنے والے بتائیں کہ یہ کس آرڈر میں لکھا ہے کہ آپ سرخ بتی کی صورت میں ٹریفک کراس کر جائیں تیز رفتاری سے دوسرے کو دھکا دے جائیں سڑک پر چلتے ہوئے ارد گرد سے بے پرواہ چلیں اور اگر کچھ ہو جائے تو گاڑی والے کا جینا حرام کر دیں کہ اندھے ہو گاڑی چلانا نہیں آتا کس طرح سڑک پر نکل آئے ہو۔ کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ حضور آپ کا کوئی قصور ہے یا نہیں۔

کہنے کو تو ہم نے ٹریفک کے اشارے لگا رکھے ہیں لیکن عمل کون کرتا ہے ہسپتال کے قریب ہارن بجانا منع ہے ورنہ یہیں بے ہنگم ہارن بج رہا ہوتا ہے اونچی آواز میں ٹیپ چلانا منع ہے مجال ہے کہ آپ کسی کو روک کر دیکھیں وہ کس طرح آپ کے گلے کا ہار بنتا ہے۔ یہاں پارکنگ منع ہے اور پھر اس کی خلاف ورزی بھی دیکھیں۔ کسی باغ کسی پارک میں چلے جائیں جگہ جگہ لکھا ہوتا ہے کہ پھول توڑنا منع ہے اور اسی بورڈ کے نیچے بڑے دھڑلے سے آپ کو گلدستے بنتے نظر آئیں گے نئے وزیر کی تقرری ہوتی ہے اس خوشی میں یہ گلدستہ نہیں جلوس میں پیش کرنا ہے اگر ایسا کرنا ہے تو پھر پھول توڑنا منع کیوں ہے؟

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ملتان کی گل گشت کالونی

ویسے تو ملتان کا ہر گوشہ' ہر کونہ علم و ہنر کا آئینہ دار ہے لیکن جو شرف گل گشت کالونی کو حاصل ہے وہ شہر کے کسی اور حصے کو نصیب نہیں۔ خواندگی کے اعتبار سے یہ حصہ سو فیصد نہ سہی لیکن اسی فیصد سے کم نہیں ہو گا۔ اس کالونی کے وسط میں ایمرسن کالج ملتان کی ترقی یافتہ ارتقائی شکل گورنمنٹ کالج برائے بوسن روڈ موجود ہے اسی حصے میں گورنمنٹ سائنس کالج ہے اس کے ساتھ کمپری ہینسو ہائی سکول واقع ہے ان کے درمیان گورنمنٹ کالج برائے ایجوکیشن ان سے ہوسٹل' ڈائریکٹر کالجز کے دفاتر موجود ہیں کالونی کے اندر کمپر ہینسو گرلز ہائی سکول بھی اپنے عزوو قار کے ساتھ تعلیمی خدمات دے رہا ہے۔ پھر انہیں اداروں کے درمیان بورڈ آف انٹر میڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن موجود ہے اس کے علاوہ ان گنت تعلیمی ادارے فلاحی رفاہی مرکز کام کر رہے ہیں۔ اسی کالونی کے آغاز میں جدید تعلیم جن میں ایم بی اے' کمپیوٹر کی تعلیم کا بندوبست بھی موجود ہے اسی کالونی میں نامور شاعر' ادیب' اخبار نویس اور ماہر تعلیم موجود ہیں جس کے علم و ادب کی کاوشوں کو لوگ احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس کالونی میں اردو اکیڈمی کا ادارہ موجود ہے خواتین کا ادبی فورم ''حریم فن'' بھی موجود ہے اس قدر علمی' ادبی' تہذیبی کاوشوں کا اگر کوئی مستند گھر ہے تو وہ گل گشت کالونی ہے۔ سر سید احمد خاں کی تعلیمی' ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں کو زندہ رکھنے کی ایک تحریک ایک علی گڑھ سکول اور کالج بھی اسی کالونی میں موجود ہے۔ ان تمام حوالوں سے گل گشت کالونی منفرد اور ممتاز نظر آتی ہے۔ سکولوں' کالجوں اور اداروں کی وجہ سے کتابوں' سٹیشنری کی دکانوں کی بھی یہاں ایک مضبوط مارکیٹ ہے۔ ہر قسم کی یہاں کتابیں مل جاتی ہیں بلکہ ان کے خلاصے اور گیس پیپرز بھی ہر وقت دستیاب ہیں۔ طالب علموں اور پروفیسروں کی علمی کاوشوں کا اظہار بھی اسی خطے سے ہوتا ہے۔ یہ کالونی صرف پڑھنے لکھنے والوں کی ہی نہیں اہل شہر اہل فن اور بینک کے ماہرین کی بھی ہے۔

گل گشت کالونی کب وجود میں آئی اس ضمن میں کوئی مستند تاریخ نہیں بلکہ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۰ سے لے کر ۱۹۶۵ کے عرصے میں اس کالونی کی وسعت ہوئی اور اب بڑھ کر ایک طرف سے زکریا ٹاؤن کی شکل اختیار کر گئی ہے اور دوسری طرف نشیمن کالونی' شالیمار

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کالونی اور گلزار کالونی اور ایکسٹینشن کالونی اس کے توسیع اور وسیع تر حصے ہیں۔ گل گشت سے مٹی پھولوں کی ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا تھا

گل گشت در غنچہ نہ کردہ
قربان لب یار کے غنچہ سے گل

جب غنچہ پھول بن جائے تو پھر غنچہ نہیں بن سکتا لیکن میرے محبوب کے لب ایسے ہیں کہ اگر مسکرائیں تو غنچہ آگر پھر کھل کر غنچہ نہیں تو پھول بن کر گل گشت ہو گئی چھوٹے چھوٹے اور درختوں کا مرکز تھا اب پھول زیادہ نظر نہیں آتے۔ ایک وقت باغ تھا اس میں پھول ہی پھول ہوتے۔ پوری کالونی ان سے گھری ہوئی تھی مگر یہ وقت باغ والے پلاٹ تقسیم ہو کر اور شہر ہونے سے پلاٹوں کے لئے وقف ہو گیا ہے۔ مگر یہاں یہ نہیں کرتے خواتین کا ایک پارک ہے لیکن بہت بہت چھوٹا ہے۔ پوری آبادی کی خواتین اور بچے یہاں کی سیر نہیں کر سکتے۔ کالونی کی مسجدیں اس کی قدامت کی علامت ہیں اور کوئی محقق اگر اس کالونی کی قدامت کی علامت تلاش کرے تو اس سے اعلیٰ سے اعلیٰ ثبوت دیا جا سکتا ہے۔ مسجدیں جگہ جگہ سے ٹوٹ پھوٹ گئی ہیں گرنے لگے ہیں حادثے ہو سکتے ہیں لیکن یہ تو اہل کالونی کی دعاؤں کا اثر ہے اور یہاں کی مسجدوں کی نمازوں کا معجزہ ہے کہ حادثے ٹل جاتے ہیں اور خیر کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

جلال مسجد، بلال مسجد، حیدریہ مسجد اور دیگر مسجدیں اس کالونی کے تقدس اور وقار کی علامت ہیں یہاں ہر وقت ذکر و عبادت جاری ہے۔ گل گشت کالونی جدید تر ہونے کے باوجود قدیم بھی ہے کیونکہ اس کی مسجدیں اور پرانی کوٹھیاں اس کے قدامت کی علامت ہیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

Most Welcome

مادی تحفے اور باہمی رابطے محبتوں کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ رشتوں کو مضبوط بناتے ہیں۔ افہام و تفہیم کے دروازے کھولتے ہیں۔ فرد سے لیکر ادارے اور اداروں سے لیکر لمبے فاصلے ان کی وجہ سے سمٹ جاتے ہیں اور ایک Global Access کا ئناتی رسائی کے مرحلے طے ہو جاتے ہیں۔ بعض انسان گفتگو میں اپنے معاملات میں بڑی اچھی شخصیت کے حامل ہوتے ہیں۔ انسان زندگی میں ان سے ایک بار ملتا ہے لیکن بڑے عرصے تک اس کی باتیں اور اس کی یادیں محفوظ رکھتا ہے۔ ان کی اچھائیاں دوستوں میں بیان کرتا ہے۔ اپنی یادیں مرتب کرتا ہے اس شخصیت کے خدوخال اجاگر کرتا ہے اپنے تعلق کے ذرائع بیان کرتا ہے۔ اپنی پہلی ملاقات کے ثمرات سناتا ہے غرضیکہ ایک ملاقات کئی ملاقاتوں کا سبب بنتی ہے کتابوں کا موضوع بنتی ہے اور ایسا سرمایہ بنتی ہے کہ آنے والی نسلیں اپنی تحریر اور تقریر میں انہیں بطور حوالہ پیش کرتی ہیں۔ انہی خوب صورت لمحوں کو محفوظ کرنے اور نکھارنے میں انگریزی کا ایک لفظ Most Welcome بھی ہے۔ بظاہر دو لفظوں پر مشتمل ہے لیکن کہنے والے خلوص اور سننے والے کے جذبات کا ترجمان بن جاتا ہے۔ کہنے والا بڑے اعتماد سے یقین دہانی کراتا ہے کہ میں آپ کا مخلص ہوں آپ کا بہی خواہ ہوں آپ مجھ پر اعتماد کر سکتے ہیں میں آپ کی توقعات پر پورا اتروں گا آپ کے مفادات کا تحفظ کروں گا آپ کے ادارے اور کاروبار کی Goodwill کا خیال رکھوں گا۔

Most welcome ایک خوب صورت 'نفاست' تہذیب اور مٹھاس کے اظہار کا نام ہے۔ آنے والے کو خوش آمدید "جی آیاں نو" کہنے کا لفظ ہے۔ ادھر آپ کے منہ سے کوئی تجویز سامنے آئی ادھر ایکدم اسکی رسائی اس کی منظوری لفظ Most welcome میں ادا ہو گئی۔ سننے والا بھی خوش اور کہنے والے پر بھی رجائیت کا جذبہ غالب رہتا ہے۔

انگریزی اس اعتبار سے خوش نصیب زبان ہے جس نے لفظوں کی شکل میں اچھے تحفے دیئے ہیں جن میں لفظ "موڈ" جس کا استعمال کچھ یوں ہوتا ہے کہ "آج موڈ نہیں کل آنا" جیسے گانے جسے سن کر والدین کے چہرے سرخ ہو جاتے ہیں اور بعض نشریاتی ادارے اپنے گانے اس انداز سے نوجوانوں کو دکھاتے ہیں جیسے وہ جھوم رہے ہیں اور خوشی سے پاگل ہو رہے ہیں

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

اور تہذیب کے سنجیدہ عناصر اس امیہ اور اس سوچ پر حیران ہوتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ ایسے گانے کو کون پاس کرتا ہے اور کون ان کی دھنیں بناتا ہے اور کون ان کی منظوری دیتا ہے ایسے لگتا ہے کہ ہم نے انگریزی کو اپنی زندگی پر مسلط کر لیا ہے اور اس کے لفظوں کو بغیر سوچے سمجھے اس طرح استعمال کر رہے ہیں جیسے ان کا کوئی متبادل موجود نہیں یا ان سے بہتر کوئی مفہوم نہیں۔ ہماری اپنی زبانیں امیر ہیں ان میں لفظوں کی کوئی قلت نہیں۔ اردو کا دامن وسیع ہے اس پر انگریزی کا بوجھ نہ ڈالا جائے ورنہ وہی بین الاقوامی حرب وہی مفاد پرستانہ سوچ ہماری زندگی کے گرد جالے کی طرح چھا جائے گی اور ہماری معصوم سوچ انہی کے گرد رہ جائے گی جو دنیا بھر میں مغربی اقوام نے سفارتی حلقوں میں پیدا کر دی ہے۔

Most welcome بظاہر خوش آمدید، خوشگوار، اچھے اور مخلصانہ جذبات کے اظہار کا عزم ہے لیکن اس کی تہہ میں وہی سوچ کار فرما ہے کہ فی الحال میری جان چھوڑیں بعد میں دیکھا جائے گا۔ لوگ اپنے وقت، کاروبار کو بچانے کے لئے اس لفظ کا سہارا لیتے ہیں۔ اچھے جذبوں کا اظہار کرتے ہیں لیکن دوسرے لمحوں میں صرف لفظوں کی حد تک عمل کرتے ہیں بعض گفتار کے غازی اور کردار سے عاری جذبات کا اس سے زیادہ اظہار ممکن نہیں۔ Most welcome مثبت اور منفی جذبوں کے خوب صورت کے تاثر کا نام ہے اس سے اندازہ لگانا کہ کہنے والا واقعی مخلص ہے بہت مشکل ہے یہ خلوص اور غیر خلوص کے دونوں معنی میں استعمال ہوتا ہے بظاہر خوشگوار تاثر اور پوشیدہ معنی میں وقتی طور پر ٹالنے کا مجرب نسخہ ہے۔ کیا ایسا ممکن نہیں کہ ہم ایسے لفظوں سے جان چھڑائیں جو ہماری شخصیت کو دو حصوں میں بانٹتے ہیں اور ہمارے خلوص کو شک کی دلدل میں پھنساتے ہیں۔

Most welcome مصنوعی مسکراہٹ ہے اندر کے کرب کا اظہار نہیں۔ زخم کے اوپر بندھی پٹی ہے بڑھتے ہوئے زخم کا علاج نہیں۔ ایک اچھا معالج مسیحائی میں جو معیار کا قائل نہیں ہوتا یا علاج ہوتا ہے یا مریض کو فارغ کر دیا جاتا ہے۔ Most welcome کے مصنوعی سہارے پر زندہ نہیں رہا جا سکتا۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

"جلنے والے کا منہ کالا"

بعض عوامی جملے عالمگیر سچائیوں کو اپنے اندر چھپائے ہوتے ہیں اور انسانی نفسیات کی ایسی نمائندگی کرتے ہیں کہ انسان حیران ہوتا ہے کہ ایسا واضح اور بلیغ اشارہ اس جملہ کے علاوہ اور ممکن ہی نہ تھا ساری کی ساری کیفیت دل و دماغ میں بیٹھ جاتی ہے۔ انہی عوامی جملوں میں ایک عام فہم جملہ اکثر سننے کو اور اکثر ٹرکوں بسوں کے پیچھے پڑھنے کو ملتا ہے کہ "جلنے والے کا منہ کالا" پہلے ایسے جملے پڑھ کر حیرت ہوتی تھی کہ لوگ اس قدر سادہ زبان میں دوسرے کے لئے ایسی بد دعائیں کیوں دیتے ہیں اور اس قدر تلخ کیوں ہو جاتے ہیں۔ تحریر کا ایک ایک لفظ دوسرے انسان کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے ایک ایک جملہ سے دوسرے انسان کی صحت مزاج کا اندازہ ہوتا ہے جہاں جملے میں تلخی آئی اندازہ لگانے والے بخوبی اندازہ لگا لیتے ہیں کہ مزاج دشمناں ٹھیک نہیں یا معدہ خراب ہے کھٹے ڈکار آ رہے ہیں یا متلی کا امکان ہے یا نظام اخراج درست نہیں ایسی حالتوں میں جملے تلخ ہو جاتے ہیں بدگمانیاں بڑھ جاتی ہیں بیمار ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے ہر شخص میں برائی ہر بات میں برائی اور ہر نظام میں خرابی نظر آنے لگی ہے ایسے انسان کے لئے ماہرین علم ابدان تجویز کرتے ہیں کہ وہ منہ میں الائچی خورد مصری اور سونف استعمال کرے اور پیٹ کو ایک آدھ دن بیسار خوری سے بچائے انشاء اللہ اس کے بعد ہر چیز صاف ستھری نظر آئے گی ہر شخص پاکیزہ اطوار کا پیکر دکھائی دے گا اور خود ایسی تحریریں اور ایسی باتیں کہنے والا اپنے اندر ضمیر کا مجرم دکھائی دے گا جو فرد سے لیکر افراد تک نظام سے لیکر کائنات تک ادارے سے لیکر ریاست تک کھوجی کی طرح برائیاں ڈھونڈتا ہے بہادر شاہ ظفر نے بھی ایسے ہی لوگوں کے بارے کہا تھا کہ جب ان کی اپنی برائیوں پر نگاہ جاتی ہے تو دوسرے ان سے کہیں بہتر نظر آتے ہیں المیہ یہ ہے کہ کچھ عرصہ سے ہمارے معاشرہ میں معدہ کا مرض بڑھ گیا ہے خوراک صحیح اور بروقت نہیں ملتی حرص اور حسد کی مقدار اس میں اس قدر زیادہ ہے کہ ہر شخص کو مجبوراً اپنے دروازے اپنے دفتر اپنی گاڑی پر لکھوانا پڑتا ہے کہ جلنے والے کا منہ کالا حالانکہ ایسی تحریریں کسی مہذب معاشرے کے باشعور تعلیم یافتہ افراد کی نمائندگی نہیں کرتیں لیکن کیا کریں معاشرے میں حسد کی وبا اس تیزی سے پھیلی ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان پر جب تک کیچڑ نہ پھینک لے اسے چین نہیں آتا اور ایسی سوچ

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کسی عمل کو کہتے ہیں جسے قدرت عزت دے اسے کوئی مائی کا لال چھین نہیں سکتا ورنہ دنیا بھر کے کمزور مظلوم یتیم بچے مرنے سے پہلے مر جاتے۔ انہیں بچانے والا ان کی حفاظت کرنے والا آسمان پر نہیں شہ رگ کے قریب ہے اور وہ اپنی قدرت پر قادر رہے کسی کے ہاتھ خالی زبان بسی اور کسی کو خاموشی مگر علم کی دولت سے نوازتا ہے لیکن یہ سب کچھ صحیح درست ہے لیکن احتیاط یہ ہے کہ آپ اپنے مکان گاڑی پر یہ تحریر ضرور لکھوائیں کہ جلنے والے کا منہ کالا اسی میں عافیت ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ڈیرہ غازی خان میڈیکل کالج کا منتظر ہے

پچھلے دنوں لاہور میں یو جی سی کی سطح پر جانوروں کے تحفظ اور ان کو بیماریوں سے بچانے کے حوالہ سے مؤثر نصاب کی ضرورتوں پر اعلیٰ سطح کی میٹنگ ہوئی جس میں ہمیں بھی شرکت کا شرف حاصل ہوا۔ پاکستان ایگری کلچر ریسرچ کونسل (PARC) اسلام آباد کے ایک ماہر نے بتایا کہ ہم نے ہر شعبے میں تحقیقات کو فروغ دیا ہے۔ اور اعلیٰ سطح کی ریسرچ ڈائریکٹریاں مرتب کی ہیں۔ میں ان سے پوچھا کہ کبھی آپ کی کونسل نے ورٹ منرو' وہوا' تونسہ اور دیگر پہاڑی علاقوں اور سلسلہ کوہ سلیمان میں پرورش پانے والے جانوروں کے بارے میں سوچا اور کبھی ان بھیڑ بکریوں کا علاج دریافت کیا۔ جن کی جلد کو اندر سے کیڑے چمٹ جاتے ہیں اور ان کی صحت اور نسل کو متاثر کرتے ہیں اس پر انہوں نے جواب دیتے ہوئے کہا "یقیناً" آپ کبھی اسلام آباد آکر ہماری تحقیقات کو ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ میں ان سے ادب سے کہا کہ میں خود آؤں یا تونسہ کی بھیڑ بکریوں کو بھی ساتھ لاؤں تاکہ وہ جدید تحقیقات کے مجلے' رسالے اور کتابیں خود دیکھ سکیں جن میں ان کا علاج موجود ہے۔ کیا ایسا ممکن نہیں کہ یہ تحقیقات "USERS" تک پہنچ سکیں اور ان کو عام فہم زبان میں سمجھایا جا سکے کہ وہ اپنے جانوروں کا کس طرح علاج کرائیں۔ ان کی نسل کو بچائیں بلکہ اس حد تک بڑھائیں کہ وہ ملک کی معیشت اور زرمبادلہ کے حصول میں مددگار ہیں۔

چند روز ہوئے ڈیرہ غازی خان کے مشہور قصبے مانہ حمدانی کے ایک دانشور جناب رب نواز خاں سے ملاقات ہوئی تو میں نے انہیں اس میٹنگ کے حوالے سے بتایا کہ ڈیرہ غازی خان کے جانوروں جس میں داجل کا بیل' کوہ سلیمان کی بھیڑ بکریاں شامل ہیں بڑی تحقیق ہو رہی ہے تو انہوں نے قدرے مسکراتے ہوئے کہا کہ ان بھیڑ بکریوں کو چھوڑیں اور ان انسانوں کے بارے بات کریں جو ان پہاڑوں میں بستے ہیں علاج معالجے کے لئے ترستے ہیں ایک مریض کو پہاڑ سے ڈیرہ اور پھر جب نشتر ہسپتال ملتان لاتے ہیں غریبوں کی ساری بکریاں بک جاتی ہیں عمر بھر کی پونجی مہنگے داموں اور ڈاکٹروں کی بھاری فیسوں پر صرف ہو جاتی ہیں مریض بچ گیا تو کچھ سہارا مل جاتا ہے اور اگر خدانخواستہ مریض دنیا سے چل بسا تو پہاڑوں کی غاروں میں رہنے والے ہمیشہ کے لئے غاروں کے اندھیروں میں غرق ہو جاتے ہیں۔ کیا آپ

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

نے کبھی ان کے چہروں کو نہیں دیکھا بھوک' افلاس' ان گنت کی بیماریوں کی وجہ سے زرد پڑ جاتے ہیں۔ مفلسی حس لطافت کو برباد کر دیتی ہے۔ انہیں روٹی نہ ملنے کا غم اور بیمار ہونے کی صورت میں علاج سے محروم ہونے کا صدمہ کوئی بڑا کام کرنے نہیں دیتا۔ کوئی ادب' کوئی تحقیق کوئی شعر و سخن کا عظیم سرمایہ سامنے کیوں نہیں آتا اس لئے کہ ان کے پاس وسائل نہیں۔ یہ نہیں کہ انہیں درد' کرب' احساس کی شدت کے اظہار کی صلاحیت نہیں وہ پہاڑیوں میں اعلیٰ ادب تخلیق کرتے ہیں لیکن وہ صرف پہاڑوں اور ان کے مضافاتی علاقوں کی فضاؤں میں دم توڑ دیتا ہے ان کی داد فریاد کی بازگشت صرف رود کہیوں اور پہاڑوں کی چوٹیوں تک ہے۔ مقتدرہ قومی زبان اور اکادمی ادبیات اسلام آباد کو ان کے بارے اور ان کو ان کے بارے کوئی علم نہیں۔

ڈیرہ غازی خان کی نئی نسل جس حد تک تعلیم اور خاص طور پر میڈیکل اور انجینئرنگ کے شعبے میں بڑھ رہی ہے بورڈ کے نتائج اور تعلیمی سہولتوں کی وجہ سے ڈیرہ غازی خان اپنا حق رکھتا ہے کہ اسے ایک میڈیکل کالج ملے اسے ایک اچھا معیاری اور جدید سہولتوں سے آراستہ ہسپتال ملے جو ڈیرہ غازی خان سے لیکر ڈیرہ اسماعیل خان تک کے مریضوں کے لئے کافی ہو۔ ایک طرف کشمور' کندھ کوٹ اور فورٹ منرو' بارکھان تک کی ضرورتوں کو پورا کرے اور دوسری طرف ایہ' بھکر' دریا خان' میانوالی کے مریضوں کو مسیحائی فراہم کرے۔ اگر فیصل آباد میں میڈیکل کالج بن سکتا ہے بہاولپور ڈویژن میں میڈیکل کالج قائم کیا جا سکتا ہے تو ڈیرہ غازی خان جو وسیع و عریض خطے پر مشتمل ہے جس کی آبادی تقریباً دس لاکھ ہے جس کے مضافاتی حلقے ایک عرصے سے ہسپتال اور میڈیکل کالج کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اصولاً انہیں ایک ٹیکنیکل یونیورسٹی ملنی چاہیئے ائرپورٹ یقیناً بڑے لوگوں کی ضرورت تھی مگر غریب صحت چاہتے ہیں جو ایک ہسپتال پوری کر سکتا ہے طالب علم اپنے مستقبل کے لئے میڈیکل کالج چاہتے ہیں تاکہ وہ دیگر خطہ کے نوجوانوں کی طرح وطن عزیز کی مؤثر خدمت کر سکیں نشتر میڈیکل کالج ملتان بڑھتی ہوئی آبادی اور طلبہ و طالبات کے مسلسل اضافہ کو نہیں سنبھال سکتا۔ عوامی اور سماجی حلقے اب بڑی دردمندی سے محسوس کر رہے ہیں کہ مخدوم رشید یا قادر پور راں میں نشتر ہسپتال جیسا ایک ہسپتال چاہتے جو وہاڑی' بورے والہ' عارف والہ' پاکپتن کے مریضوں کو طبی سہولتیں فراہم کر سکے اسی طرح خانیوال' کبیر والہ' عبدالحکیم' مخدوم پور

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

گولڈن شیک ہینڈ

''گولڈن شیک ہینڈ''کتنا دلنشیں' پیارا اور خوبصورت جملہ ہے بظاہر تین لفظوں پر مشتمل ہے لیکن بلا کی کشش رکھتا ہے' گولڈ سونا ہے اور گولڈن سنہری' شیک ہینڈ ہاتھ ملانے کو کہتے ہیں ان تین لفظوں میں اتنی چاشنی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ ایسے سنہری ہاتھ بار بار ملائے جائیں اور کئی بار ملائے جائیں' خالی خولی ہاتھ ملانے کا کیا فائدہ' کیوں نہ گولڈن شیک ہینڈ کیا جائے ادھر ہاتھ ملایا ادھر معقول واجبات کی تھیلی تھما دی گئی' اس کے باوجود پنشن اور دیگر مراعات جوں کی توں رہیں گی' گولڈن شیک ہینڈ بزنس اینڈ ایڈمنسٹریشن کی اصطلاح ہے جس میں مالک کو اختیار حاصل ہوتا ہے کہ "Hire and Fire" کا حق استعمال کرے جسے چاہے بلا لے اور جسے چاہے کھڑے کھڑے فارغ کر دے ایک بینک کی انتظامیہ کا طریقہ مجھے بے حد پسند ہے کہ جب کسی سے ناراض ہو جائے ایک بار دفتر بلاتے ہیں اور نہایت شفیق انداز سے کہتے ہیں کہ ''جاتے ہوئے کیشیئر سے ملتے جائیں''کیشیئر بھی ایسا مستعد کہ تمام واجبات اور تمام کٹوتیاں مکمل کر کے لفافہ تیار رکھتا ہے تاکہ جانے والے کا دل نہ دکھے اور وقت بھی ضائع نہ ہو۔

گولڈن شیک ہینڈ مالک اور ملازم کے درمیان رضا کارانہ معاہدہ ہے خود ریٹائرمنٹ طلب کرنا اس لئے بہتر ہے کہ اس میں عزت و آبرو قائم رہتی ہے روز روز کی جھاڑ پٹ سے جان چھوٹ جاتی ہے رجسٹر حاضری پر دیر سے آنا اور ہر ایک لمحہ کا حساب دینا ہر فائل اور ہر ڈرافٹ پر صاحب کی طوطا کی طرح چونچ بدلنے والی قلم سے Nast Remarks پڑھنا کتنا اذیت ناک ہے اس سے بہتر نہیں کہ آدمی خود سے تیار ہو کر صاحب کو کہے کہ حضور اب میرا اور آپ کا گزارہ ممکن نہیں میرے لئے مشکل ہو گیا ہے کہ میں یہی کہتا رہوں کہ "Boss is always right" ''صاحب ہمیشہ درست ہیں''کیونکہ نوکری میں ایسا کرنا اور کہنا پڑتا ہے نوکری کی دوسری شکل چاکری کی ہے یعنی صاحب کے در کی چاکری کرنا اس کے ایک ایک کام میں جی بھر کر حصہ لینا اور اسکے گھر کے ہر فرد کو ادباً تعظیماً جھک جھک کر سلام کرنا کہ کہیں گھر کا کوئی یونٹ ''صاحب'' کے کان نہ بھر دے بلکہ صاحب کے عزیزوں دوستوں اور ''منہ چڑھے'' ''حضرتوں''کا بھی خیال خاص رکھنا دراصل نوکری کو پکا کرنے کا ایک ادنیٰ ہنر ہے ایک ادنیٰ ملازم گھر' دفتر اور دفتر کے باہر پھیلے ہوئے ان گنت سوالات میں زندگی گزارتا

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ہے اور اس پیٹ کی خاطر کیسے کیسے صدموں کو برداشت کرتا ہے انہیں اچھی سہولیات نہیں حکمانہ کارروائی نہیں بے نام گمنام مراسلے نہیں ادھر سے شکایت نہیں ادھر سے شکایت نہیں محکمے کے مسائل نہیں غیروں کے شکوے اور ان سب کے درمیان اگر کوئی اچھی ہوتی شخصیت ہے تو وہ "ملازم" کی ہے جسے زندگی میں پہلی بار موقع دیا جا رہا ہے کہ "اے غمگین انسان" اپنے غم بھول جا سیدھا صاحب کے کمرے میں جا اس کی مصافحہ کر اور گھر چل تیرے دکھوں کا یہی مداوا ہے جتنی نوکری کر لی غنیمت ہے اب محلے میں کوئی اچھی سی دکان کھول اور ٹھاٹھ سے اخبار پڑھ اور غم جاناں اور غم جہاں سے آزاد ہو جا۔

کہتے ہیں کہ گزشتہ پندرہ سولہ برسوں میں برطانیہ اور یورپ کے دیگر خطوں میں جب صنعتی بحران آیا اور صنعتی یونٹ Close down ہونے لگے تو یورپ والوں نے پہلی بار Golden shake hand کی اصطلاح ایجاد کی کہ کچھ دے دلا کر ان پرائیویٹ ملازمین کو فارغ کیا جائے تاکہ مزید صنعتی بحران سے بچا جائے اب پاکستان میں پہلی بار حکومتی سطح پر ایسا فارمولا زیر غور ہے وفاقی حکومت نے ایک ایسے پیکیج کا اعلان کیا ہے تاکہ اپنے اخراجات کم کر سکے موجودہ ملازمین میں کمی کر سکے اور نئی بھرتی پر پابندی لگ سکے اگرچہ عمر کا بھی ایک مسئلہ تھا کہ اسے ۵۵ سال تک کیا جائے یا ۵۱ سال تک رکھا جائے مگر درست اس کی تردید منصوبہ بندی کمیشن کے چیئرمین ڈاکٹر حفیظ پاشا نے کر دی ہے کہ کسی ملازم کو ۲۰ سال سے پہلے ریٹائر نہیں کیا جائے گا۔ یہ خبر محض افواہ ہے لیکن نئی بھرتی پر پابندی کا کوئی قانونی جواز نہیں نئی نسل کہاں جائے اگر اتنی تعلیم اتنی محنت کے بعد انہیں روزگار نہیں ملے گا تو پھر وہ کون سے کام معاشرے میں کریں گے نوجوان نسل کو بے کار بٹھا کر ملک اور معاشرہ میں تبدیلی نا ممکن نہیں اس ضمن میں وزیر خزانہ اور منصوبہ بندی کمیشن کے چیئرمین کو ٹھنڈے دل کی بجائے گرم جذبات سے سوچنا چاہیے کہ ہم نوجوان نسل کو کیا بنانا چاہتے ہیں اور انہیں معاشرہ میں کیا کردار سونپ رہے ہیں۔ وسائل کم ہیں تو انہیں بڑھایا جا سکتا ہے اس کے لئے کئی متبادل سکیمیں موجود ہیں۔ گولڈن شیک ہینڈ ضروری سہی مگر یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ جن لوگوں نے اپنی جوانیاں ان صنعتوں اداروں اور بینکوں میں کھپا دی ہیں اور عمر کی اب اس دہلیز پر ہیں جہاں فلاحی معاشرہ کو ان کا خیال رکھنا چاہیے ہم انہیں انسانی اقدار سے منافی سکیم جبری سبکدوشی جبری ریٹائرمنٹ سے عدم تحفظ کی دنیا میں دھکیل رہے ہیں وہ اس عمر میں

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کہاں جائیں گے ؟

جن کی سروس زیادہ ہے اور باقی ریٹائر ہونے والا پریڈ کم ہے انہیں نقصان در نقصان ہے البتہ جن کی عمر ابھی سروس کے لئے کافی ہے انہیں ۶۰ تنخواہیں مل جائیں گی اور دیگر تمام مفادات اور مراعات بھی ملیں گی تو ان کے لئے ان سکیم سے فائدہ ہے مگر حکومت ان تمام مراعات اور مفادات کا مشترکہ فارمولا پیش کرے تاکہ ملازمین سوچ سکیں انہیں اب کیا کرنا ہے رضاکارانہ ریٹائرمنٹ لینی ہے یا نوکری کو جاری رکھنا ہے بعض بینکوں نے اپنے عملہ کو تنخواہ کے بنیادی سکیل میں بارہ ہزار سے اٹھارہ ہزار روپے تک دیئے ہیں جبکہ کچھ بینک کے سکیل مختلف ہیں اس لئے وہ یکساں سکیل کے آرزومند ہیں اگر انہیں اس فارمولے میں ایڈجسٹ کر لیا جائے تو وہ بھی گولڈن شیک ہینڈ کے لئے تیار بیٹھے ہیں' ہمارے ایک دیرینہ ساتھی خورشید احمد خاں نے بتایا کہ یہ سکیم ہر اعتبار سے مفید ہے بشرطیکہ اسے مزید عملی شکل اور مربوط بنیاد پر جاری کیا جائے تاکہ کسی کو گلہ شکوہ کا موقع نہ ملے اور اس طرح نئے لوگ' نئے تجربے اور مہارت کے ساتھ عملی میدان میں آئیں گے جو ملک کے لئے انتہائی مفید ہے گولڈن شیک ہینڈ نہ صرف حکومت کو اپنے اخراجات پر قابو پانے اور معیشت کو سنبھالا دینے کا عزم ہے بلکہ ملازمین کو بھی اپنے بچوں کے معاملات سنوارنے ان کی شادیاں ان کے گھر بنانے اور اپنے قرضے اتارنے کا سنہری موقع ہے تاکہ آسودگی خوشحالی سے باقی ماندہ زندگی کو گذارہ جائے۔ کوئی فلاحی سکیم نکال کر' کوئی کاروبار کر کے' کوئی ادارہ بنا کر ملک کے یہ تجربہ کار لوگ معاشرے میں انقلاب لا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ان کو جائز مراعات ملیں۔ ان کے مفادات کا مکمل تحفظ ہو۔ موجودہ مہنگائی کو مدنظر رکھا جائے ان کی ان خدمات کو جو انہوں نے خون پسینہ بہا کر گلشن کو نکھارنے اور ان کے تحفظ میں صرف کی ہیں۔

اگر یہ سب کچھ ہے تو آیئے صاحب کے دفتر چلیں اور اسے بتائیں کہ صاحب جی۔ اپنا ہاتھ بڑھایئے۔ بندہ Gold shake hand کے لئے حاضر ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ملتان کی وحدت کالونی

ون یونٹ نظام کے بارے تعریف کرنے والے کہتے ہیں کہ پاکستان ملنے کے بعد تاریخ کا یہ اہم یادگار واقعہ تھا جب ۲۶ مارچ ۱۹۸۰ء کو ون یونٹ نظام کو آخری شکل دی گئی اور مغربی پاکستان میں نواب مشتاق احمد گورمانی کو مغربی پاکستان کا گورنر بنایا گیا اس نظام کے مخالف اس کے نقائص کی ایک طویل فہرست لئے پھرتے ہیں کہ ہمیں اپنے بنیادی حقوق سے محروم دیا گیا البتہ وہ ہے جو اس کے خاتمے کے خلاف ہے کہ اس طرح ہم نے وحدت کو نقصان پہنچایا اور جنرل یحییٰ خان کو کوئی حق نہیں تھا کہ وہ آئین اور قانون کے طے شدہ مسئلہ کو چھیڑے اور اس کے خاتمے کا اعلان کرے۔ بہرحال یہ ماضی کے اندیشے حکمرانوں کی سوچ کے انداز اور تاریخ کے خوش آئند اور المیوں کی ایک پریشان کن داستان ہے اور سقوط ڈھاکہ کی صورت میں جو المیہ ہمیں ملا اس کا سبق ہم نے کتنی سنجیدگی سے لیا اور ان کے اثرات اور مضمرات پر کتنی گہری نظر سے سوچا یہ سارے موضوعات تحقیق طلب اور غور و فکر کے حامل ہیں جو مزید تحقیق کی راہیں دکھا سکتے ہیں سردست ہمیں ون یونٹ نظام میں طے کئے جانے والے ان امور میں سے صرف ایک امر پر گفتگو کرنی ہے اور وہ ہے وحدت کالونی یعنی ون یونٹ کے تحت ٹرانسفر یا تبدیل ہونے والے ملازمین کی سرکاری رہائش گاہیں جن کی وجہ سے امور مملکت بہ حسن و خوبی سرانجام دیے جا سکیں وحدت کالونیوں میں جنہیں شہرت ملی وہ ملتان کی وحدت کالونی اور لاہور کی وحدت کالونی شامل ہیں لاہور کو اس لئے اہمیت ملی کہ وہ صوبہ کا مرکز تھا اور یہ وحدت کالونی آج بھی وہاں موجود ہے جس کی وجہ شہرت وہ شاپ ہیں ایک نقشہ شاپ جہاں آج کل نقشہ موجود نہیں ایک آخری شاپ جس کی ساری پہچان غائب ہے۔ مال روڈ اگر لاہور کا دل ہے تو وحدت کالونی لاہور کا دماغ ہے اور ملتان کے درمیان مواصلات کا وہ ذریعہ ہے جس سے ایک طرف مال روڈ ہے اور دوسری طرف ملتان روڈ ہے ملتان کی وحدت کالونی یونہی بغیر نقشے کے بنی ہے اس لئے اس کو کوئی دریچہ نہیں، ایک طرف اس کے شمس آباد ہے اور دوسری وسطی پاکستان ہے پھر رشیدہ آباد کی سڑک جو دولت گیٹ کو جاتی ہے اسے اس خوبی سے منسلک کرتی ہے کہ مغربی اور مشرقی پاکستان کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے ایک طرف بڑے افسر اور بڑے گھر اور دوسری طرف چھوٹے افسر اور

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ان کے چھوٹے گھر سوائے چند نئے گھروں کے جن میں ہمارے اپنے عزیز رہتے ہیں لیکن انہیں بھی گلہ ہے کہ ان کے گھر بلڈنگ ڈیپارٹمنٹ نے صحیح تعمیر نہیں کئے کبھی چھت ٹپکتی ہے اور کبھی گھر کے سامنے پانی موجود رہتا ہے ویسے ملتان کی وحدت کالونی ایک وضعدار، نفیس الطبع افراد پر مشتمل ہے تمدنی سہولتوں کی ممکن ہے کبھی بات ہوتی ہو مگر اس میں سیاسی اندازِ فکر ہرگز نہیں جبکہ لاہور کی وحدت کالونی کا ہر گھر سیاست کا گڑھ ہے جب کبھی انتخاب کا وقت آتا ہے ہر گھر سے آواز اٹھتی ہے کہ وحدت کالونی کے گھر ہمیں الاٹ کر دو کیونکہ سوڈیوال کے گھر رہنے والوں کو مل چکے ہیں اور ہر گھر میں رہنے والوں میں وحدت کالونی لاہور کے گھروں کو اس طرح تبدیل کیا ہے کہ ہر گھر تقریباً دکان کی شکل اختیار کر گیا ہے تجاوزات میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی جس کے جی میں جس قدر آیا ہے اس نے اردگرد کے سارے پلاٹ اپنے گھر میں لپیٹ لئے ہیں اور ایسی ایسی تعمیرات کرائی ہیں کہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے کہ لوگ سرکاری گھر کی حفاظت کس طرح اپنا گھر سمجھ کر کرتے ہیں اگر ایسا جذبہ عام ہو جائے تو سارے سرکاری گھر اپنے گھر نظر آئیں۔

لیکن وحدت کالونی ملتان اس اعتبار سے اس جذبہ سے محروم ہے کہیں کوئی تجاوزات نہیں کہیں کوئی دکان نہیں اور نہ ہی کہیں کوئی اضافہ ہوا ہے جیسے مٹی کی دیواریں کبھی تعمیر ہوئی تھیں آج بھی الحمدللہ اسی شکل میں موجود ہیں تاکہ کوئی ریسرچ سکالر ون یونٹ کے نظام پر کام کرنا چاہے تو اسے وہی آثار اور وہی انداز آج بھی مل سکیں، پچھلی بارشوں میں ہمارے ایک دوست ایڈیشنل سیشن جج کے گھر کی دیواریں گر گئیں پہلی دفعہ اندازہ ہوا ہے کہ سرکاری ملازمین کے اثاثے کیا ہوتے ہیں چند ٹوٹی ہوئی کرسیاں جو زیرِ آب آئیں اور چند چارپائیاں جو کبھی میوزیم میں موجود ہوتیں تو شاید قیمتی محسوس ہوتیں۔

وحدت کالونی ملتان کی شان و شوکت اگر دیکھنی ہے تو کبھی بارشوں کے بعد ادھر دورہ کریں ساری سڑکیں جذبوں سے سرشار نظر آئیں گی اور یہاں کا پانی مرید سادہ کی طرح قدم بوسی کے لئے تیار ہوتا ہے خاص طور پر ''ہچلر لاج'' کے سامنے والا حصہ اس قدر پانی سے بھرا ہوتا ہے کہ مکیں خوش ہوتے ہیں کہ مہمانوں سے جان چھوٹی اور مہمان اس لئے وہاں نہیں جاتے کہ آم کی پیٹی کے وزن سے پاؤں کے پھسلنے کا احتمال رہتا ہے، اس لئے وحدت کالونی کی پیٹیاں ہمارے جیسے نیاز مندوں کے حصہ میں آتی ہیں اگرچہ ہم یہ دعا تو نہیں کرتے کہ

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

وحدت کالونی میں ہر وقت پانی رہے یا یہاں ہر وقت بارشیں ہوتی رہیں مگر اس بات کی خواہش ضرور کرتے ہیں کہ یہاں کے مکینوں کو اپنے اثر و رسوخ کا استعمال بہر حال کرنا چاہئے ان کے دیواریں اگر بارش سے گرتی ہیں تو Law and Order کے حوالے سے حکام کا اس قدر مجبور ہونا ثابت ہوتا ہے اور اس سے عوام کو پریشانی ہوتی ہے کہ اگر ہمارے حکام اپنا دفاع نہیں کر سکتے تو ہمارا کیا تحفظ کریں گے۔

جہاں تک وحدت کالونی کی سڑکوں کی مرمت کا تعلق ہے ایک دفعہ بلڈنگ ڈیپارٹمنٹ نے بنا دیا تھا اب بار بار بنانے سے سرمایہ اور وقت ضائع ہوتا ہے اور ویسے بھی حکومت حکام کو سادہ زندگی گزارنے کی تلقین کرتی ہے وحدت کالونی کے مکین جس قدر سادہ، کچے اور ٹوٹی سڑکوں پر آتے جاتے ہیں ان کی اس مثال کو دوسرے علاقوں تک پہنچانا ضروری ہے اس لئے کہ بعض لوگوں کا خیال ہے حکام کی زندگی بڑی پر آسائش ہوتی ہے انہیں ملتان کی وحدت کالونی کی مثال سامنے رکھنی چاہئے سنا ہے ملتان میونسپل کارپوریشن کے ایڈمنسٹریٹر صاحب کی رہائش گاہ بھی اسی کالونی میں ہے، ہمسائے ہونے کے ناطے شاید انہیں کالونی کے مکین نہ بتاتے ہوں مگر انہوں نے ہم سے یہ بات ضرور کی ہے کہ ہمیں بھی ان کاشتکاروں کی طرح خصوصی الاؤنس دیا جائے جو جانور پالنے کی وجہ سے لیتے ہیں ہم بھی گذشتہ کئی سالوں سے جس محنت سے مچھر پال رہے ہیں خصوصی اعزازیہ کے مستحق ہیں۔

ملتان کی وحدت کالونی ہمارے تاریخ ہے ہمارا سرمایہ ہے اور قابل فخر افراد کے رہنے کی وجہ سے ایک قومی یادگار ہے، اگر ہم پاکستان کی دیگر یادگاروں کا اتنا خیال کرتے ہیں ان پر سرمایہ صرف کرتے ہیں رہنے والوں کے کوائف اکٹھے کرتے ہیں تو وحدت کالونی ملتان اس توجہ سے کیوں محروم ہے؟ اس کالونی میں کیسے کیسے دماغ اور کیسے کیسے اوصاف کے افراد موجود ہیں، ان کا اعتراف ہماری قومی ذمہ داری ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

صحت مند یا خوبصورت ملتان

ملتان اس اعتبار سے خوش نصیب ہے کہ اس شہر کی انتظامیہ نے کبھی ملتان کو لندن اور پیرس جیسا شہر بنانے کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ ہی اسے خوبصورت بنانے کے بلند وبانگ منصوبے بنائے ہیں۔

جن شہروں کے بارے میں کبھی سیاستدان لندن، پیرس بنانے کے نعرے لگایا کرتے تھے۔ کیا وہ لندن، پیرس بن گئے ہیں؟ اگر وہ نہیں بنے تو ملتان کو بننے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کی جتنی اینٹیں پرانی ہوں گی، جگہ جگہ سے ٹوٹے گی۔ دیواروں کے پلستر خراب ہوں گے۔ سڑکوں، گڑھوں اور کھڈوں کی شکل اختیار کریں گی تو ملتان کی قدامت اور تاریخی حیثیت اور اجاگر ہوگی۔ سیاح جوق در جوق آئیں گے۔

ماہرین آثار قدیمہ ملتان کے بارے میں جو دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ ساڑھے پانچ ہزار سال سے پرانا شہر ہے اگر اس کی ہر چیز نئی بن جائے تو پرانے دعوے اور بیانات کہاں جائیں گے۔

ملتان کو جوں کا توں رکھنے کی ضرورت ہے اس سلسلہ میں کارپوریشن کو ایوارڈ ملنا چاہئے کہ اس نے ملتان کی تاریخی اہمیت کو زندہ رکھا ہے اور کہیں اضافی اینٹ نہیں لگنے دی۔

کسی باغ کی روش کو درست نہیں ہونے دیا۔ پانی جہاں ہے اور جس حالت میں ہے اسے تبدیل نہیں کیا کہ کہیں تاریخ کا ریکارڈ غلط نہ ہو جائے۔

دمدمہ جیسے ٹوٹ رہا ہے اسے مزید ٹوٹنے کا صحت مند ماحول دیا جا رہا ہے۔ قلعہ کو مزید کہنہ کہا جا رہا ہے۔

میونسپل کارپوریشن ملتان سیکریسی پر بڑا ایمان رکھتی ہے ہر سال کروڑوں روپے کا بجٹ تیار ہوتا ہے اس کے منصوبے تشکیل پاتے ہیں ترقیاتی سکیمیں بنتی ہیں۔

مجال ہے کہ کسی کو علم ہو جائے۔ اس قدر رازداری پر بھی کارپوریشن مبارک باد کی مستحق ہے۔

کارپوریشن کے دفتر کے سامنے آج کل ایک ٹیلی ویژن مینوفیکچرنگ کمپنی کا گاڑی رکھی ہوئی ہے اس چھوٹی سی گاڑی پر ہر طرح کے تجربات ہو چکے ہیں کبھی یہاں فوارہ لگتا ہے، کبھی گھاس اگائی جاتی ہے، کبھی ٹریفک کا کنٹرول ممکن بنایا جاتا ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

البتہ ہوٹلوں کا بزنس چل نکلا ہے لیکن سماجی حلقے بھاری بھر کم اخراجات سے کیسے تقریبات منعقد کریں۔ اس لئے ملتان آرٹس کونسل کو شہریوں کی ادبی، سماجی صحت کا خیال رکھنا چاہئے اور اس منصوبہ میں تکمیل کا رنگ آنا چاہئے۔

شہروں کا نعرہ ہے کہ ملتان خوبصورت نہیں صحت مند ہونا چاہئے جس میں بچے کھیل سکیں۔ ان کے نہانے 'سیومنگ' کا انتظام ہو ایسے انتظام نہیں چاہئے جو بادشاہی عیدگاہ کے پاس ہے۔

گراسی پلاٹ کو کاٹ کر ایک مصنوعی جھیل بنائی گئی ہے جس میں پانی نہ ہو تو لیٹرین بن جاتی ہے اور پانی آجائے تو تعفن کا مرکز کہلاتی ہے اور اس میں بچے نہاتے اور بھاگتے جب نظر آتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ ان بچوں کے ساتھ کون سی پرانی دشمنی ہے کہ انہیں اس قدر غیر صحت مند ماحول میں رکھ کر تفریح مہیا کی جاوہی ہے۔

کیا ایسا ممکن نہیں کہ بچوں کے لئے کوئی معیاری سیومنگ پول تعمیر کیا جائے جہاں حفظان صحت کا معقوم انتظام ہو۔

ملتان میں سپورٹس سرگرمیوں کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں ملتان شہر کے اردگرد متروکہ وغیر متروکہ ہندو یا مسلم وقف اراضی میں سے کچھ رقبہ سپورٹس کی سرگرمیوں کے لئے وقف کیا جائے۔

سنا ہے کہ نیل کوٹ بوسن روڈ پر کچھ رقبہ متروکہ موجود ہے یہ کسی ایسوسی ایشن کو دینے کی بجائے سپورٹس گراؤنڈ کے لئے مختص کیا جائے کیونکہ ملتان کی صحت دیگر امور سے بہتر ہے۔

ملتان کو بڑے شہروں جیسی سہولتیں نہ دیں لیکن ان کے بچوں کو کھیلنے کے لئے گراؤنڈ، پارک ضرور مہیا کریں کیونکہ گلی کوچوں میں کرکٹ کھیلتے بچے اچھے نہیں لگتے۔ آتے جاتے افراد کے لئے مشکل پیدا کرتے ہیں۔

ملتان خوبصورت نہ سہی صحت مند ہو جائے تو یہی کافی ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کوٹلہ توے خاں

ملتان کا ایک ایسا محلہ جو پورے ملتان پر چھایا ہوا ہے اور جس کی تاریخی قدامت اسے برصغیر پاک و ہند میں ممتاز کرتی ہے بظاہر یہ کوٹلہ توے خاں ہے لیکن حقیقت میں اہل ہنر، اہل فن اور اہل سخن کا بے مثال خطہ ہے۔ زمانے کی ستم ظریفی سے کوٹلہ تغلق خاں سے بگڑ کر صرف کوٹلہ توے خاں رہ گیا ہے۔ جب یہ آباد ہوا تھا اس کا نام کوٹلہ تغلق خاں تھا جو وسیع و عریض علاقے میں پھیلا ہوا ہے کوٹلہ تغلق خاں کیسے آباد ہوا اور اس کا یہ نام کس نے دیا اور اسے یہ نام ارض ملتان کے مصنف کے مطابق غازی ملک غیاث الدین تغلق نے دیا جو شجاعت اور فراست میں صاحب کمال تھا اسے عمارات کا بہت شوق تھا ملتان کے قلعہ میں اس نے وہ فقید المثال قبہ بنایا جو اب حضرت شاہ رکن عالم کا مزار ہے اور قابل دید ہے۔ لاہوری دروازے کے باہر ایک محلہ آباد کیا جو کوٹلہ تغلق کے نام سے مشہور ہوا مگر اب بگڑ کر کوٹلہ توے خاں ملتا ہے۔

تغلق خاندان کا زمانہ ۱۳۱۹ء کا ہے اور اس خاندان کا تعلق ملتان سے تھا اور ان کی زیادہ تر آبادی اسی حصے میں آباد تھی جسے کوٹلہ توے خاں کہتے ہیں یہ محلہ بزرگان دین کا محلہ ہے اس محلہ کی بزرگ بستیوں میں پیر محمد مراد یہ انی، مولانا نظام الدین (محلہ نظام آباد)، پیر مہر آغا، مولانا کریم بخش، جناب عزیز احمد خاں کے والد جو مولانا رومی کے عاشق اور سرائیکی زبان کے شاعر اور جامع کوٹلہ توے خاں کے خطیب تھے جنہوں نے ایک زمانہ تک اس خطے کے لوگوں کو عشق رسول کی لذتوں سے آشنا کیا کوٹلہ توے خاں اپنی تمام تر عداوتوں، فضیلتوں کے باوجود کوئی مقام حاصل نہ کر سکا۔ ملتان کا انتہائی پسماندہ خطہ ہے جو چونگی نمبر ۸ (پرانی) سے شروع ہوتا ہے اور لوہاری گیٹ تک پھیلا ہوا ہے اس سارے خطے میں اور اس سارے علاقے میں ان گنت تاریخی مقامات ہیں جن میں "ساوی مسجد" (سبز مسجد) ایک تاریخی اہمیت کی حامل ہے یہ روغنی اینٹوں سے بنی ہوئی ہے اور منفرد طرز تعمیر اور بلندی کی وجہ سے برصغیر میں مشہور ہے۔ اس مسجد کے در و دیوار پر جس خوبصورتی سے خطاطی کا کام کیا گیا ہے وہ اپنی نوعیت کا منفرد ہے۔ گزٹیئر ملتان میں لکھا ہے عمارت کے نیچے تہہ خانہ ہے جس میں صندوق زنجیروں سے لٹکے ہوئے ہیں۔ عمارت کے شمال میں نواب میر آغا اور نواب

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

اصغر علی کے مزارات ہیں جو اپنے وقت کے عمائدین شہر میں سے تھے جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ چوغطہ خاندان کے نواب تھے ان کے مزار سنگِ مرمر کے بنے ہوئے ہیں خوبصورتی کا اعلیٰ شاہکار ہیں اگرچہ یہ مسجد محکمہ آثار قدیمہ کی تحویل میں ہے جس طرح محکمہ آثار قدیمہ کا حال ہے یہی حال اس مسجد کا ہے جس کے آنے جانے کے لئے کوئی مناسب راستہ نہیں آپ پیدل جا سکتے ہیں اور ساوی مسجد کی زیارت کر سکتے ہیں یہاں جمعہ کی نماز بھی باقاعدگی سے ہوتی ہے اور مسجد ہر اعتبار سے آباد ہے لیکن اس کے آثار روز بروز منہدم ہوتے جا رہے ہیں کوئی اس کا سرکاری طور پر پرسان حال نہیں کبھی ذرائع ابلاغ نے اس تاریخی ورثہ کو وہ اہمیت نہیں دی جو دیگر مقامات کو حاصل ہے حالانکہ پتھروں پر خطاطی طرزِ تعمیر اپنی مثال آپ ہیں۔

کوٹلہ تولے خاں کی دوسری تاریخی فضیلت سلی خانہ ہے جہاں روزانہ سینکڑوں کی تعداد میں بکریاں ذبح ہوتی ہیں ان پر میونسپل کارپوریشن کی مہر لگتی ہے اور گوشت پورے شہر کو مہیا کیا جاتا ہے یہ سلی خانہ کوٹلہ تولے خاں کی پہچان ہے۔ اگر کسی شخص نے ابلاغ اور کلام کے نادر نمونے اکٹھے کرنے ہوں اور کوٹلہ تولے خاں کے لوگوں کے سخن کمال کا مظاہرہ دیکھنا ہو تو صبح سویرے سلی خانہ کا رخ کرے گالی گلوچ اور طنز اور مذاق جس رنگ میں یہاں دیکھنے اور سننے کو ملتا ہے جی چاہتا ہے کہ رائیونڈ والوں کو درخواست کی جائے کہ آپ چند ہفتے یہاں بھی لگائیں یہ خطہ آپ کی تبلیغی کاوشوں کے لئے نہایت موزوں ہے۔ کوٹلہ تولے خاں کی گلیاں تنگ و تاریک ہیں اگر خدانخواستہ کسی کا انتقال ہو جائے تو گلی میں سے میت نکالنا مشکل ہو جاتا ہے لوگ میت کو چادر میں لپیٹ کر گلی میں سے گزرتے ہیں اور پھر کہیں جا کر جنازہ کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ کوٹلہ تغلق روڈ کبھی بہت آباد تھا یہاں رونقیں ہوتی تھیں یہاں فالودہ ''ڈولی روٹی'' دال مونگ، مرغ پلاؤ، سری پائے اور طرح طرح کے کھانے کے اہتمام ہوتے مگر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی کی نظر لگ گئی ہو اور یہ آباد خطہ بظاہر آباد ہے مگر اندر سے تازگی اور بشاشت سے محروم ہو گیا ہو۔ نوجوانوں میں وہ حوصلہ وہ ہمت اور وہ جوش و خروش دکھائی نہیں دیتا جو کبھی ماضی میں موجود تھا۔ نشہ کی وبا یہاں بھی پھیلی ہے کہیں ''جہاز'' یہاں بھی اڑتے نظر آتے ہیں۔ مگر ائیر پورٹ نہ ہونے کی وجہ سے ادھر اُدھر اڑ کر گر جاتے ہیں اور ایسے زخمی ہوتے ہیں کہ پھر علاج بیکار ہو جاتے ہیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

والدین، بچے اور تفریح گاہیں

ہم اپنے بچوں میں تخلیقی صلاحیتیں اجاگر کرنا چاہتے ہیں انہیں مستقبل کو تعمیر کرنے کی صلاحیت دیکھنا چاہتے ہیں اس لئے ہماری آرزو ہے کہ ہمارے بچے جب مستقبل کی قیادت سنبھالیں تو ان میں فکر و تدبر تلاش و جستجو کے اوصاف موجود ہوں۔ اتنی گہرائی ہو کہ حقائق کی منفی اور مثبت اقدار کا ادراک کر سکیں۔ اتنی صلاحیت ضرور ہو کہ حالات میں ضروری تبدیلیاں کر سکیں اور در پیش مسائل کی نشاندہی بھی کر سکیں۔ اور اگر یہ تبدیلیاں کسی آزمائش سے ہو کر گزرتی ہوں تو ان میں اتنا حوصلہ ہو کہ وہ اس راہ کی دشواریوں کو خندہ پیشانی سے جھیل سکیں۔ آزمائشیں ہار جائیں اور یہ بچے موتیوں کی طرح نکھر جائیں۔

یہ ہماری آرزوئیں، امنگیں اور خواہشات ہیں کہ ہماری نئی نسل خود اعتمادی کے ساتھ آگے بڑھے اور وطن عزیز کے افق پر بادلوں کے ان سیاہ ٹکڑوں کو الگ کر دے جو روشنی کو ہر طرف یکساں طور پر پھیلنے سے روک رہے ہیں۔ وہ کالے بادل جو لہلہاتے کھیت اجاڑ دیتے ہیں وہ کالے بادل جو بے انصافی اور حرماں نصیبی کی چادر بن جاتے ہیں جو چاند اور سورج کا چہرہ چھپا دیتے ہیں۔

حقائق سامنے نہیں آتے ان حالات میں ہماری امیدیں نوجوان نسل کی طرف جاتی ہیں اور جبکہ ہم گولڈن جوبلی تقریبات منا رہے ہیں اور مقاصد کا تعین کر رہے ہیں اور ہم بجا طور پر تسلیم کرتے ہیں کہ پاکستان گزری نسلوں کی قربانیوں کا ثمر ہے۔ موجودہ نسل کی امیدوں کا محور ہے اور آنے والی نسلوں کی امانت ہے۔

ہم نے نئی نسل کی امانت کو ان تک پہنچانے میں کیا کردار ادا کیا ہے اور خاص طور پر نئی نسل کو ہم کیا دے رہے ہیں جن کے بارے میں ہم کہتے ہیں قوم کی نگاہیں ان پر ہیں اور ان نسلوں کی نگاہیں ہماری طرف ہیں کہ ہم نے انہیں کیا دیا ہے۔ تفریح تک ہم انہیں فراہم نہیں کر سکے۔ کسی پارک میں انہیں آزادی سے جانے کو کوئی موقع نہیں ملتا۔ ہر پارک، ہر میدان، ہر جھیل اور ہر تفریح پر ٹیکس ہے۔ سائیکل ٹیکس سے لے کر چلنے پھرنے کا ٹیکس، یہاں تک کہ اگر چند بچے کسی کھانے پینے کی چیز کی فرمائش کر بیٹھیں تو بیچارے والدین اپنی جیب کو دیکھتے ہیں اور پھر اپنے معصوم بچوں کی فرمائش کا جائزہ لیتے ہیں بچوں کی فرمائش تنگ دامنی

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کے ہاتھوں خاموشی کی فضا پیدا کر دیتی ہے اور دوسرے لمحے ویسے ہی پتے دل پہ اور آنسو رکھ رہے ہوتے ہیں ایک طرف سفید پوش والدین اور دوسری طرف تفریح گاہیں ہیں۔ آپس میں ایک سنگین مذاق بن جاتی ہیں۔ اگر کسی والد کے چار بچے ہوں تو وہ کس طرح کی پارک میں نصب جھولے، ٹرین، اونٹ، بوٹ (Boat) میوزیکل چیئر اور دیگر تفریحوں سے کس طرح اپنے بچوں کے لئے حاصل کر سکتا ہے۔ ہر تفریح اتنی مہنگی ہے کہ ۸، ۱۰ روپے سے کم نہیں اس طرح تین چار سو روپے آسانی سے خرچ ہو جاتے ہیں۔ کیا ہر والد اپنے بچوں کے لئے ہر ہفتے ہر مہینے ایسے تفریح کا متحمل ہو سکتا ہے۔ پھر ایسی تفریح گاہیں طبقاتی نظام کی پیداوار ہیں۔ عام بچوں کے لئے شرح ٹکٹ دس روپے اور خاص دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والے بچوں کے لئے ٹکٹ نصف ہے۔ کیا بچوں میں فرق آجاتا ہے یا والدین کا مرتبہ گر جاتا ہے ایسے امتیازات کیوں ہیں؟

اگر آپ (K.F.C.) کے مہنگے کھانوں کے لئے بچوں کو لے جائیں تو آپ کو ایک مشروب ۱۶ روپے فی بوتل ملے گا اور عام سادہ پانی وہاں موجود ہی نہیں آپ مجبوراً پانچ بچوں کو سو روپے خرچ کر کے صرف مشروب پلا سکتے ہیں باقی کھانا آپ کمرے میں لٹکتا دیکھ سکتے ہیں اور اگر آپ کے بچے ضد کریں تو آپ گھرکی دے سکتے ہیں بہانے بہانے سے جھاڑ سکتے ہیں اشیاء دلا نہیں سکتے۔ اسی طرح 2001 کی تفریح پر جہاں آپ کو پانچ، چھ روپے کے سکے خریدنے پڑتے ہیں اور ایک ایک گیم پر آپ کے پچاس سے سو روپے تک کے اخراجات آتے ہیں آپ کس طرح چار یا پانچ بچوں کو ان ملٹی والی گیم سے محفوظ کر سکتے ہیں۔

اسی طرح (Children Park) یا دیگر بچوں کی تفریح گاہیں جو بچوں کی تفریح گاہیں ہیں حقیقت میں والدین کی آزمائش گاہیں ہیں، کہ کوئی والد یا والدہ اپنی جیب کی پرواہ کئے بغیر اپنے بچوں کی تفریح پر کیا خرچ کر سکتا ہے۔ محدود بجٹ، محدود وسائل سے بڑی تفریح کا سوچنا، بچوں کے سستے پارک مہیا کرنا والدین کے بس میں نہیں رہا۔ حکومت کو بچوں کی تفریح گاہوں پر ٹیکس ختم کرنا چاہئے، جھولے اور کھلونے فری ڈیوٹی کے اور ارزاں قیمتوں پر فراہم کرنے چاہئیں والدین اپنے بچوں کو جدید سے جدید تر معلومات فراہم کرنے کے لئے جو آرزو رکھتے ہیں اس کی تکمیل میں حکومت اپنے تعاون کو فروغ دے کیونکہ یہ بچے قوم کی امانت ہیں اور ہمیں جان لینا چاہئے کہ اس امانت کی دیکھ بھال صرف تعلیمی ادارے نہیں کرتے بلکہ ان

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کی صحیح دیکھ بھال، بلکہ تعمیر اور کردار سازی کی پہلی درسگاہ ان کے گھر ان کے والدین ہوتے ہیں۔ ہم سارا زور درسگاہ کی معاشرتی اور اخلاقی قدروں کے زوال پر دیتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ جس درسگاہ کو مضبوط ہونا چاہئے تھا وہ ہم نے تفریح گاہوں کی محرومی یا عدم دستیابی کے ہاتھوں کمزور کر دی ہے اور پھر توقع کرتے ہیں کہ ہمارے بچے عقابی روح لے کر نئے جہانِ معنی کی تخلیق کریں۔ تعلیمی درسگاہوں کی طرح والدین بھی درسگاہیں ہیں ان کو بھی سرکاری گرانٹ ملنی چاہئے تاکہ وہ اپنے بچوں کو سستی، اور سہل تفریح فراہم کر سکیں اور بچوں کو یہ موقع دیا جائے کہ وہ مستقبل کے قائداعظم بن سکیں اس لئے والدین، بچے اور تفریح گاہیں تعمیر وطن کی علامت ہونی چاہئیں اگر ایسا ہو تو گولڈن جوبلی تقریبات منانا ہمارا حق ہے وگرنہ بغیر کام کے معاوضہ مانگنا یا اچھی زندگی کا تصور کرنا حق نہیں خیرات ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ادھورے خواب

تاریخ کیا ہے؟ ماضی کے تجربات واقعات جو کبھی درخشندہ روایات میں ملتے ہیں اور کبھی ایک بدنما صورت میں وہ وقت کا تازیانہ اور عبرت کا افسانہ بن جاتے ہیں تاریخ صرف ماہ وسال کی سرگذشت کا نام نہیں بلکہ علم ریاضی کے فارمولوں کی سچائی کا اظہار بھی ہے اس کے نتائج کم وبیش سائنسی علوم کی طرح ٹھوس اور ناقابل تبدیل ہوتے ہیں مثلاً جہاں بے انصافی ہو وسائل پر جابر قوتوں کا غلبہ ہو۔ عدم مساوات ہو وہاں انقلاب آتا ہے جہاں عدل وانصاف ہو مساوات اور رواداری ہو۔ اخوت اور ایک دوسرے کا درد بانٹنے کا سلیقہ ہو امن وامان ہو۔ لوگ بے خوف خطر زندگی گزارتے ہوں ان کی جائز ضرورتوں کے حصول میں کوئی رکاوٹ نہ ہو تو اس معاشرہ کو مثالی معاشرہ کہتے ہیں اور خطہ اراضی کو جنت کا ٹکڑا قرار دیتے ہیں۔

ایک ایسے ہی معاشرہ کا خواب ہمارے اکابرین نے برصغیر میں دیکھا اور اس سرزمین کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی تجربہ گاہ بنانے کا آرزو کی اس آرزو کی تکمیل میں اگرچہ لرزہ خیز مصائب والمناک قربانیوں کی تاریخ رقم کرنی پڑی اور مال وجان کے نذرانے پیش کرنے پڑے لیکن آرزو میں صداقت تھی مقصد ارفع تھا کامیاب ہوئے پاکستان معرض وجود میں آگیا اور ہمارے دیرینہ خواب کی تعبیر پوری ہوئی۔ ہم سب خوش تھے کہ ہمیں ایک ایسی سرزمین نصیب ہوئی ہے جہاں ہم اپنے اساسی نظریات کو بتدریج عملی صورت دے سکتے ہیں ایک مربوط اور مضبوط پاکستان بنا سکتے ہیں۔ ہمیں قائد قائدین کی صورت میں حضرت قائد اعظم محمد علی جناح جیسی شخصیت ملی جو دیدہ وری کی صلاحیتوں سے مالا مال تھے اور پاکیزہ کردار اور سوز جگر رکھنے والے مسلمان تھے اور ایک پاکیزہ معاشرہ کی تشکیل کے لئے عزم محکم کی تمام تر قوت کے مالک تھے مگر قدرت نے انہیں مزید اس چمن کو نکھارنے سنوارنے کا موقع نہ دیا اور ہمیں یکے بعد دیگرے ایسے عہدوں سے دوچار کیا کہ ہم بھول گئے کہ ہم نے پاکستان کیوں اور کیسے بنایا تھا اور کس مقصد کو سامنے رکھ کر ایک علیحدہ وطن کی آرزو کی تھی۔ حضرت قائد اعظم محمد علی جناح نے پاکستان بننے کے چار دن بعد اپنے پیغام میں کہا تھا۔

"اب ہم پر عظیم ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ہمارا عزم بھی اتنا ہی محکم اور کوشش اتنی ہی شدید ہونی چاہئے پاکستان کی منزل مراد کے حصول میں ہم

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

نے جو جدو جہد کی اور جو قربانیاں دیں تعمیر قوم میں بھی ہمیں ان کا اعادہ کرنا ہے"۔

۱۴ اگست ہماری تاریخ کا وہ یادگار دن ہے جب ہم نے اپنی کشتی کو اپنی آنکھوں کے سامنے کامرانی سے ہمکنار ہوتے دیکھا۔ ایک ملت کی صورت میں ایک قوم کی صورت میں ایک اسلامی اخوت کی مضبوط شکل میں جیلان سے جولان تک متحد ہونے میں کراچی سے چٹا گانگ تک ہمارا نصب العین ایک تھا۔ ہم سب خوش تھے کہ ہم نے اپنے سے پانچ گنا بڑی طاقت ہندوؤں کو شکست دی ہے رام اور رحیم کے فرق کو واضح کیا ہے؟ Two Nations Theory کی بجائے Two Nations Reality کی بنیاد پر پاکستان قائم کیا ہے۔ پاکستان ایک حقیقت ایک سچائی اور ایسی قوت ہے جسے تائید خداوندی حاصل ہے۔ ہم تھیوری نہیں ہم ٹھوس شکل میں نظریہ ہیں وہ نظریہ جس کی اساس اسلام ہے۔ وہ ریاست جس کی مثال مدینہ کی مثالی ریاست ہے جس میں تین براعظموں تک پھیلے ہوئے مسلمان امن و چین سے زندگی گزارتے ہیں اور ایک خاتون بھی زیوروں اور تمام تر بناؤ سنگھار کے باوجود بے خوف خطر سفر کر سکتی ہے اور اسے خدائے بزرگ و برتر کے سوا کسی اور کا خوف نہیں۔ اسلامی سلطنت میں حقوق العباد کا نظام جاری ہے۔ زکوۃ دینے والے موجود ہیں مگر لینے والے معذرت کے ساتھ کہتے ہیں کہ اب ہم خود صاحبِ نصاب بن گئے ہیں۔ زر گردش میں رہتا ہے اسباب زکوۃ کا سبب بنتے ہیں اور آمدنی پر کوئی ٹیکس نہیں۔ ۱۴ اگست ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ہم نے بحیثیت امت، بحیثیت قوم اپنے جداگانہ تشخص کے عملی اظہار کے لئے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ایک آزاد خود مختار مملکت حاصل کر کے ثابت کیا کہ مسلمان کو غلامی پسند نہیں مسلمان اگر کسی عزم کا اظہار کرتا ہے تو اسے عملی شکل دینے کا سلیقہ بھی رکھتا ہے۔ آج ہم پچاس سال کی تکمیل کر رہے ہیں ہندوؤں کی اس سوچ کو شکست دے رہے ہیں جو یہ کہتے تھے کہ پاکستان بہ مشکل چھ ماہ قائم رہ سکے گا۔ چھ ماہ تو کیا پچاس سال ہم نے عزت و وقار سے گزار لئے ہیں اور پھر آئندہ پچاس سالوں کی تکمیل کے لئے عزم سفر ہو رہے ہیں لیکن پچھلے پچاس سال ہمیں آئندہ کے پچاس سالوں کے لئے کچھ سوچ کے تحفے دے رہے ہیں ہم نے گذشتہ سالوں میں تلخ ترین تجربات کئے ہیں اور کئی ہمارے مسائل ہمارے ایجنڈے پر ادھورے موجود ہیں۔ سقوط ڈھاکہ ہماری ناکامی کا ثبوت ہے کہ ہم وحدت و وفاقیت اور مرکز کو مضبوط نہیں بنا سکے۔ ہم نے شکوک و شبہات پر قابو نہیں پایا بد گمانیوں کا سدِ باب نہیں کیا وسائل کے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

استعمال اور انتقال میں انصاف سے کام نہیں لیا۔ بڑے بھائی ہونے کے ناطے چھوٹے بھائی کو اس کا جائز حق نہیں دیا نتیجتاً چھوٹے بھائی نے ہم سے علیحدہ اختیار کر لی لیکن منانے کی ہم نے کوشش بھی نہ کی بلکہ مفاہمت کا جہاں امکان تھا ہم نے اسے سیاسی چالوں سے ناکام کیا۔

ہم نے اس خطے کی عوام سے وعدہ کیا تھا کہ ہم انہیں اسلام کی عملی شکل مہیا کریں گے مگر ہم نے اسے نعرے تک محدود رکھا۔ نفاذ اسلام کے لئے عملی اقدامات تو در کنار زبانی جمع خرچ میں بھی بخل سے کام لیتے رہے اور آج نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہمارے مالیاتی نظام بنکوں اور سٹاک ایکس چینج کی ضرورتوں کے لئے اسلام کی عملی شکلیں ہم مہیا کرنے میں ناکام رہے ہیں یہ ہمارے ماہرین سود، سٹہ اور مضاربہ کا کوئی ٹھوس حل نہیں نکال سکے۔ ہم نے فروعی مسائل کو ترجیح دی اور اسلام کی مربوط شکلیں کمزور کر دیں۔ دوسری طرف ہمیں یکجہتی کے فقدان پر رونا آتا ہے لیکن ہم نے کبھی اس کے لئے کام ہی نہیں کیا۔ ہم منصوبے بناتے ہیں حکمت عملیاں وضع کرتے ہیں آہنی ہاتھ سے لاء اینڈ آرڈر پر قابو پانے کی بات کرتے ہیں مگر مسائل ہیں کہ قابو میں نہیں آتے۔

ہر سفر کے لئے ایک زاد راہ ہوتا ہے اور زاد راہ ہم نے ساتھ نہیں لیا اگر وہ زاد راہ ہم اپنے ساتھ لے لیں تو ہمیں سفر میں دقت نہیں ہوگی اور وہ صرف مختصر سا زاد راہ ہے یعنی زندگی کے ہر شعبے پر ہر جگہ ہر مقام پر انصاف کیا جائے۔ انصاف کا زاد راہ ہمیں پھر عازم سفر ہونے میں نئی کامیابیوں سے ہمکنار کرے گا اور نامکمل ایجنڈے کو مکمل کرائے گا اور ہمارے خواب جو ابھی ادھورے ہیں شاید انہیں تعبیر ملے شاید انہیں تکمیل ملے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

چائلڈ لیبر

دنیا بھر کے ترقی پذیر ممالک کو جن مشکلات کا سامنہ ہے ان میں بے روزگاری، غربت، جہالت، افلاس، ماحول کی آلودگی، بڑھتی ہوئی آبادی، انسانی حقوق کی پامالی اور چائلڈ لیبر شامل ہیں۔ ہر سطح پر اور ہر مقام پر ان کے خلاف آواز اٹھائی جاتی ہے۔ NGO بھی اس کام میں متحرک ہیں۔ اقوام متحدہ کے معاشرتی ادارے بھی کام کر رہے ہیں۔ کئی سماجی تنظیمیں ان کے خاتمے کے لئے سرگرم عمل ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسائل بڑھتے جا رہے ہیں کم نہیں ہو رہے۔ پرائمری سکول کی سطح پر بچے اور بچیوں کا Drop Out زیادہ ہے آبادی میں بھی اضافہ ا ء ۳ فیصد بڑھ رہا ہے۔ غربت کا یہ حال ہے کہ آپ کسی سڑک پر، کسی پارک میں کسی ہوٹل کے باہر، ریل، روڈ میں گداگروں سے نہیں بچ سکتے۔ ابھی فی الحال فضائی سفر محفوظ ہے ورنہ ایک عام سے سٹور سے لے کر بڑے ہوٹل تک آپ کو زبان سے نہیں آپ کے دامن کے تھام کر بلکہ کھینچ کر توجہ دلانے والے گداگر موجود ہوتے ہیں اور کیسے کیسے ان کے روپ اور توجہ دلائی نوٹس ہوتے ہیں کہ آپ کی عافیت اسی میں نظر آتی ہے کہ کچھ دے کر ان سے جان چھڑائیں ورنہ وہ اس طرح تعاقب کرتے ہیں جیسے بنک والے قرض لینے والے کا۔

جہاں تک چائلڈ لیبر کا تعلق ہے بارہ سال سے کم عمر اور اٹھارہ سال تک کے بچے چائلڈ لیبر میں آتے ہیں پاکستان کے یہ بچے جو تقریباً ۵ کروڑ کے لگ بھگ ہیں محنت مزدوری کرتے ہیں۔ بوٹ پالش کرتے ہیں، ہوٹلوں میں کام کرتے ہیں۔ پلیٹ فارموں پر ملتانی سوہن حلوہ بیچتے ہیں قلیوں کی طرح سامان اٹھاتے ہیں ریل کے ڈبے میں چائے، دال، مونگ پھلی، ریوڑیاں بیچتے ہیں اینٹوں کے بھٹے پر اینٹیں بناتے، اٹھاتے ہیں۔ قالین بناتے ہیں۔ کھڈی پر کام کرتے ہیں۔ ملتان، لاہور، سیالکوٹ، فیصل آباد میں قائم چھوٹی صنعتوں میں پرزوں کی طرح مشینوں کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں۔ سیالکوٹ میں سرجیکل آلات تیار کرتے ہیں۔ سپورٹس کی اشیاء بناتے ہیں۔ زراعت، جنگلات، تعمیرات، فیکٹریوں، ٹرانسپورٹ، صنعتی یونٹ، بجلی، گیس سے وابستہ اداروں میں یہ چائلڈ لیبر موجود ہے۔

یہ بچے غم حالات کا شکار ہیں کسی کی اندھی ماں کی نظریں اس کی آمدنی پر لگی ہوتی ہیں

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

تاکہ چولہا روشن ہو سکے۔ کئی بچوں کے والدین فوت ہو چکے ہیں یا معذور ہیں۔ وہ اپنی بہن اور بھائی کے لئے کماتے ہیں۔ کوئی ان کا ولی وارث نہیں۔ کوئی ان کے سر پر ہاتھ رکھنے وا۔ نہیں۔ بھوک، افلاس کی زندگی گزارتے ہیں۔ معمولی مکان میں رہتے ہیں۔ ایک کمرہ میں چھ چھ افراد اور ایک کمرہ بھی کیا محض ایک غار جہاں روشنی بھی مستعار ہوتی ہے اور تازہ ہوا کے راستے میں ایسی رکاوٹ ہوتی ہے جیسے کسی بارڈر پر خاردار تاریں کسی کو بارڈر کراس کرنے نہیں دیتیں۔

ان حالات میں یہ چاند ستارے جیسے روشن بچے تنہائی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ڈپریشن سوچ کی صحت مند راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ خود اعتمادی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اخلاقی قدریں کمزور پڑ جاتی ہیں۔ خالی ذہن ہوتے ہیں جس نے جو تحریر لکھنی چاہی اسی تحریر کا یہ بچے اشتہار بن جاتے ہیں۔ نشہ، جوا، سگریٹ نوشی، سینما بینی اور انگریزی فلموں کی ایڈونچر کہانیاں انہیں اس مہم جوئی کی طرف لے جاتی ہیں۔ جہاں جرائم کا ایک وسیع سمندر انہیں ہڑپ کرنے کے لئے موجود ہوتا ہے۔

یہ بچے تخلیق کار ہوتے ہیں۔ نئی نئی گالیاں تخلیق کرتے ہیں۔ گلی کونوں پر اس طرح کھڑے ہوتے ہیں کہ موجودہ فلم کا کردار انہیں منا چاہئے تھا۔ جب سے بلو کے گھر والا گانا سنا ہے انہیں اس گانے کے علاوہ اور کوئی گانا اچھا نہیں لگتا۔ ۵ سال سے لے کر ۱۱ سال تک یہ بچے ڈراؤنے خواب دیکھتے ہیں۔ اور ۱۲ سال سے اوپر کی عمر میں پہنچ کر ڈیپریشن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جوانی کی عمر بڑھاپے کو پہنچ جاتی ہے۔ چہرے زرد پڑ جاتے ہیں اور شکلیں ایسی کوئی صابن بھی نہیں دھو سکتا۔

اس مسائل کی وجہ سے ان بچوں کا مجموعی کردار، رویہ کیا بنتا ہے۔ کاش کوئی معاشرہ اندازہ کرتا۔ حکومتی سطح پر بیت المال کے منصوبے میں انہیں سکول مہیا کئے گئے ہیں۔ دودھ بھی ملتا ہے اور دوپہر کا کھانا بھی۔ یقیناً ملتا ہوگا مگر ان بچوں کی صحت بدلتی نظر نہیں آتی۔ وظائف کی کوئی صورت نہیں۔ بنگلہ دیش، نیپال، سری لنکا میں چائلڈ لیبر کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی مگر مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہو سکے چائلڈ لیبر ہر ملک کا مسئلہ ہے مگر اس کا حل بھی ٹھوس اور مثبت ہونا چاہئے۔ یہی معصوم بچے ہمارے ملک کو کارپٹ انڈسٹری سے ۷۰۰ کروڑ روپے زرمبادلہ مہیا کرتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں ہنر موجود ہے۔ انہیں اچھے حالات

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

دیئے جائیں ان کی محنت کا صلہ معقول ہو تو یہ بچے شام کو کسی بھی سکول، اکیڈمی میں پڑھ سکتے ہیں۔ اپنے اچھے گھر بنا سکتے ہیں۔ حکومت اپنی محکمہ لیبر کی معارفت ان کے کوائف اکٹھے کر کے اب ان غریب بچوں کو پلاٹ الاٹ کرے کیونکہ صوبائی اور قومی اسمبلی کے اراکین کو کافی پلاٹ مل چکے ہیں۔ اب ان بچوں کا حق ہے کہ وہ اپنی بوڑھی ماں کو اور اپنے مزید چھوٹے بہن بھائیوں کو بارش اور دھوپ سے بچا سکیں۔ کیا بارش میں انہیں غریبوں کی چھت نے گرنا ہوتا ہے۔ جب چھت گرتی ہے تو علاقے کے نمائندے اظہار افسوس کے لئے آتے ہیں ان کی ہمدردی اخبار کی تصویروں میں شائع ہوتی ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ چھت گرنے سے پہلے تشریف لائیں اور ان بچوں کو بتائیں کہ آپ کی بستی میں سرجیکل، سپورٹس کارپٹ کے کارخانے لگ گئے ہیں۔ صبح کام کرو اور شام کو سکول میں آؤ۔ رات کا کھانا آپ کو سکول میں ملے گا۔ کاپیاں کتابیں آپ کی فلاحی مملکت مہیا کرے گی آپ کو پانچ مرحلے کے پلاٹ سرکار مفت دے گی۔ تعمیر کے لئے آپ کو ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن سے بغیر سود کے قرضہ ملے گا۔

ان مراعات کے بعد چائلڈ لیبر کا مستقبل سنور جائے گا مگر ایسی پالیسی کب۔ کہاں اور کون دے گا؟ ہمارے دوست ڈاکٹر صبور غیور نے بارہ سے زیادہ کتابیں چائلڈ لیبر پر لکھ دی ہیں۔ انہیں کون پڑھے گا اور ان کی سفارشات عمل کی سنگلاخ زمین پر کیسے اتریں گی۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ٹیوشن

ٹیوشن ایک عام فہم لفظ ہے مگر بلا کی طلسماتی کشش رکھتا ہے ہر کمزور طالب علم کو یقین ہوتا ہے کہ پورے بورڈ میں اس کے اول آنے کے سو فیصد چانس ہیں۔ یہ لفظ نہیں امرت دھارا ہے۔ کئی اداروں سے وابستہ اساتذہ کرام کی زندگی کا سہارا ہے مگر اس لفظ کے ساتھ کبھی انصاف نہیں ہوا۔ یہ وہ لفظ ہے جسے کبھی بے حد چاہا جاتا ہے اور کبھی جی بھر کر نفرت کی جاتی ہے کچھ لوگ اسے معاشرے کا ناسور کہتے ہیں کچھ اسے تعلیمی انحطاط کی خشت اول سے تعبیر کرتے ہیں کچھ اسے معاشرے کی ناگزیر برائی کہتے ہیں ایک لفظ ہے اور کئی اس کے نام ہیں کبھی محبت کی علامت کبھی نفرت کی صورت اور کبھی مجبوری کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ اس لفظ کی وجہ سے کئی سکول، کئی کالج دن کے وقت ویران، کلاس روم پریشان مگر جونہی شام کے پانچ چھ بجتے ہیں وہی کلاس روم وہی طلبا، وہی اساتذہ انتہائی مصروف نظر آتے ہیں کئی اکیڈمیاں روشن ہو جاتی ہیں کئی بیٹھکیں آباد شاد ہو جاتی ہیں۔ شفٹ سسٹم شروع ہو جاتا ہے ایسے لگتا ہے جیسے گلی محلے میں چھوٹی چھوٹی صنعتیں لگ گئی ہوں اور ٹیوشن نے ایک کاروبار کی شکل اختیار کر لی ہو۔

ویسے تو کسی زمانے میں صحافت بھی ایک مشن شمار ہوتا تھا۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ اسے انڈسٹری کی صورت مل گئی اس طرح تعلیم بھی ایک مشن تھا جسے ماہرین تعلیم دل و جان سے نبھاتے تھے۔ چلتے پھرتے طلبا کو گائیڈ کرتے اور کبھی دست سوال نہ کرتے۔ کیونکہ یہ بات تعلیم کی روح کے خلاف تھی اس سے ان کے خیال کے مطابق اساتذہ کی خودی مجروح ہوتی تھی۔ اور طالب علم یہ محسوس کرتا تھا کہ وہ استاد کو کچھ دے رہا ہے اور استاد یہ محسوس کرتا کہ وہ شاگرد کا زیر بار ہو رہا ہے لیکن جب سے یہ ٹیوشن کی صورت نکلی ہے دونوں کی سوچ ایک جیسی ہو گئی ہے دونوں ایک دوسرے کی ضرورت بن گئے ہیں اور نظریہ ضرورت کو ہم پہلے ہی تسلیم کر چکے ہیں اس لئے ٹیوشن ہمارے معاشرے میں تیزی سے رچ بس گئی ہے۔ اکثر یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ جو بچہ ٹیوشن پڑھنے سے انکار کرے یا اپنے والدین کی مجبوری بیان کرے اس کی مجبوری کو بہانہ سمجھا جاتا ہے اور ایسے طالب علم کو کلاس میں اور کلاس سے باہر اس طرح تنہا کر دیا جاتا ہے کہ گویا وہ اچھوت بن گیا ہے اس کی ترقی میں رکاوٹ پیدا کی جاتی

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ہے اس کے نتائج میں ڈنڈی ماری جاتی ہے امتحان میں ایسے طالبِ علم سے ایسے سوالات کئے جاتے ہیں کہ وہ پریشان ہو جاتا ہے اور سکول یا کالج میں اس کے لئے ایسے حالات پیدا کر دیئے جاتے ہیں کہ وہ ادارہ چھوڑنے کو ترجیح دیتا ہے۔ یا تعلیم سے دور چلا جاتا ہے۔ جبری ٹیوشن ایسے ہی ہے جیسے آج کل جبری ریٹائرمنٹ کا مسئلہ ہے۔ پرانے ملازمین کے ساتھ جس طرح بے انصافی ہو رہی ہے کچھ اس نوعیت کی بے انصافی غریب طالبِ علموں کے ساتھ ہوتی ہے ٹیوشن پڑھو ورنہ گھر جاؤ۔

یہ ٹیوشن سنٹر کم ہیں بلکہ پروئیویٹ کلینک بن گئے ہیں اگر یہی اساتذہ کلاسوں میں پڑھائیں اور اپنے ڈیوٹی آور مکمل کریں تو ٹیوشن کی نوعیت ہی نہ آئے۔ کلاس روم صرف اس لئے ہیں کہ طلبا کو ترغیب دیں کہ وہ گھر پر آئیں اور ٹیوشن پڑھیں اگر اساتذہ سے کلاس روم چھین لئے جائیں اور کلاس روم کی بنیاد نہ رہے تو پھر کون ان کے پاس ٹیوشن پڑھے گا۔ اگر کوئی ڈاکٹر ہسپتال سے فارغ ہو جائے تو شام کو اس کے کلینک میں مریض کم ہو جاتے ہیں اسی طرح تعلیمی ادارے ٹیوشن کا سبب بنتے ہیں۔ اگر تعلیمی ادارے صرف تنخواہ کے لئے ہیں تو پھر کلاس روم۔ کامن روم، سٹاف روم کے قائم رہنے کا کوئی جواز نہیں تعلیمی ادارے اگر ٹیوشن کی ترغیب سے محروم ہو جائیں تو یہی ادارے اعلیٰ انسان، اعلیٰ افسر اور اعلیٰ درجہ کے منتظم پیدا کر سکتے ہیں ٹیوشن سے اچھے نمبر تو آ سکتے ہیں لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ ٹیوشن پڑھنے والا اس تربیت سے بھی آگاہ ہو جائے گا جو ایک ادارہ، ایک درسگاہ ایک دانش مہیا کرتا ہے آج طلبا تربیت سے محروم ہیں البتہ نمبروں سے مالا مال ہیں۔ ٹیوشن کرنے والوں سے اگر کوئی احتجاج کرے تو ان کا جواب نہایت مدلل ہوتا ہے کہ ٹیوشن کے مفہوم سے جو آگاہ نہیں وہی اعتراض کرتے ہیں۔ ٹیوشن کسے کہتے ہیں؟ ٹیوشن اس تعلیم یا ہدایت کو کہتے ہیں جو آپ کو قیمتاً ملے یا جس کی ادائیگی آپ کو کرنی پڑے۔ ٹیوشن سنٹر کوئی فلاحی یا رفاعی ادارہ نہیں اور نہ ہی تعلیمِ بالغاں کا کوئی مرکز ہے ان اداروں نے اپنے سٹاف اور عملہ کو تنخواہیں دینی ہوتی ہیں ویسے بھی ٹیوشن سنٹر والے کوئی اشتہار شائع نہیں کرتے کہ آپ ضرور آئیں۔ لوگ مجبور کرتے ہیں لوگوں کو اعتبار ہے کہ ان سنٹروں سے پڑھا ہوا شخص بڑا افسر بنتا ہے۔ انہیں سنٹروں کے پڑھے ہوئے ڈاکٹر، انجینئر، سی ایس پی کے عہدے پر فائز ہوتے ہیں۔ غنیمت ہے کہ اس گئے گزرے ماحول میں قیمتاً ایسی تعلیم مل جاتی ہے ورنہ تعلیم ہمارے ملک میں

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کہاں ؟ ناخواندگی کی شرح صدیوں سے ایک ہے کوئی فرق نہیں۔ ٹیوشن سنٹر آباد ہیں اساتذہ اور طلبا مصروف ہیں پھر ان وسیع و عریض اداروں کمروں، تدریسی بلاکوں، لیبارٹریوں، لائبریریوں کا کیا کیا جائے جن پر کروڑوں کی گرانٹ صرف ہوتی ہے قاضی آفاق حسین ایڈیشنل سیکرٹری تعلیم پنجاب نے ایک دفعہ بتایا تھا کہ ساڑھے چار لاکھ محکمہ تعلیم میں افراد موجود ہیں ان کی تنخواہیں ان کے واجبات کس شمار میں جائیں گے اگر قوم کے بچے ٹیوشن پڑھنے پر مجبور ہیں اگر ٹیوشن اتنی ضروری ہے تو ساری گرانٹ شاملاتی ایڈمیوں اور ٹیوشن سنٹروں کو منتقل کر دی جائے تاکہ مزید اچھے افسر پیدا ہو سکیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کوثر علم کے ساقی مگر بے بسی کے شاقی

علامہ علاؤالدین صدیقی مرحوم پنجاب یونیورسٹی لاہور کے وائس چانسلر تھے کچھ شہر پسندوں نے ان کے گھر میں گھس کر توڑ پھوڑ کی اور ان کے گھر کو نقصان پہنچایا تو جب ان سے صحافیوں نے پوچھا کہ اس معاملے کا ماجرا کیا ہے تو ان کا جواب نہایت موزوں تھا کہ معلم کی بے بسی کا منظر پیش منظر ہے۔ اس واقعہ کو گزرے تقریباً ۲۵ سال ہو گئے ہیں لیکن یہ واقعہ ذہن کے گوشوں میں اس طرح محفوظ ہے کہ کبھی اسے بھول نہیں سکے۔

گذشتہ دنوں اخبارات میں تواتر سے کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے ہیں جنہوں نے ماضی کے زخم پھر تازہ کر دیئے ہیں۔ ایف سی کالج لاہور کا حالیہ واقعہ جس میں پولیس نے کالج کے ہوسٹلوں اور اساتذہ کے گھروں پر چھاپے ڈالے۔ ایک پروفیسر کے اہلِ خانہ سے بد تمیزی کی اور ایک استاد کے منہ پر تھپڑ جڑ دیا گیا۔ ایسی مثالیں اور جگہوں سے بھی ملی ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ استاد جو ادب گہہ محبت کا محافظ کوثر علم کا ساقی ہے جس کی عزت و حرمت کے لئے اسے معلمی جزو پیغمبری سے تعبیر کیا گیا ہے وہ اس قدر تذلیل اور تحقیر کا نشانہ کیوں بنا ہے۔ جن پولیس والوں نے یہ حرکت کی ہے کیا ان کا کوئی استاد نہیں انہوں نے کہیں سے تعلیم حاصل نہیں کی اگر ان کے استادوں نے انہیں یہ تعلیم دی ہے تو اس کا ذمہ دار کون ہے؟

ہمارے صحافی بھائی قاسم جعفری نے گذشتہ دنوں پولیس ٹریننگ سنٹر کا سروے تیار کیا جس میں کہا گیا کہ کھلی جگہ پر آسمان کے نیچے پولیس کی کلاسیں لگتی ہیں ان کے لئے کوئی کلاس روم نہیں اور انہیں کیا پڑھایا جاتا ہے اس کا ماہرین تعلیم کو علم نہیں۔ پولیس اکیڈمیاں کیا سلیبس تیار کرتی ہیں کہاں سے منظور کراتی ہیں انہیں کون منظور کرتا ہے اور کون ان کے نتائج کا جائزہ لیتا ہے یہ سب کچھ غیر معلوم ہے۔ شنید یہ ہے کہ پولیس کی تربیت میں کہیں نہ کہیں کمی ضرور ہے جو انہیں زیادہ مہذب بنانے اور شہریوں سے اور صاحبِ علم لوگوں سے بات کرنے کا طریقہ سلیقہ سکھائے۔

ایک زمانہ تھا کہ کسی بھی تعلیمی ادارے میں پولیس نہیں جاتی تھی کہ تعلیمی ادارے کا تقدس مجروح ہوتا تھا اگر کہیں زیادہ مجبوری ہوتی تو ادارے کے سربراہ سے اجازت لیتے اور مطلوبہ مقاصد کی تکمیل کے بعد سلیقے سے رخصت ہوتے۔ آج حالت یہ ہے کہ پولیس اپنے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

بے پناہ اختیارات کی بنا پر کسی سکول، کالج کی بات الگ ہے ملک کی اعلیٰ درسگاہوں یعنی یونیورسٹیوں میں بغیر اجازت کے چھاپے مارتی ہے اور وائس چانسلر کو اس وقت اطلاع کرتی ہے جب شب خون مکمل ہو جاتا ہے۔ وائس چانسلر ایک بلند مرتبہ انسان ہوتا ہے جو عمر بھر جلنے اور علم و ادب اور تحقیق میں نام پیدا کرنے کے بعد بنتا ہے مگر وہ عام لوگوں اور پولیس والوں کے لئے کیوں وجہ امتیاز نہیں بنتا اس کی وجہ بھی ہماری اقدار کی بے حسی ہے کہ ہم نے کبھی وائس چانسلر کو وہ مقام اور وہ مرتبہ نہیں دیا جو اپنے علاقہ کے ایس ایچ او کو دیتے ہیں کیونکہ ایس ایچ او اپنے تھانہ میں بادشاہ ہوتا ہے اور وائس چانسلر اپنے کیمپس جو کم و بیش ہزار ڈیڑھ ہزار ایکڑ اراضی میں قائم کیمپس میں ایک معمولی استاد ہوتا ہے اور یہ اساتذہ ہماری تعلیم اور ہماری تہذیب کی بنیاد گڑی ہیں ان کی خدمات سے نئی نسل کا درخشندہ مستقبل وابستہ ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو انسان کو عظیم تر انسان بناتے ہیں۔ ان کی وحشی جبلتوں کی تہذیب کرتے ہیں۔ علم و ہنر میں یکتا کرتے ہیں اور ایک ایسے جہان معنی کی تخلیق کرتے ہیں جو طالب علم کو اپنے استاد کا وہ ورثہ دیتے ہیں جس کی مارکیٹ میں کوئی قیمت نہیں تربیت اور تہذیب کا کوئی مول نہیں۔

بین الاقوامی شہرت کے مالک ڈاکٹر عبدالقدیر نے ملتان کے دورے کے موقعہ پر کہا تھا کہ میں آج بھی فخر محسوس کرتا ہوں کہ میں نے اپنے استادوں کی جوتیاں سیدھی کیں۔ یہ انہی کا صدقہ ہے کہ میں آج اس مقام پر فائز ہوں۔ مگر ہمارے استاد آج پولیس سے تھپڑ کھاتے ہیں۔ ایف سی کالج اپنی درخشندہ روایات اور اپنے وسیع و عریض کیمپس کی وجہ سے منفرد رہا ہے۔ یہاں کے اساتذہ نے علم و ادب میں بڑا نام کمایا ہے۔ اگر یہاں بھی سیاست سے جراثیم پیدا ہو گئے ہیں تو اس کا حل کالج کے پرنسپل صاحب نکال سکتے ہیں۔ پولیس کے چھاپے معیار تعلیم کو بڑھا نہیں سکتے البتہ رسوا اور ذلیل کر سکتے ہیں۔

تعلیمی اداروں کو سیاست سے پاک ہونا چاہئے لیکن یہ کام سیاست دانوں کا نہیں ایک معلم کا ہے کہ وہ اپنے طالب علم کے ذہن میں آنے والے واقعات کا صحیح نقشہ ترتیب دے تاکہ طالب علم اپنے مستقبل کا خود فیصلہ کر سکے۔ مگر یہ سب کچھ کوثر علم کے ساقی سے ملے گا اگر چشمہ خشک ہو جائے تو کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی تہذیب نہیں ابھرتی۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

نفاذ اردو دفتری زبان

ہر ضلع میں ایسی کمیٹیاں بھی ہیں جن کا تعلق تشتند ،گفتند ،بر خاستند سے آگے نہیں بڑھتا۔ چھ ماہ کے بعد ایک اجلاس ہوتا ہے چند ماہرین یکجا ہوتے ہیں خوبصورت ہال میں بیٹھ کر انتہائی خوبصورت باتیں کر کے موسم کے مطابق مشروبات پیتے ہیں۔ یہ مشروبات عموماً سادہ پانی اور بے ذائقہ چائے پر مشتمل ہوتا ہے اس سے محظوظ ہونے کے بعد رخصت ہو جاتے ہیں اور پھر اس کمیٹی کی روئیداد تیار ہوتی ہے جو زیادہ تر صدر نشیں کے دلنشیں پر مشتمل ہوتی ہے اور باقی ماہرین کی حاضری کا ریکارڈ ہوتا ہے۔ انہیں کمیٹیوں میں سے ایک کمیٹی نفاذ اردو دفتری زبان کی ہے۔ وزیرِ اعلیٰ پنجاب غلام حیدر روائیں مرحوم کے زمانے میں یہ کمیٹیاں بڑی فعال تھیں ملتان میں اگرچہ ہر دور میں نامور ادیب ،دانشور ،ڈپٹی کمشنر آتے رہے ہیں لیکن ان میں نفاذ اردو دفتری زبان کو جنہوں نے مقبولیت دی وہ سید شوکت علی شاہ تھے۔ ایک عالمی سیمینار ایک مشاعرہ اور نمائش کتب کا اہتمام کیا گیا اور اردو کی دفتری صلاحیت بڑھائی گئی اسی نوعیت کا اہتمام ضلع خانیوال نے مخدوم محمد سجاد حسین قریشی گورنر پنجاب کی صدارت میں کیا جس میں ماہرین کو بلانے میں مرتضیٰ برلاس ڈپٹی کمشنر ضلع خانیوال نے شاندار انتظامات کئے اس کے بعد یہ کمیٹیاں کسی ایسے کونے میں دفن ہوئیں اور ان پر فاتحہ پڑھنے کو جگہ بھی نہیں ملی۔

ملتان میں بھی ایسی کمیٹی موجود ہے اور امید ہے کہ جناب ڈپٹی کمشنر ملتان ظفر سلیم چوہدری اسے از سرِ نو زندہ کرنے کا دلچسپی فرمائیں گے۔ یہ ایک عملی اور فکری کام ہیں اور اردو سے ایک روحانی اور جذباتی وابستگی کا نام بھی ہے اور دفتروں میں اردو کو رائج کرنے اور اپنے کلچر سے آگاہ ہونے کی کوشش بھی ہے۔ ہمیں اس موقع پر فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ برصغیر میں مسلمانوں کے ایک ہزار برس کے اقتدار اور ثقافتی انجذاب کا ایک ثمر اور مظہر اردو زبان بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں عقیدہ مسلمانانِ برصغیر کے تشخص کی بنیاد بنا اور نظریہ اسلام اور نظریہ پاکستان کی اساس پر ہم نے جدوجہد آزادی کی وہاں اردو بھی مسلمانوں کی شناخت کا وصیلہ بنی ۔ چنانچہ ہندی اردو تنازعہ کو دو قومی نظریہ کے فروغ کے تناظر میں دیکھنا ضروری ہے اس لئے جب بانی پاکستان حضرت محمد قائداعظم محمد علی جناح نے اردو کو پاکستان

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کی قومی زبان کے ساتھ تو کسی کو تعجب نہیں ہوا تھا اردو ہماری پہچان اور شناخت اور قومی ترقی کا مظہر ہے جس کے بارے میں کوئی دوسری رائے نہیں ہو سکتی لیکن اسے دفتروں میں کیسے رائج کیا جائے اس کے بارے میں بڑی سنجیدگی اور فوری سوچ کی ضرورت ہے۔

ہمارے ملک کی بیشتر آبادی صرف اردو جانتی ہے اور اردو ہی میں دوسرے کی بات کو سمجھ سکتی ہے لیکن دفتروں میں ابھی تک انگریزی کے نفاذ میں انہیں انگریزی طبقہ کی منت کرنا پڑتی ہے کہ وہ ان کی بات کو بڑے افسر تک پہنچائیں دفتری زبان اردو ہو جانے کی صورت میں فائلوں کی رفتار تیز ہو جائے گی۔ انصاف سہل اور بروقت ہو سکے گا۔

ہمارے دفاتر ابھی تک پرانی طرز پر چل رہے ہیں وہی فرسودہ فعال وہی بیکار فائلیں، رجسٹر جن کا اندراج اپنی اہمیت کھو بیٹھے ہیں ایک سائل کو پُر کرنے پڑتے ہیں۔ ہم عملاً کہتے ہیں کہ اسلام میں ذات پات کی گنجائش نہیں لیکن جب فارم پُر کرتے ہیں تو نہ صرف ذات کا خانہ ہوتا ہے بلکہ ''سر نام'' گوت اور Subcast کا اندراج کرنا پڑتا ہے اور ایسی کئی بیکار معلومات کا اضافہ کرنا پڑتا ہے جن کی آج کے دور میں ضرورت ہی نہیں۔ انگریزی ہمارے نظام میں ایسی رچ بس گئی ہے۔ ایک آدمی کی بیٹی لاہور، اسلام آباد بھیجنے کے لئے ریلوے کے محکمہ سے جو فارم ملتا ہے وہ بھی انگریزی میں چھپا ہوتا ہے اور بیچارہ ان پڑھ ملازم ریلوے اسٹیشن پر پڑھے لکھے آدمی کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے کہ کوئی اسے فارم پُر کر دے۔

دفتروں میں اردو کے نفاذ میں جو سب سے بڑی رکاوٹ پیش کی جاتی ہے کہ اردو ٹائپ رائٹر کم ہیں یا اردو ٹائپسٹ نہیں یا اردو کی اصطلاحات انگریزی کے مقابلہ میں مشکل ہیں مثلاً رجسٹرار کا اردو لفظ ''مسجّل'' ہے ان مشکلات کا ازالہ کون سی مشکل بات ہے جس طرح انگریزی کے ٹائپ رائٹر خریدے جاتے ہیں اسی طرح اردو کے خرید کر لئے جائیں جس طرح انگریزی ٹائپ سکھائی جاتی ہے اسی طرح اردو ٹائپ سیکھنے کا اہتمام کیا جائے۔ جہاں تک اردو کے مشکل الفاظ کا تعلق ہے یہ کیونکہ عموماً فارسی، عربی سے لئے جاتے ہیں اور عربی فارسی جاننے والے ہمارے ہاں کم ہیں اس لئے یہ لفظ اجنبی لگتے ہیں اگر انگریزی کی اصطلاحات کا ترجمہ اردو میں کیا جائے تو کسی کو بھی دقت نہیں ہوگی۔ ہمارے ہاں اردو کے بہت سے لفظ آسانی سے آج بھی دفتروں میں بولے اور سمجھے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر، ڈاکخانہ، پوسٹ آفس، ریلوے اسٹیشن، کچہری، جج، ایڈووکیٹ وغیرہ شامل ہیں۔ ہمیں اردو دفتروں

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

میں رائج کرنے کے لئے سادہ اور عام فہم زبان کی ضرورت ہے اردو کا ادبی لب و لہجہ ہمارے دفتروں میں نہیں چل سکتا۔ اس کے لئے اردو Functional Language کی ضرورت ہے جو روزمرہ کے معاملات کو بخوبی چلا سکے۔ دامن اردو وسیع ہے وہ الگ بات کہ ہم نے کئی عذر کے بت تراش لئے ہیں۔

اردو ہمارے تمام دفتری، سرکاری، تعلیمی اور صحافتی امور کو بخوبی سر انجام دے رہی ہے۔ کمپیوٹر، فیکس کی سہولتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ اردو اب کوئی ایسی زبان نہیں عصر حاضر کا ساتھ نہ دے سکے۔ فی الحال اردو کے نفاذ میں جو رکاوٹ ہے وہ ہماری اپنی سوچ کی ہے۔ ہماری سوچ ابھی انگریزی کی سمری، نوٹ اور ڈرافٹ میں الجھ گئی ہے۔ اس سے کب باہر آئیں گے جب ہر ضلع کی نفاذ اردو کمیٹی فعال ہو جائے گی۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

مسجد

مسجد اللہ کا گھر ہے۔ اسے بنت کعبہ بھی کہتے ہیں۔ مسلم تہذیب کا اگر کوئی زندہ معجزہ اگر مغربی دنیا کو حیرت میں ڈال سکتا ہے اور اپنی عظمت کا سکہ منوا سکتا ہے تو وہ مسجد ہے جس کے دروازے پر ہم نے پولیس بٹھا دی۔ ہماری تہذیب کا وہ کمال جس پر ہم فخر کرتے تھے اور یورپ حیرت کا اظہار کرتا تھا کہ سنگ و خشت کی نادر تعمیرات میں اس قدر علم پوشیدہ ہے یہ مسجد کیا ہے ایک علم کا خزانہ ہے اس کے مینار عمودی زاویوں کی پہچان۔ اس کے ستون ٹرگنومیٹری اور جیومیٹری کی اشکال اس کے منبر و محراب فلکیات اور طبیعت کے علوم کے آئینہ دار ہیں۔ مصوری اور خطاطی، میناکاری اور کاشی گری اس کے حسن جمال کو نکھارتی ہیں۔ مسجد روح کی پاکیزگیوں اور تطہیر کا ذریعہ اور ذکر الٰہی میں مگن کرنے کا نام ہے۔ مسجد کے قیام کا تصور اس وقت بھی موجود تھا جب حضرت آدم بھی موجود نہ تھے ساتویں آسمان پر عرش بریں کے نیچے بیت المعمور جسے عرف عام میں فرشتوں کی مسجد کہتے ہیں کعبہ بالکل اس کے نیچے ہیں اتنا نیچے اگر اوپر سے ایک پتھر پھینکا جائے تو وہ کعبہ کی چھت پر گرے دوسرے لفظوں میں کعبہ ایک مرکز ہے جس کا دروازہ عرش پر کھلتا ہے۔ ہماری دعائیں براہ راست وہاں پہنچتی ہیں (حوالہ ڈاکٹر حمید اللہ مقالہ خصوصی پرچہ نومبر ۱۹۸۰ء) مسجد مسلم تہذیب کی پہچان اس کی ثقافت اور کلچر کی امان ہے۔ مسلمانوں نے کہاں کہاں مسجدیں تعمیر نہیں کیں اگرچہ پوری کائنات مومن کے لئے مسجد کا درجہ رکھتی ہے مگر مسلمانوں کے سوز دل نے مسجد کی صورت میں ایسے نقش ابھارے ہیں کہ وہ قیامت تک زندہ رہیں گے۔ مسجد اقصیٰ پیغمبروں کی مسجد۔ سرزمین حجاز کی مساجد، یمن کی مسجد، صفا مسجد ازہریہ، مسجد اشرفیہ تاتاط، اندلس کی جامع مسجد قرطبہ جس کے کنارے کوئی مرد مومن اکیسویں صدی میں اسلام کی صدی کے خواب دیکھ رہا ہے۔ مسجد قرطبہ حضرت علامہ محمد اقبال کی تمناؤں اور آرزوؤں کی مسجد اور مسلم تہذیب کا وہ عظیم شاہکار جو سپین میں دیوار شکستہ سے نقش و نگار کی حفاظت کر رہا ہے اور آنے والے دنوں کی نوید دے رہا ہے کہ شاید پھر کوئی حدی خواں کوئی نمازی کوئی غازی جو قرطبہ اسلام کی تبلیغ اور سچائی کی عظمت کے لئے پھر اترے جیسے موسیٰ بن نصیر طارق ابن زیاد کی صورت میں سپین کو پھر اسلام کی سرزمین بنا دیں۔ جامع مسجد شبیہ پہلی صدی ہجری کی مسجد،

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

مسجد طلیطلہ پھر غازیان اسلام کی اذانوں کی منتظر ہیں۔ مراکش کی مسجد قرادین تیسری صدی ہجری کی روایات کو زندہ کرتی ہیں ایک مشہور یونیورسٹی کا درجہ رکھتی ہے رباط کی مسجد حسن، جامع مسجد تنمل، الجزائر کی مسجد المنصور تلمسان آٹھویں صدی ہجری کی اسلامی اقدار کو سامنے لاتی ہے۔ تیونس کی جامعہ مسجد قیروان تیسری صدی زینو تبہ مسجد تیونس پھر مصر کی وہ مسجد جو یونیورسٹی کا درجہ رکھتی ہے جامعہ الازہر قاہرہ، فاطمی دور حکومت کی یادگار مسجد عمرو بن العاص، مسجد ابن طولون قاہرہ، مسجد مدرسہ سلطان حسن قاہرہ، مسجد محمد علی قاہرہ شام میں مسجد عمر دوسری صدی ہجری جامع مسجد دمشق اموی عہد کی عکاسی کرتی ہے۔ ترکی میں جامع مسجد برصہ آٹھویں مسجد و مزار شہزادہ محمد استنبول، جامع مسجد منصوبہ سلیمانیہ، استنبول، جامع مسجد سلطان احمد، استنبول، جامع مسجد مرادیہ، عراق میں مینار جامع القمریہ، ایران میں جامع مسجد اردستان، جامع مسجد اصفہان، مسجد شاہ اصفہان، اس طرح بخارہ میں کلیاں مسجد، شمر قندھ کی مسجد بی بی خانم افغانستان میں مسجد نوگنبد بلخ بھارت میں جامع مسجد احمد آباد، قوت الاسلام، مسجد دہلی، جامع مسجد دہلی، موتی مسجد دہلی، جامع مسجد فتح پور سیکری، مقبوضہ کشمیر میں جامعہ مسجد سری نگر۔

پاکستان میں محمد بن قاسم کی قائم کردہ مساجد مسجد نیلاگنبد، مسجد وزیر خاں، سنہری مسجد لاہور، شاہی مسجد لاہور، مسجد بھونگ رحیم یار خاں، مسجد شاہی ٹھٹھہ، الیاسی مسجد ایبٹ آباد، مسجد عید گاہ ملتان، غرض یہ کہ پوری دنیا میں بلاد اسلام میں ہزاروں کی تعداد میں وہ مساجد موجود ہیں جو جوش ایمانی اور جذبہ حمیت دینی کی مظہر ہیں۔ مسجد شب بھر۔ مسجد تو بنادی شب بھر میں والی نظم علامہ محمد اقبال نے اسی نظم کے بارے میں لکھی تھی۔

مسلم تمدن اور اسلامی ریاست میں مسجد جی ایچ کیو کا درجہ رکھتی ہے۔ مسجد بطور عدالت، سپریم کورٹ ہے۔ پارلیمنٹ ہے۔ مسجد شوریٰ سرکٹ ہاؤس Combined Military Hospital (CMH) دارالحکومت غرض یہ کہ مرکز ثقافت سے لے کر مرکز سیاست مسجد ہی مسجد ہے۔ لیکن ہم نے مسجد کو کیا بنادیا ہے۔ ہم نے اسے ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان سے دور کر دیا ہے۔ ایک فرقہ کا دوسرے فرقہ کا داخلہ ممنوع کر دیا ہے بلکہ بورڈ آویزاں کر دیئے ہیں۔ لاؤڈ سپیکر ایسے منتخب کئے ہیں کہ دوسرا مسلک رکھنے والے مسلمان مسجد سے دور چلا گیا ہے۔ دہشت گردی اور فرقہ واریت کے ہاتھوں مسجد ویران ہو گئی ہے۔ پولیس کے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

پوچھتے ہیں باہر سے آنے والا جب دیکھتا ہے کہ ایک مسلک جو اسلام کی اساس پر قائم ہوا اس مسلک کے مسلمان اپنی مسجد کو محفوظ نہیں رکھ سکتے۔ مسجد سے تحمل، تدبر، رواداری اور رخصت ہو رہے ہیں۔ زبان سے ہر کوئی لا الہ الا اللہ کا ورد کرتا ہے لیکن ہم اپنے اندر تعصبات، نفرت کے بت چھپائے پھرتے ہیں۔ فرقوں، تصادم، بغض و عناد کے بت کو توڑے گا۔ مسجدوں کو کون آباد کرے گا۔ جس مسجد کو ہم نے مغربی دنیا کی ایجادات، اختراعات سے مقابل پیش کرتا تھا وہ مسجد ہم نے مقفل کر دی ہے۔ صدر دروازے پر لکھ دیا ہے کہ نمازی اپنی جوتی کی خود حفاظت کرے۔ جب کوئی مسجد میں داخل ہو تو اسے سامان مل جاتا ہے۔ یہاں مسجدیں امان سے محروم کیوں ہیں؟ معصوم نمازیوں پر حملے کیوں۔ معصوم بچوں کی لاشوں اور خون مسلم کی ارزانی اور وہ مسجد میں۔ ہم مسجد کو کیا شکل دے رہے ہیں۔ مسجد تو مسلمانوں کی سب سے بڑی متاع ہے۔ مادی اور روحانی ضرورتوں کی تکمیل بے روح اور جسم و قوت کو بحال کرنے کا کام کرتے آئیے۔ مسجد کو پھر وہی مقام وہی مرتبہ دیں جو اس کا حق ہے۔ مسجدیں آباد ہوں تو اہل شہر حفظ و امان میں ہوتے ہیں اور اگر مسجدیں ویران ہوں تو رہنے والے بھی پریشان ہوتے ہیں۔ آئیے اپنی پریشانیاں دور کریں اور مسجد کو چلیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

بہاءالدین زکریایونیورسٹی ترقی کی شاہراہ پر

بہاء الدین زکریایونیورسٹی ملتان جنوبی پنجاب کی وہ منفرد دانش گاہ ہے جس نے ۱۹۷۵ء سے لے کر ۱۹۹۷ء تک کے ۲۲سالہ دور میں علم وعرفان، شعور وآگہی، فکر ونظر کے ایسے چراغ روشن کئے ہیں جن کی بدولت پورے علاقے میں خواندگی، بلند معیارِ زندگی اور صنعتی وزرعی ترقی کے روشن امکانات پیدا ہوئے ہیں۔ طلباء وطالبات کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ پورے ڈویژن میں پہلے صرف ۲۶ ڈگری کالج تھے اب ۶۵ ڈگری کالج قائم ہو چکے ہیں۔ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی تقریباً ۲۵ تدریسی شعبہ جات پر مشتمل ہے۔ جس میں کئی نئے اضافے ہوئے ہیں جن میں بی-بی-اے، ایم-کام، بی-ایس-سی کمپیوٹر، ایم-ایس-سی کمپیوٹر، ایم-بی-اے، انجینئرنگ میں سول انجینئرنگ کی کلاسز جاری ہیں۔ این-ایف-سی انسٹی ٹیوٹ (کھاد فیکٹری) کے الحاق سے بی-ایس-سی کیمیکل کی کلاسز جاری ہیں۔ یونیورسٹی الیکٹریکل انجینئرنگ کی کلاسوں کا اجراء کرنے کی بھی کوشش کر رہی ہے۔ یونیورسٹی جہاں تدریس، تحقیق کو فروغ دے رہی ہے وہاں یونیورسٹی تعمیرات کی صورت میں نئے بلاک تعمیر کر رہی ہے۔ جن میں انتظامی بلاک مکمل ہو چکا ہے اور وہاں کنٹرولر امتحانات کے دفاتر، ٹریژار کے دفاتر، پروجیکٹ ڈائریکٹر کے دفاتر منتقل ہو چکے ہیں۔ رجسٹرار اور وائس چانسلر کے دفاتر چند دنوں تک منتقل ہو جائیں گے اس کے علاوہ یونیورسٹی میں سٹاف کالونی میں متعدد گھر تعمیر ہو چکے ہیں اور پروفیسر اور دیگر عہدوں پر فائز اساتذہ اور انتظامی افسران کو الاٹ ہو چکے ہیں۔

بہاء الدین زکریا یونیورسٹی اپنے محدود وسائل کے باجود نصابی، تعلیمی اور تعمیراتی سرگرمیوں میں پیش رفت کر رہی ہے۔ انجینئرنگ کے شعبہ کے منتقل بھی آخر مراحل میں ہے۔ یونیورسٹی انجینئرنگ کالج اپنا بھرپور اور فعال کردار ادا کر رہا ہے۔ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی کا زرعی کالج بھی ارتقائی مرحلوں میں ہے۔ اداروں کو وجود میں آنے کے لئے وقت مطلوب ہوتا ہے۔ یونیورسٹی زرعی کالج اپنے قابل قدر اساتذہ کی نگرانی میں معیاری تعلیم اور تدریس کو جدید خطوط پر مہیا کر رہا ہے۔ کچھ لوگ اعتراض برائے اعتراض کے حامی ہیں۔ انہیں ہر چیز میں انتشار، افتراق نظر آتا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر عاشق محمد خان دُرانی وائس چانسلر نے یونیورسٹی کو ایک مثبت سمت فراہم کی ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کی قائم کردہ تعلیمی تدریسی روایات کو آگے بڑھا رہی ہے۔ ان تمام علوم میں پیش رفت کر رہی ہے جو مدرسہ بہائیہ کی صورت میں قائم تھے۔ اکنامکس، شعبہ بزنس، ایڈمنسٹریشن، شعبہ میٹریل سائنس، شعبہ بلاغیات، فارمیسی، انجینئرنگ، زراعت، شماریات، ریاضی، ایجوکیشن، کامرس، بیالوجی، کیمسٹری، زوالوجی، سیاسیات، مطالعہ پاکستان، تاریخ جیسے شعبے قائم ہیں۔

بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان کے اساتذہ کرام جدید تعلیم یافتہ باہر کی یونیورسٹیوں سے تحصیل اور علم و ہنر میں منفرد مقام کے حامل ہیں۔ اساتذہ کی تعداد تقریباً ۲۱۰ ہے جبکہ طلباء و طالبات کی تعداد چار ہزار کے قریب ہے۔ اس سال ایم۔اے، ایم۔ایس۔سی کے داخلے نومبر میں شروع ہوں گے۔ سردست بی۔بی۔اے، فارمیسی، انجینئرنگ اور زراعت کے داخلے جاری ہیں۔ یہ داخلے میرٹ کی بنیاد پر ہوتے ہیں اس میں ملتان ڈویژن کے طلباء و طالبات کی نشستیں بھی مختص ہیں اور پورے پاکستان کی سطح پر طلباء و طالبات داخلہ حاصل کرتے ہیں۔ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی نے اپنے ۲۲ سالہ کے دوران جو نام اور مقام بنایا ہے یہ اس کا اعجاز ہے کہ ملک بھر میں یونیورسٹی کو ایک توقیر کا درجہ حاصل ہے۔ اس کے نتائج تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اس کے فارغ التحصیل طلباء و طالبات کو ملازمتوں میں ترجیحی حیثیت دی جاتی ہے۔ یہ ان کی اہلیت کا ثبوت ہے۔ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ اس نے اپنے کیمپس کو خوب سے خوب تر بنانے میں خصوصی توجہ دی ہے۔ اشجار، اثمار کی بہتات ہے۔ خوبصورت لان، سبزہ اور باغ اس کیمپس کا نکھار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یونیورسٹی کو شجر کاری کے مقابلے میں ملک بھر کی یونیورسٹیوں میں اول آنے پر ایک لاکھ روپے حکومت پاکستان کی طرف سے ملے اور اب مزید حوصلہ افزائی کے لئے حکومت نے چار لاکھ روپے کی گرانٹ دی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یونیورسٹی میں تیزی کے ساتھ شجر کاری مہم جاری ہے۔ اس سال ۱۹۹۰ء کے ہدف کے مطابق تقریباً ڈیڑھ لاکھ مختلف پودے لگائے جائیں گے جو کیمپس کی فضاؤں اور رعنائیوں میں ایک خوبصورت اضافہ کریں گے۔

بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان ترقی کی طرف گامزن ہے۔ اسے مثالی قیادت میسر ہے۔ طلباء اور عملہ میں لگن ہے کہ اسے اعلیٰ روایات اور علم اور تدریس کی رفعتوں سے آشنا کیا جائے۔ انشاءاللہ ۲۰۱۰ء میں بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان ہر اعتبار سے مکمل ہوگی۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

میاں چنوں میں محفلِ میلادؐ

خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اپنی صبح شام ذکر حبیب کی محافل سے سجاتے ہیں اور اپنے دامن میں خیر و برکت کی سعادت سمیٹتے ہیں روح کی لطافتیں اکٹھی کرتے ہیں اور کثافتوں سے بچتے ہیں۔ ایک ایسی محفل ہر سال غازی برادران میاں چنوں میں بھی سجاتے ہیں ذوق و شوق کا ایک عجیب عالم ہوتا ہے محبت اور عقیدت کے قافلے خانیوال، تلمبہ، عبدالحکیم، چیچاوطنی، ساہیوال، لاہور اور فیصل آباد سے رواں دواں میاں چنوں پہنچتے ہیں کوئی دعوت نامہ جاری نہیں ہوتا از خود قافلے آتے ہیں اور رات گئے تک سرورِ کائنات فخرِ موجودات کی مدح میں لکھی گئی نعتیں کلام اور پیغام سنتے ہیں۔ محفل دس بجے سجتی ہے اور رات کے تین بجے تک چلتی ہے کسی کو اٹھنے کا خیال نہیں آتا جو جہاں بیٹھ گیا خوش ہو گیا کہ محفل میں جگہ مل گئی ہے اور اپنی قسمت پر ناز کرنے لگا کہ اسے یہ سال بھی ذکر حبیب سننے کو نصیب ہوا ہے، مسلمان کا ایمان ہے کہ ذکر حبیب پروانہ راہداری جنت ہے، دنیاوی اور آخروی نجات کا ذریعہ ہے، اولاد آدم پر اللہ تعالیٰ کے جتنے احسانات ہیں ان میں سب سے بڑا احسان ظہور محمدیؐ ہے، جس ہستی نے اندھیروں میں روشنی پھیلائی جس نے تاریک براعظموں میں عقل، شعور، دین متین کا ایسا چراغ روشن کیا جس نے سوچ کے نئے دھارے پیدا کئے صرف ۲۳ سالوں میں بارہ لاکھ مربع میل رقبہ پر ایک عظیم الشان اسلامی سلطنت وجود میں آئی جو تین بڑے براعظموں پر مشتمل تھی ایشیاء، افریقہ، یورپ، مسلمان ایک طرف چین دوسری طرف سپانیہ، تیسری طرف فرانس تک پھیل گئے، محفل، میلاد کی تقاریر سے فکر کے نئے گوشے ابھرتے ہیں۔ میاں چنوں کی اسی محفل میں ایک مقرر نے کیا خوب کہا جب ان کا ذکر ہو دنیا سراپا گوش ہو جائے، جب ان کا نام آئے مرحبا صلی علیٰ کہئے۔

(مہر القادری)

اس محفل میں نعت رسول مقبولؐ کے لئے ملک کے کونہ کونہ سے نعت خواں تشریف لائے ہوئے تھے ملتان سے منیر حسین ہاشمی، قاری عبدالغفار نقشبندی، اور ریڈیو پاکستان ملتان کے پروڈیوسر شمشیر حیدر ہاشمی (مہر صاحب) نظامت کے فرائض سرانجام دے رہے تھے، ہر نعت خواں سوزدل محبت کی اتھاہ گہرائیوں سے اپنا تازہ جذبہ اور سچے لفظوں سے مدح

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

رسول کر رہا تھا قاری لیاقت نیازی کی قرأت بے مثل اور لحن داؤدی کی عمدہ مثال تھی اس محفل کے روح رواں غازی برادران تھے جناب ارشد غازی، اختر غازی، انور غازی اور عبدالرشید جیسے بزرگ محفل میں شامل تھے صرف کمی تھی تو ہمارے دوست سرور غازی کی تھی جو گذشتہ روز لندن سے واپس آتے ہوئے خانیوال میں انتقال کر گئے۔ وہ اپنی ذات میں عشق رسول کی لذت لئے ہوئے تھے مرحوم جس جذبہ و لگن سے یہ محفل ہر سال سجاتے تھے دیکھنے والے حیران ہوتے کہ ایسا جنون، ایسا جذبہ اور ایسا عشق رسول اس نوجوان میں ہے کہ لندن کی فضاؤں میں رہنے والا لیکن دل اس کا دیار حجازی کی ہواؤں سے تازہ تھا۔ اسی محفل میں ایک عالم دین نے اسلام اور سرور کائنات کے حوالے سے جو اسلام کا دفاعی نظام پیش کیا ان کی گفتگو سن کر محسوس ہوا کہ اسلام کے دامن میں کتنے موتی سموئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے بتایا غزوہ احزاب میں کفار مکہ نے مدینہ کا ۲۰ دن محاصرہ کیا، حضرت سلیمان فارسیؓ کے مشورے پر ایرانی طرز کے مطابق شہر کے گرد ایک خندق کھودی گئی اس جنگ میں حضرت سلیمان فارسی کے مشورے کے مطابق دو نئے آلات حرب استعمال کئے گئے۔ منجنیق دبابے تیار کئے گئے جسے اس دور کی توپ اور ٹینک کہا جا سکتا ہے فاضل مقرر نے فرمایا اسلام جدید ترین علم سائنس اور ٹیکنالوجی کا نام ہے سرور کائنات نے مسلمانوں کو چین جانے کا مشورہ اس لئے نہیں دیا تھا کہ وہاں قرآن و حدیث یا اسلامی فقہ پڑھائی جاتی تھی مقصود جدید علوم و فنون سے آگاہی تھی یہ مسلمان کی گمشدہ میراث ہے اسی لئے حضور اکرم حضرت محمد ﷺ نے کئی صحابہ کرام کو شام میں دبابے اور منجنیق کی صنعت سیکھنے کے لئے بھیجا اس محفل میلاد میں ہمیں بھی کچھ کہنے کا موقع ملا۔ صرف اتنا عرض کیا کہ پیغمبر اعظم و آخر نے علم و آگاہی کے ایسے باب کھولے جنہوں نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی وسعتوں کو آگے بڑھایا اور جدید مغرب تہذیب کا بہترین تحفہ سائنس کا ہے محفل میلاد کے صدر نشین جناب عبدالرشید نے خطاب کرتے ہوئے کہا سورہ والنجم اس واقعہ کی نشاندہی کرتی ہے جو عرب دنیا میں [illegible] سال پہلے رونما ہوا تھا جسے ہر شخص جانتا تھا اگر یہ واقعہ درست نہ ہوتا تو لوگ انکار کر دیتے۔ واقعہ معراج مریخ اور چاند تک تسخیر کی نشانیاں واضح کرتا ہے۔ سرور کائنات کی سیرت طیبہ مسلمانوں اور عالم انسانیت کے لئے سرچشمہ ہدایت ہے۔ علامہ محمد اقبال نے اسے ان جذبوں سے سراہا ہے۔

آبروئے ما ز نام مصطفیٰ است

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

محفلِ میلاد پریشانیوں سے نجات کا نام ہے، اپنی وابستگی اور والہانہ محبتوں کے اظہار کا نام ہے Back to Muhammad Peace be upon him کا نام ہے، اکیسویں صدی اسلام کی صدی کہلانے والی ہے اس لئے ہمیں اسوۂ رسولؐ کو اپنانا چاہئے۔

اس مادیت اور اندھی دولت پرستی سے بچنے کے لئے ایسی محافل تذکیہ نفس اور تطہیر قلوب کا باعث ہیں۔

؎ ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازن تر
نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ اینجا

میاں چنوں خوش نصیب خطہ ہے جہاں ہر سال رات گئے تک ذکر جمال ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب کی باتیں ہوتی ہیں اپنے تعلق کے رشتے جڑتے ہیں اسلام کی اساس اور قومی یکجہتی کی بنیادیں مضبوط کی جاتی ہیں، ہر شہر کو میاں چنوں بننا چاہئے مگر اس کے لئے سرور غازی جیسے نوجوان چاہئیں جو سارا سال اس محفل کا انتظار کرتے ہیں اور اسی محفل کی آرزو میں اس دنیا سے رخصت ہوتے ہیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

پوری دنیا فتح کرنے کا خواب

جب ہم بچے تھے عجیب عجیب خواب دیکھتے تھے۔ جب سورج کو طلوع ہوتے دیکھتے تو خیال کرتے کہ ساتھ کے گاؤں سے سورج ابھر رہا ہے اور جب غروب ہوتے دیکھتے تو اپنے گاؤں سے دوسرے گاؤں تک بھاگتے کہ چلو سورج کو قریب سے دیکھیں۔ ایسے ہی خواہش کرتے جیسے کراچی کے رہائشی کلفٹن اور ڈیفنس کے علاقوں سے گزر کر سمندر پر جا کر مغرب کے وقت سورج کو پانی میں ڈوبتا دیکھتے ہیں اور دوستوں کو بتاتے ہیں کہ سورج سمندر میں اس لئے اترتا ہے کہ اپنی گرمی کو ٹھنڈا کر سکے۔ ہر شام کراچی کے سمندر کے ساحل پر مغرب سے کچھ دیر پہلے روزانہ سورج کو ڈوبتے دیکھنے کی آرزو کشاں کشاں لوگوں کو لے جاتی ہے۔ بچے، بوڑھے، جوان اور خواتین سب اس منظر سے محظوظ ہوتے ہیں اور مجھے بچپن کے وہ سنہرے دن یاد آتے ہیں جب کھیتوں اور کھلیانوں میں بھاگتے بھاگتے سورج اور چاند کا تعاقب کرتے اور پھر خود تھک ہار کر ان معصوم ادھوری خواہشوں کی طرح بیٹھ جاتے جنہوں نے صبح سویرے دوڑ لگائی کہ نیو کیمپس والی نہر پر چل کر دوسرے عازمین حج کی طرح مکہ شریف کا سفر کریں اور دوسروں کی طرح حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کریں جب کیمپس سے آگے شادی وال تک پہنچے سانس پھول گیا۔ ایک بھائی نے دوسرے بھائی سے بڑی معصومیت سے کہا "پانی شاید خیال کریں کہ کعبہ شریف پیچھے نہ رہ جائے تو اس سے آگے نکل جائیے"۔ معصوم خواہشوں، آرزوؤں اور امنگوں کا کوئی ساحل نہیں۔ آج سے صدیوں پہلے پوری دنیا فتح کرنے کی خواہش رکھنے والے کیا کیا لوگ نہیں تھے کبھی سائرس نے آرزو کی، کبھی سکندر اعظم نے خواہش کی اور مارے مارے، جنگل جنگل پھرتا رہا۔ ملتان تک آیا مگر ملتانیوں نے ایسا تیر مارا کہ دنیا کا فاتح گھر تک نہ پہنچ سکا۔

دنیا فتح کرنے اور اپنا سکہ جمانے کی معصوم خواہش چنگیز خان کو بھی تھی اس نے بھی بغداد اور بخارہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اس امنگ میں ہلاکو خان، نپولین بوناپارٹ اور ہٹلر بھی شامل تھے مگر کسی کے مقدر میں دنیا فتح کرنے کا سہرا سر پر نہ سجا۔ کاش وہ صحافی ہوتے ان کے قبضے میں ذرائع ابلاغ ہوتے، ان کی آرزو جلد پوری ہو جاتی۔ ذرائع ابلاغ نے آج کی دنیا میں ایسا انقلاب پیدا کیا ہے وقت اور فاصلے کی ایسی طنابیں کھینچی ہیں کہ دنیا سکڑ کر ایک گاؤں

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ایک محلّہ بن گئی ہے۔ آج بل کلنٹن وائٹ ہاؤس میں بیٹھ کر دنیا بھر کے عوام سے براہ راست مخاطب ہو سکتا ہے ایک سیکنڈ میں ایک گم نام عام سا شخص سیٹلائٹ کے رابطے سے بین الاقوامی شخصیت بن سکتا ہے۔ مسافتیں لمحوں میں بدل گئی ہیں۔ سیٹلائٹ، کمپیوٹر اور E.Mail جیسے ابلاغی رابطے پوری دنیا کو فتح کر رہے ہیں۔ کانگرس لائبریری کی کتابیں کوٹلہ توے خاں میں بیٹھ کر پڑھی جا سکتی ہیں۔ نیوز ویک اور ٹائم کے شمارے ٹبی شیر خاں سے جاری ہو سکتے ہیں مغرب کا روزانہ کوئی بھی اخبار آپ صبح سویرے اپنے گھر بیٹھ کر پڑھ سکتے ہیں۔

ذرائع ابلاغ نے انسانی فکر کو متاثر کرنے اور بدلنے کی جو بے پناہ صلاحیت حاصل کر لی ہے اب اس کے سامنے نہ کوئی دیوار برلن ہے اور نہ ہی روس کا آہنی پردہ، جس کے اندر جھانکنا منع تھا۔

ذرائع ابلاغ جسے میڈیا کہتے ہیں آج ایک طاقت ہے اور اس طاقت کا انحصار انفارمیشن ٹیکنالوجی ہے جسے کالجوں، یونیورسٹیوں میں بطور نصاب شامل کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ ماہرین غور و خوض کر رہے ہیں۔ انفارمیشن کا پھیلاؤ اس تیزی سے جاری ہے کہ کوئی رکاوٹ، رکاوٹ نہیں رہی۔ دنیا بھر کا انسان دوسرے انسان کے قریب آنا چاہتا ہے ایک دوسرے کے خیال اور نظریات سے آگاہ ہونا چاہتا ہے اپنی بات کہنا چاہتا ہے اور دوسرے کی بات سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہے۔

پرانے تصورات، وہم، خدشے ختم ہو رہے ہیں نفرتیں خلوص میں بدل رہی ہیں ایک دوسرے کی مدد کا جذبہ پروان چڑھ رہا ہے۔ یہ سب کچھ ذرائع ابلاغ کا کرشمہ ہے لیکن حیرت یہ ہے کہ دنیا بھر کا کلچر بدل رہا ہے افکار و نظریات بدل رہے ہیں لیکن ایک ہمارا ہمسایہ ملک ہے جس کے نظریات کا صدیوں کا تعصب غالب ہے۔ اس تعصب کے جالے کو صاف کرنے میں ذرائع ابلاغ جو موجودہ دور میں حکمران ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں کیوں ناکام ہے کیا جالا کا حصار مضبوط ہے جو ابلاغ کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہے۔ پوری دنیا کا پریس کشمیر کے مظلوموں کی داد فریاد کیوں نہیں سنتا، کیا ان کے ساتھ کوئی دوسرا حاکم یا حکمران ہے۔ اگر ایسا نہیں تو ابلاغ عامہ کو اپنی حکمرانی کا اعلان کرنا چاہئے اور مظلوم کشمیری کا ساتھ دینا چاہئے۔ ابلاغ تو دکھی انسانیت کا موضوع ہے مگر اس دکھی انسانیت کے محسن کے لئے کشمیر کے مظلوم انسان نظر نہیں آتے۔ ابلاغ عامہ تو سر سے پاؤں تک احتساب ہوتا ہے بے انصافی کے خلاف جہاد

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ہوتا ہے۔ ایک ہاتھ میں داد اور دوسرے ہاتھ میں تیشۂ فریاد ہوتا ہے۔ ہر سطر ضرب کلیمی اور ہر لفظ نقشِ فریادی کی شکل رکھتا ہے۔

اگر آج ذرائع ابلاغ کے ہاتھ میں حکمرانی ہے تو اسے جان لینا چاہئے۔ حکمرانی کا عنصر صدق اور صرف انصاف اور مظلوم کی فریاد رسی کرنا ہے اگر ایسا نہیں تو کئی سکندر، کئی ہلاکو اور کئی چنگیز منوں مٹی کے نیچے بے بسی کی مٹی بن گئے ہیں۔ خدا نہ کرے کہ ابلاغ عامہ کے ساتھ بھی ایسا ہو۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

نئی ایجوکیشن پالیسی کب آئے گی

پاکستان کو قائم ہوئے پچاس سال ہو گئے ہیں۔ گولڈن جوبلی تقریبات منانے کے بعد قوم ستا رہی ہے۔ گولڈن جوبلی تقریبات میں ہر ادارہ ہر فرد نے بھر پور حصہ لیا گذشتہ برسوں کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا محاسبہ بھی کیا اور آئندہ کے لئے ٹھوس لائحہ عمل اپنانے کا عزم بھی کیا۔ اگر کوئی ادارہ اس سارے عمل میں الگ تھلگ خاموش تماشائی بنا رہا ہے اور جس نے نہ گذشتہ ماہ و سال کو جائزہ لیا اور نہ آئندہ کی ٹھوس منصوبہ بندی کی وہ ہماری صوبائی اور مرکزی وزارت ہائے تعلیم ہیں جنہیں اس بات کا کبھی احساس ہی نہیں ہوا کہ پاکستان بننے کے بعد اس قوم کو سات تعلیمی پالیسیاں مل چکی ہیں آخری تعلیمی پالیسی ۲۱ دسمبر ۱۹۹۲ء کی تھی جو اس وقت کے وزیر تعلیم سید فخر امام نے متعارف کرائی اس پالیسی میں جو دعوے کئے گئے ان میں ایک دعویٰ اس صدی کے آخر تک شرح خواندگی ۷۰ فیصد ہو جانے کی نوید سنائی گئی سرکاری شعبے میں ۴ اور نجی شعبہ میں ۱۶ یونیورسٹیاں قائم ہوں گی۔ شہری اور دیہی علاقوں میں تعلیمی عدم مساوات دور کر دی جائے گی۔ غرض یہ کہ یہ پالیسی بھی سابقہ پالیسیوں کی طرح فائلوں میں دب گئی اور اس میں عمل درآمد کا وقت ہی نہ آیا کیونکہ جو پالیسی اہلِ علم اساتذہ طلبہ کے مشورہ کے بغیر بنے گی اس کا حشر یہی ہو گا۔ ہمارے ماہرین کو یہ کبھی خیال ہی نہیں آتا کہ وہ جن لوگوں کے لئے لیبر ایجوکیشن، زراعت اور دیگر پالیسیاں بناتے ہیں کم از کم ان سے مشورہ تو کر لیں اور اس بات کو بھی دیکھ لیں کہ ان کو کیا فائدہ ہوا ہے۔ اس وقت ہمارے ملک میں کئی طرح کے تعلیمی نظام رائج ہیں۔ شہروں میں انگریزی تدریس کے ادارے۔ کہیں اولیول اور کہیں اے لیول کہیں ٹاٹ والے سکول اور کہیں ٹاٹ سے محروم سکول۔ کہیں ڈیسک، کرسی والے سکول اور کہیں کمپیوٹرائزڈ ماحول کے ادارے۔ کہیں سمیسٹر سسٹم اور کہیں سالانہ امتحان۔ اور کہیں بائی پارٹس By Parts غرض یہ کہ تعلیم ایک ہے اور اس کے معیار الگ الگ ہیں اور دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ شہری اور دیہی زندگی کا فرق مٹا دیا جائے گا۔ لیکن حالت یہ ہے کہ ہم اپنی تعلیم کو ایک معیار پر لا ہی نہیں سکتے۔ اور کہتے ہیں کہ قومی یکجہتی پیدا نہیں ہو رہی۔ تعلیم کی بے بصری اور بے حسی کا یہ عالم ہے کہ میٹرک سے لے کر ایم۔اے اور ایم۔اے تک ہم نے مطالعہ پاکستان اور اسلامیات کو لازمی قرار دیا ہے تاکہ

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

اسلامی اقدار کو فروغ ملے اور مطالعہ پاکستان سے پاکستانیت اور قومی یکجہتی کا ادراک بڑھے لیکن کبھی ہم نے یہ سوچا ہی نہیں کہ ان اقدامات سے کیا نتائج نکلے ہیں۔ کیا اسلامی اقدار معاشرہ میں پھیل گئی ہیں۔ کیا ہمارا نوجوان اس لازمی مضمون سے اپنی شخصیت میں نکھار پیدا کر سکا ہے اور کیا صوبوں کے درمیان بہتر افہام ہوا ہے۔ حالت یہ ہے کہ ایک مردم شماری تک ہم ایک دوسرے کو قائل نہیں کر سکے۔ کالا باغ ڈیم پر ہمارے درمیان اختلافات ہیں۔ بھارتی کلچر ہمارے ذہنوں کو مفلوج کر رہا ہے۔ سیٹلائٹ ٹی وی کے پروگرام بے حیائی کو فروغ دے رہے ہیں اور ہم محض کچی پکی عمارت پر سفیدی سے اس کے داغ چھپانا چاہتے ہیں۔ اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے نامور مصنف پروفیسر خواجہ علقمہ صدر شعبہ سیاسیات نے کیا خوب کہا کہ ہمیں اسلامیات لازمی اور مطالعہ پاکستان ابتدائی کلاسوں میں یعنی پرائمری میں متعارف کرانا چاہئے تاکہ ذہنوں میں مضبوط جڑیں بنا سکے ہم یونیورسٹی کی سطح پر کوشش کرتے ہیں جہاں وہ اثرات پیدا نہیں ہوتے جو پرائمری کی تعلیم میں ہو سکتے ہیں۔ ایک بات انہوں نے بڑے پتے کی کی کہ ہمیں مغربی اور بھارتی کلچر کا مقابلہ کرنے کے لئے Media Studies کو پرائمری کے نصاب میں شامل کرنا چاہئے ابلاغیات کا علم ایم۔اے کی سطح کی بجائے پرائمری سے اس کا آغاز ہو میں نے خواجہ صاحب کو بتایا کہ ابلاغیات کو بی۔اے کی سطح پر بھی نہیں پڑھایا جاتا اور آپ پرائمری کی بات کر رہے ہیں تو انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ ہمیں اب ایک نئی پالیسی کی ضرورت ہے۔ پرائمری تعلیمی پالیسیاں زائد المیعاد ہو گئی ہیں۔ ہماری وزارت ہائے تعلیم کو مت میں انقلابی اصلاحات کے لئے اور ملک کو ایشین ٹائیگر بنانے کے لئے نئی تعلیمی پالیسی کی شدید ضرورت ہے۔ ہم تعلیم کے بغیر ترقی کا اکا دکا قدم نہیں اٹھا سکتے۔

خواجہ صاحب کی باتیں اپنی جگہ حقیقت یہ ہے مرحوم محمد خان جونیجو نے تعلیم کے لئے [illegible] فیصد شرح خواندگی کا ہدف بنایا لیکن ہدف یہ بھی ہے کہ ابھی تک ہمارے ملک میں [illegible] فیصد ناخواندہ لوگ ہیں۔ تعلیم ہماری ترجیحات کا آخری نکارنتہ یا ہدف ہے۔ یہی وجہ ہے ہمارے روز بروز گرتے ہوئے معیار تعلیم، تعلیمی اداروں کی مدر فضا، داخلوں میں مشکلات، تعلیم یافتہ نوجوان محرومی، مایوسی اور پسماندگی کی دلدل میں پھنس گیا ہے نہ تعلیم بامقصد ہے اور نہ ہی ادارے حالات کو بہتر بنانے کے لئے کوشاں ہیں۔ ہر طرف سے ادارے قلی بوچوں میں پھنس گئے ہیں ان کی تدریس اور تعلیم نوجوان بچوں کو مزید جاہل بنانے ، طلبہ کا مقام

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

دال نے اور مزید مایوسی کی فضاؤں میں کھو دینے کا اہتمام کرتے ہیں۔ بھاری بھر کم فیسیں اور ٹرین سے اترنے والے بھاری بھر کم سامان کی طرح معصوم بچوں کے کندھوں پر بستے جنہوں نے معصوم بچوں کی کمریں ٹیڑھی کر دی ہیں۔ تعلیم روز بروز اتنی مہنگی ہو گئی ہے کہ چائلڈ لیبر کا نعرہ لگانے والوں کے لئے آسانی ہو گئی ہے کہ پرائمری سکولوں سے Drop Out کی شرح بڑھ گئی ہے۔ اس طرح بے شمار بچے اپنی صلاحیتوں سے اور قوم ان کے جوہر سے محروم ہو جاتی ہے۔ نئی روشنی سکولز پر جیکٹ ان بچوں کو علم کی روشنی فراہم نہیں کر سکے پہلے تعلیم اور پھر محنت بیت المال کے پروجیکٹ بھی اچھے نتائج نہیں دکھا سکے۔

قوم ایک نئی موثر، بامقصد تعلیمی پالیسی کی آرزو مند ہے یہ قوم دے گا؟ اس کے بارے میں کون سوچے گا؟ اس کا جواب جناب رانا محمد اقبال یا جناب غوث علی شاہ یا دونوں؟

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

بند گلی اور آخری راستہ

نیز بسوں کا مشن جذبہ اگر آپ نہیں دیکھنا ہو تو آپ نواب پور ملتان سے چونگی نمبر ۹ (ساتھ) سے آنے والی بسیں دیکھیں آپ کو خوشگوار حیرت ہوگی کہ اکثر بس میں بکریاں، بھیڑیں، مرغیاں، بچے سوار ہیں۔ ان جانوروں کے ہمراہ دیگر سواریاں مرد و زن، بچے خوش خوش سفر کر رہے ہوتے ہیں۔ اگر کہیں راستہ میں بس رک جائے تو ساری سواریاں اسے دھکا دیتی ہیں بکریاں، بھیڑیں، مرغیاں پھر بھی اپنی نشست پر براجمان رہتی ہیں۔ انہیں وی آئی پی کا درجہ ملا ہوتا ہے اور یہ سواریاں دھکے کھاتی، گرتی پڑتی منزل تک پہنچتی ہیں۔ یہ بس محبتوں اور یکجہتیوں کی علامت ہیں۔ دیہاتی سادہ لوگ اسی سادہ بس میں سفر کرتے ہیں حقہ سگریٹ ساتھ رکھتے ہیں اور قہقہے بھی۔ زور شور کی داد بھی دیتے ہیں اور وفور جذبات سے گندے پر بھی ہاتھ مارتے ہیں۔ ٹیپ ریکارڈر کے گانے انہیں مست بھی کرتے ہیں۔

ہمیں بھی ایک دفعہ ان بسوں میں سفر کرنے کا تاریخی موقع ملا۔ ہمارے سامنے ایک دیہاتی شادی کا سالن دیگچی میں لئے سر پر رکھ کر بیٹھا تھا۔ ہر طرح سے احتیاط کہ کہیں کوئی بکری پیشاب نہ کر دے یا اس میں مینگنیاں نہ ڈال دے لیکن جونہی بس "شاہ دی کھوئی" کے پاس پہنچی۔ سپیڈ بریکر کی وجہ سے ایسا جھٹکا لگا کہ سالن کی دیگچی ایسی گری کہ سالن کی بوٹیاں کسی کے سر پر، شوربہ کسی کے کپڑوں پر اور دیگچی بکریوں کے ہاتھ لگی۔ پوری بس گائے کے گوشت میں پکے ہوئے سالن کی خوشبو سے مہک اٹھی۔ پوری بس میں خوشیاں ہی خوشیاں تھیں مسکراتے چہرے اور سالن والے کے چہرے پر ایسی اداسی جیسے اس کی جیب کٹ گئی ہو، جیسے اس کا ٹکٹ گر گیا ہو اور اسے دوسرا ٹکٹ خریدنا ہو۔ بیچارہ ہمدردوں کا مرکز بن گیا۔ ہم سفر کی ہمدردیاں اور اداسی کہ اب یہ گھر والوں کو کیا کھلائے گا اور اس کے بچے جو اس سالن کی آس میں ہیں ان کا کیا بنے گا۔ بس رواں دواں جاری ہے۔ کھڈے اس کی رفتار روک تو لیتے ہیں لیکن اس کی آواز کا گلہ نہیں بگاڑ سکتے۔ ہر کھڈے پر کلمہ شہادت پڑھنے کو جی چاہتا لیکن بس کے طرحدار ماحول کو دیکھ کر چپ کر کے بیٹھے رہے کہ جب سب خوش ہیں تو ہم اداس کیوں ہیں۔

بس ڈرائیور کی مہارت کو دیکھ کر اس کا انٹرویو کرنے کا سوچا۔ ان سے پوچھا کہ بس چلانے سے پہلے کیا کرتے تھے۔ ڈرائیور نے بڑے فخریہ انداز سے بتایا۔ جب کسی مزم سے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

تجربہ کا سرٹیفکیٹ پوچھا جائے تو وہ خوشی سے بتائے گا کہ میں پہلے فلاں فیکٹری کا جنرل مینیجر تھا اب آپ کے ہاں درخواست دی ہے۔ڈرائیور نے بھی اسی اعتماد سے بتایا کہ وہ پہلے بستی صاحبے کے فلاں زمیندار کے ٹریکٹر ڈرائیور تھے۔مالک کے دو کتے ٹریکٹر تلے آکر مر گئے اس لئے اس نے مجھے جواب دے دیا،اب مجھے اس بس پر نوکری مل گئی ہے اللہ کا کرم ہے کہ ایک در بند کئی در کھل گئے ہیں۔میں نے اس خوبصورت انٹرویو پر ڈرائیور کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اب اس در کو بند نہ کرنا کیونکہ اس میں اللہ کے بندے سوار ہیں۔ڈرائیور نے مسکراہٹ سے یقین دہانی کرائی اور پھر بس کو نواب پور کی تنگ سڑک پر دوڑانا شروع کر دیا اور بڑے داد طلب انداز سے میری طرف دیکھا اور بتایا سڑک تنگ سہی لیکن میری بس کو رستہ مل جاتا ہے سارے دکاندار اپنی ریڑھیاں ایک طرف کر لیتے ہیں اپنے بینچ ہٹا لیتے ہیں اگر کوئی نہ ہٹائے تو ان کے بینچ اور ان کی ریڑھیاں میری بس کے ساتھ لگ جاتی ہیں ان پر پڑی سبزیاں سڑک پر بکھر جاتی ہیں کہیں توریاں اور کہیں آلو بکھرے پڑے ہوتے ہیں۔کیوں صاحب جی!ڈرائیور ہو تو مجھ جیسا جسے راستے خوب مل جاتے ہیں۔اور میں نے کہا اور ہمیں آخری راستہ کا ادراک ہو جاتا ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

سوال کا جواب بھی سوال میں ملا مجھے

اردو کے استاد کلاس روم میں اپنے طلبہ کو برصغیر کے نامور مصنف، ادیب سجاد یلدرم کے حالات زندگی پڑھا رہے ہیں اچانک آخری بینچ سے آخری طالب علم سوال اٹھاتا ہے ''سر یلدرم کے کیا معنی ہیں؟'' اتفاق سے استاد محترم کو یلدرم کے معنی نہیں آتے وہ ادھر ادھر دیکھتے ہیں انہیں دو لڑکے ایسے نظر آتے ہیں جو آپس میں بات کر رہے ہوتے ہیں بس۔ استاد کو موضوع مل جاتا ہے ان دو لڑکوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں تمہیں شرم نہیں آتی۔ پوری کلاس میں علمی سوالات اٹھائے جا رہے ہیں علم و ادب کی ترقی کے بارے میں سوچا جا رہا ہے اور تم گپوں میں مصروف ہو۔''

بیس منٹ کی نصیحتوں اور ڈانٹ ڈپٹ کا سلسلہ جاری رہتا ہے اتنے میں پیریڈ کا وقت ختم ہو جاتا ہے اور یلدرم کے معنی وہیں رہ جاتے ہیں۔ اتفاق سے یلدرم کے معنی ہمیں بھی نہیں آتے تھے استاد اردو ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ نے بتایا کہ یہ ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی بجلی کی چمک ہے۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ کلاس روم میں بعض طالب علم اچھے سوالات اٹھاتے ہیں مگر استاد کی قہرمانی سوال کو ابھرنے سے پہلے دبا دیتی ہے۔ بعض معصوم بچے اپنے ابو سے اکثر گھر میں سوال کرتے ہیں ایسے ایسے سوالات جو بعض اوقات والدین کی سمجھ میں بھی نہیں آتے لیکن ڈانٹ ڈپٹ کی بجائے ان کا معقول جواب تلاش کر دیا جائے۔ معصوم ذہن نئی سے نئی بات جاننا چاہتے ہیں۔ زندگی کے پراسرار موضوعات، کائنات، ستارے، کہکشاں بھی ان کے لیے حیرتوں کا سامان ہیں۔ ان ذہنوں سے معصومانہ سوالات ان کے تجسس، جستجو اور تڑپ کے جذبوں کے عکاس ہوتے ہیں۔ اچھا سوال ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ علم کو بڑھاتا ہے اور فکر کو نئی شکل دیتا ہے۔

A Good Question Deserves To Live

اگر سوال کرنے پوچھنے کا عمل رک جائے تو علم کیسے بڑھے گا جب کائنات معرض وجود میں نہیں آئی تھی خالق کائنات نے فرشتوں سے پہلا مکالمہ یہ پہلا سوال یہ کیا تھا کہ تم کیا جانتے ہو اور جب انسانیت عالم ارواح میں تھی تو پہلا سوال یہ تھا ''کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں'' اور

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

جواب یہ تھا کہ بے شک آپ ہمارے رب ہیں۔

یعنی سوال زندگی ہے سوال علم کی وسعت ہے فکر کی جولانی ہے، ذہن کی گوشوں کی جلوہ فشانی ہے۔ اگر سوال جنم نہ لیں تو کائنات کی سرگرمیاں ختم ہو جائیں۔ یہ حیات و کائنات صرف اور صرف سوال پر منحصر ہے۔ اس کائنات کی ترکی انہیں سوالوں اور انہیں جوابوں سے آگے بڑھی ہے انسان کی ذہانت کا اندازہ سوال سے ہوتا ہے اگر سوال کمزور ہو تو سوال کرنے والے کے ذہن کو پڑھا جا سکتا ہے۔ معاشرے میں ان گنت سوالات موجود ہیں مگر ہم ان کا جواب دینا نہیں چاہتے۔ یا ہمیں معلوم نہیں یا ہم ان کا جواب تلاش ہی نہیں کرتے۔ اپنی محدود معلومات کے سبب دوسرے کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو سوال گندم اور جواب جو ہوتا ہے۔ Beat about the Bush اسی سے نکلتا ہے۔ اکثر اسمبلی یا پارلیمنٹ میں متعدد سوالات اٹھائے جاتے ہیں اور بعض اوقات ان کے جوابات وزیر یا پارلیمانی سیکرٹری دیتے ہیں۔ اور سوال اٹھانے والا کہتا ہے جواب درست نہیں اور سوال کا جواب دینے والا کہتا ہے کہ سوال ہی درست نہیں تھا۔ ان حالات میں سوال کی تہذیب کرنی پڑتی ہے اور جواب کی بھی Vetting کرنی پڑتی ہے۔ اس طرح سوال اور جواب نکھر جاتے ہیں شاید اس کائنات کا حسن سوال ہے اگر سوال مر جائے تو جواب کہاں سے آئے گا۔ لہذا سوال کو زندہ رہنا چاہئے اور اچھے سوالات نئی سوچ کو نئی راہیں دیتے ہیں۔ سوال در حقیقت ابلاغ کا نقطہ آغاز ہے۔ سوال آپ کے کلام کو اور آپ کے پیغام کو آگے بڑھاتا ہے بعض اوقات بڑے افسروں کی بریفنگ کے بعد پوچھا جاتا ہے Any Question اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ No Question اور سوال و جواب کا سیشن مجروح ہو جاتا ہے اور بہت سے گوشے جو علم اور تحقیق کو آگے بڑھاتے دم توڑ دیتے ہیں۔ کتنے ذہن، کتنے دماغ صرف سوال کو پذیرائی نہ ملنے سے اپنی تحقیق سے محروم ہو جاتے ہیں۔ کتنے ارسطو، بقراط، سقراط، ابن سینا، ابن غزالی، ابن خلدون ہماری کلاسوں میں موجود ہیں مگر انہیں سوال کرنے کا حوصلہ نہیں ملتا۔ جھجک، پریشانی، اعتماد سے محروم ان کی ذہانت کو ملیامیٹ کر دیتی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم ہر اچھا منصوبہ بناتے ہیں اس کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہیں اور بچوں کو بامقصد شہری بنانے سے محروم منصوبہ بندی کرتے ہیں کتنے والدین، کتنے ادارے اس بات پر سوچتے ہیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ان کی تربیت ان کے سوال اور آپ کے صحت مند جواب ہیں۔ دیکھنے میں یہ آیا ادھر بچے نے سوال کیا ادھر اس کو گالیوں سے بھرا جواب ملا۔ بے مقصد سوال کرتے ہو۔ اپنا اور میرا وقت ضائع کرتے ہو۔ اس صورت حال سے یہ تصویر سامنے آتی ہے کہ بچہ اپنے باپ سے ہم دونوں سے بیزار ہو جاتا ہے کہ مجھے اہمیت نہیں دی جاتی میرے سوالوں کا جواب نہیں ملتا۔ میں کہاں جاؤں کس سے سیکھوں؟ کلاس میں استاد کی ڈانٹ گھر میں والدین کا رویہ۔ معاشرہ ویسے ہی سوال وجواب سے محروم ہے۔ نفسا نفسی نے معاشرہ کو اصلاحات سے اور بچوں کی تربیت سے محروم کر دیا ہے تو ایسے معاشرے جو سوال سے محروم ہیں انتشار کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کسی سوال کا جواب No Comments نہیں ہونا چاہئے۔ الجھے ہوئے ذہن کو سلجھانے کے لئے اس کے جواب کو معنی دینا ضروری ہے۔ اگر سوال کا جواب نہیں ملے گا تو اخبار کیسے چھپے گا No Comments کوئی خبر نہیں۔ سوال جب بہت سے پوچھے جائیں گے تو خود بخود کھل جائیں گے اور جواب زیادہ مدلل اور بامقصد ہو جائیں گے۔ سوال تو دلوں میں چھپے ہوئے پیار کو آواز دیتا ہے۔ سوال تو زمین کی تہہ میں پوشیدہ خزانوں کا علم دیتا ہے سوال تو سمندر سے گوہر نایاب کا پتہ بتاتا ہے۔ سوال ہی علم ہے۔ سوال ہی زندگی۔ سوال ہی کائنات اور سوال ہی کائنات سے آگہی کا نام ہے۔ تمام ایجادات، تمام علوم، تمام فنون کا سرچشمہ سوال ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض اوقات سوال کا جواب بھی سوال ہی میں ملتا ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

گرد

گرد کیا ہے ؟کوئی اس کی متعین تعریف نہیں۔ کہیں اس کا نصاب میں ذکر نہیں۔ کاش طلباو طالبات کو کلاس میں پڑھایا جاتا کہ گرد کس طرح ہمارے جسم و جاں اور معاشرہ پر اثر انداز ہوتی ہے۔ آنکھ، کان میں چلی جائے تو ملٹری کے ٹیسٹ میں امیدوار کو فیل کرا دیتی ہے۔ معاشرے میں گردش کرے تو معاشرہ گرد آلود ہو جاتا ہے۔ فضا کا رخ کرے تو ہوائی کمپنیوں کو ناکام بنا دے کوئی جہاز وقت مقررہ پر منزل مقصود پر نہ پہنچ سکے۔ آشوب چشم اسی کی مہربانیوں سے جنم لیتا ہے گرد کے ذرات ۱۰ میکران (Microns) کی تعداد میں جہاں چاہیں آزادانہ گھوم پھر سکتے ہیں۔ جن دکانداروں کو اپنے سرمہ نور بصیرت پر بڑا ناز ہے کہ آنکھوں میں چمک اور چہرے کی رونق بڑھاتا ہے وہ سرمہ گرد کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ گرد آنکھوں کی بینائی اور کان کی شنوائی کو اس طرح اڑاتی ہے جیسے بندوق کی گولی درختوں پر بیٹھی چڑیوں کو اڑا دیتی ہے۔ گرد جنوبی پنجاب کا انمول تحفہ۔ تھل کبھی اس کا مرکز ہوا کرتا تھا۔ یہاں سے گرد کی آندھیاں چلتی تھیں اور ہمارا شاعر ہوا کے رستے میں چراغ جلاتے مگر یہ آندھیاں انہیں بجھا دیتیں۔

گرد کیوں جنم لیتی ہے ؟اس لئے کہ جنوبی پنجاب کا درجہ حرارت بہت زیادہ ہے۔ نمی موجود نہیں ہوتی۔ خشکی کی وجہ سے گرد کو خوش گوار فضا میسر آتی ہے۔ کچھ لوگ گرد کو ملتان تک محدود کرتے ہیں اور اسے گرد و گرما سے تر جیح دیتے ہیں۔ گرد صرف ملتان کا نہیں پورے پنجاب اور جنوبی پنجاب کا خصوصی تحفہ ہے۔ جس سے نہ کان بچتے ہیں نہ آنکھ اور کلائی کی گھڑی جس میں معمولی معمولی ذرات چلے جاتے ہیں اور اچھی خاصی گھڑی کا ستیاناس کر دیتے ہیں۔ گرد سے کیسے بچا جائے۔ گرد کا دشمن صرف سبزہ ہے۔ سبزہ کہاں سے لائیں ؟اگر اسے سڑکوں پر گائیں تو کارپوریشن اور ایم ڈی اے کے حکام اس طرح توڑ پھوڑ کرتے ہیں جیسے تاتاریوں نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ کارپوریشن کے حکام کہتے ہیں کہ ہمارا ۳۳ کروڑ کا سالانہ بجٹ ہے جبکہ ۲۱ کروڑ صرف عملہ کی تنخواہ پر خرچ ہوتا ہے اور یہ عملہ گرد کے فروغ میں موثر کردار ادا کرتا ہے۔ سڑکوں پر گرد کی ڈھیریاں گلیاں گرد سے اٹی اور راستے گرد آلود اتنے ہیں کہ کبھی عملہ اٹھانے کی کوشش نہیں کرتا۔ انہوں نے کسی پرانے بزرگ سے سن

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

یہ کہ گرد ہی گرد ہے۔ فضائی، ہوائی آلودگی میں گرد موجود ہے۔

ہمیں آئندہ اپنے ایم پی اے اور ایم این اے کو ووٹ اس بنیاد پر دینا چاہئے کہ وہ گرد کے خلاف اسمبلی میں ایکٹ منظور کرائیں تاکہ گرد کو ملک سے نکالا جا سکے۔ گرد را کے ایجنڈوں سے زیادہ خطرناک ہے اس کی وجہ سے دہشت گرد ہمیں نظر نہیں آتے۔ گرد اور دہشت گرد ایک ہی قبیلہ کا نام ہے۔ ان دونوں کے خلاف ہمیں اعلان جہاد کرنا چاہئے تاکہ اندر کے دشمن کو باہر نکالا جا سکے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ملتان کا زیرو پوائنٹ

لاہور کو تہذیبی، علمی، ادبی، ثقافتی اور سیاسی شناخت کا شہر کہتے ہیں۔ اس ساری شناخت کے پیچھے جو قوت کارفرما ہے وہ لاہور کے فوارے ہیں۔ ہر چوک، ہر موڑ کسی فوارہ سے وابستہ ہے۔ اس قابل دیکھتا، لہراتا، جھومتا پانی لاہوریوں کے دل بہلاتا ہے اور باہر سے آنے والوں کو نظارہ و شوق دیتا ہے اور احساس دلاتا ہے کہ شہروں کا حسن فواروں سے ہے۔ ٹھنڈے پانی کے چشموں سے ہے جو شہر اس سے محروم ہیں بھلا وہ بھی کیا شہر ہیں۔ ان فواروں سے لاہور کی بدرنگ، بے ذوق، بے ہنگم ٹریفک کو قرار ملتا ہے۔ سواریوں کو سکھ اور جانے والوں کو راحت ملتی ہے۔ اسے غریبیہ، خوشگوار، پُر لطف ماحول سے جب ہم اپنے پسماندہ، دور افتادہ شہروں کو لوٹتے ہیں تو جی چاہتا ہے جونہی ٹرین سے اتریں اور سٹیشن سے باہر نکلیں ہمارے سامنے فوارہ موجود ہو جو نیاگرہ فال کی طرح خوبصورتیاں بکھیر رہا ہو۔ حسن اور لطافت کی بہار پیدا کر رہا ہو۔ سفر کی ساری تھکاوٹ اتر جائے۔ پھر جب شہر میں داخل ہوں تو گھنٹہ گھر کے سامنے والی خالی جگہ جو آج کل سیاست کی ”رام گلی“ بنی ہوئی ہے اس جماعت کو جب جماعت کو جی میں آتے اپنا پرچم لہرا دیتے ہیں اور جس وقت موڈ ہو اپنا جلسہ کر ڈالتے ہیں ہماری خواہش ہے کہ اس تنگ جگہ پر اگر کوئی فوارہ نصب کر دیا جائے تو سیاسی جلسوں پر پانی پھر جائے گا اور ٹریفک کے رکنے سے جو مسائل پیدا ہوتے ہیں وہ بھی خود بخود حل ہو جائیں گے اور جب کارپوریشن کو کسی جلسہ کو خراب کرنا مقصود ہو تو فوارہ چلا دیں تو ساری سیاست پانی پانی ہو جائے گی۔ ہماری بھی کیا کیا اور عجیب عجیب خواہشیں ہیں۔ ہر خواہش پہ دم تو نہیں نکلتا البتہ خوارد کی آرزو جھلکتی ہے۔ جی میں آتا ہے کہ ملتان کو اسلام آباد کی طرح صاف ستھرا شہر بنا لیں۔ اس کی سڑکیں بلیو ایریا کی طرح کشادہ، ہری اور گھاس اور درختوں کی مثال بنیں۔ کبھی خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کاش ملتان کے قریب کوئی سمندر ہوتا۔ ہم بھی کلفٹن میں سیر کرنے جاتے۔ سمندر کے پانی میں نہاتے اور ننگے پاؤں ریت پر چلتے، جوگنگ کرتے۔ سمارٹ بنتے اور حسین نظر آتے۔ بڑھی ہوئی توند، بدلتے جسم اور تھکاوٹ کا خاتمہ ہو جاتا۔

لے جائے گا ساتھ اپنے سمندر کو اٹھا کر
یہ شخص جو ساحل پہ کھڑا سوچ رہا ہے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

مگر ایسا کب ممکن ہے۔ ملتان میں سمندر کیسے آسکتا ہے۔ ویسے بھی ہم نے ملتان سے ہر قسم کے نالے ختم کر دیئے ہیں البتہ دلوں سے ضرور اٹھتے ہیں یا ان پر قبضہ کر لیا ہے یا عین ان کے درمیان اپنے مکان بنا لئے ہیں۔ اپنا سیوریج سسٹم اتنا بہتر کر لیا ہے کہ پانی شہر سے باہر نہیں جاتا۔ ہزار جتن کر لیں پانی کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ مجھے پردیسی نہ بناؤ بلکہ آزاد بھینسوں کی طرح سڑکوں پر چلنے پھرنے دو۔ جدید وسائل اور مشینری نہ ہونے کی وجہ سے ہم بھی اس پانی سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔ جب تک جی چاہے شہر میں تعفن پھیلاؤ۔

ملتان اچھے پارکوں سے محروم ہے۔ ویسے بھی یہاں وسیع پارک بن نہیں سکتے۔ سارا علاقہ زرعی ہے اور زراعت کو وسیع رقبہ کی ضرورت ہے۔ اس لئے کارپوریشن پارک اور باغ بنانے کی بجائے شہر کو تنگ کرنے کے منصوبے بناتی ہے البتہ کارپوریشن اور ایم۔ڈی۔اے والے شہریوں پر کبھی کبھی مہربان بھی ہو جاتے ہیں۔ ان کی مہربانی کا ایک ثبوت چونگی نمبر ۹ پر ''مکی ماؤس'' والا اکلوتا فوارہ ہے۔ اسے جس جدید طرز تعمیر سے بنایا گیا ہے اس کا پانی سڑک سے گزرنے والوں کو خود بخود متوجہ کرتا ہے۔ جب ان کے اجلے کپڑوں پر زنگ آلود پانی گرتا ہے تو شہری مکی ماؤس والے فوارہ کے حسن سے محفوظ ہوتا ہے۔ اس فوارے کی اور بھی بڑی بڑی خصوصیات ہیں جن میں ایک خصوصیت بذات خود ''مکی ماؤس'' ہے اسے کس دماغ نے تراشا ہے اسے حسن کارکردگی کا اعزاز ملتان چاہئے کہ یہ مکی ماؤس شاید یونیورسٹی کے طلباء کے لئے ہے جو ابھی بچے ہیں اور شاید کے۔جی کلاس میں پڑھتے ہیں یا ان مسافروں کے لئے ہے جو لاہور سے مختلف بسوں سے آتے ہیں اور چونگی نمبر ۹ پر اترتے ہیں یا یہ مکی ماؤس کسی کیلئے بھی نہیں ہے کیونکہ کوئی بھی اس سے متاثر نہیں ہوتا۔ البتہ فوارہ اور مکی ماؤس جن بجلی کی تاروں سے آراستہ ہیں وہ تاریں کھلی ہیں۔ ان میں کرنٹ موجود ہے۔ کوئی معصوم بچہ ان تاروں سے کھیل سکتا ہے اور یہ تاریں جان لیوا بھی ہو سکتی ہے۔ ملتان آج کل بارشوں کی زد میں ہے۔ یہ کھلی تاریں مکی ماؤس کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکتیں البتہ ہمارے معصوم چہرے اور چاند جیسے مکی ماؤس متاثر کر سکتی ہے۔ چونگی نمبر ۹ کا یہ فوارہ ہماری فوری توجہ چاہتا ہے۔ احساس دلاتا ہے کہ میں یہاں کیوں ہوں اور کیسے ہوں؟ چونگی نمبر ۹ کا دوسرا نام ملتان کا زیرو پوائنٹ ہے۔ یہ زیرو پوائنٹ اسلام آباد کا ہم پلہ بننا چاہتا ہے۔ یہ مقام یہ مرتبہ اسے کون دے گا؟

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

روح کی غذا - ناکردہ گناہوں کی سزا

ایک حساس شاعر نے کتنے بلیغ انداز میں کہا تھا

سودا کی جو بالیں پہ ہوا شور قیامت
خدام ادب بولے، ابھی آنکھ لگی ہے

ہمیں جس شور قیامت کا سامنا ہے وہ ٹیپ ریکارڈر اور اس کے ساتھ لگے ہوئے بڑے بڑے ڈیک ہیں جو ہر گلی کوچے اور ہر بازار میں اس زور شور سے بجتے نظر آتے ہیں اور ان کی آواز سے ایسے کان بجتے ہیں کہ پھر کچھ سنائی نہیں دیتا۔ کہتے ہیں موسیقی روح کی غذا ہے یقینا ہوگی جب لطیف و نفیس خیالات سے مطابقت رکھتی ہو۔ یعنی سننے والا بند کمرہ میں بیٹھ کر دھیمی آواز میں کوئی غزل کوئی عارفانہ کلام خوبصورت لفظوں سے ترتیب دیا ہوا نغمہ، شعر اور خوبصورت دھنوں سے سجی کلاسیکل شاعری سنے تو یقینا روح کو تقویت اور طبیعت کو فرحت حاصل ہوتی ہے اور یہ دنیا یہ کائنات حسین دکھائی دیتی ہے۔ روح اور دماغ معطر اور شاد آباد ہو جاتا ہے دل کے تار بج اٹھتے ہیں۔ کیونکہ موسیقی انسان کی رگ رگ، نس نس میں موجود ہے۔ یہ ساز فطرت ہے۔ کوہساروں، مرغزاروں اور حسین وادیوں سے موسیقی کی لہریں اٹھتی ہیں۔ درختوں کی سرسراہٹ، بہتے آبشاروں کی گنگناہٹ، چاندنی رات، [illegible] شعر و نغمہ و ترنم [illegible] ہیں۔ یہ شعر و نغمہ و ترنم ہمیں زندگی کی بشاشت اور تازگی عطا کرتے ہیں۔ انسان کی روح صاف شفاف کپڑے کی طرح دھل جاتی ہے اور دل و دماغ کی فضا معطر ہو جاتی ہے۔

چہار چیز [illegible] چہار
شراب و سبزہ و آب رواں و روئے نگار

چار چیزیں ایسی ہیں جو دل کو سرور دیتی ہیں جن میں شراب، سبزہ، آب رواں اور روئے نگار شامل ہیں مگر ہمارے صوفی بزرگ دل کا سرور ان چار چیزوں میں تلاش کرتے ہیں۔

[illegible] چہار چیز [illegible] چہار
نماز و روزہ و تسبیح و توبہ استغفار

لیکن یہ گلیوں میں [illegible] [illegible]

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کو مصاوت کرتے ہیں۔ دل و دماغ کو ہیجان اور انتشار سے دوچار کرتے ہیں، آدمی اپنے ماحول سے بیزار ہو جاتا ہے۔ اکثر محلے، گلی میں جھگڑے، فساد، قتل کا Cause of Action یہی ڈیک ہوتا ہے۔ جس پر کنے کنے جاناں بلو دے گھر کے گانے اور اسی نوعیت کی بے تکی موسیقی فساد معاشرہ ہے۔ نوجوانوں کو اس موسیقی اور موسیقی کے دوران پڑھائی اکیسویں صدی کی دہلیز پر قدم کا نیار جحان ہے۔

اکثر نوجوان بے روزگاری، وسائل سے محرومی کا حل ان گانوں میں تلاش کرتے ہیں اکثر لوگ گھریلو جھگڑوں، خاندانی الجھنوں کا حل ان گانوں کو اونچی آواز میں سننے میں تلاش کرتے ہیں۔ ''اکیلے پن'' سے بچنے کا حل بھی ان ڈیکوں کی بے ہنگم آواز میں تلاش کیا جاتا ہے۔

لوگ اس چیخ و پکار میں اپنے دکھ چھپانا چاہتے ہیں لیکن پورے معاشرہ کو جو عذاب میں ڈال چکے ہیں ان سے نجات کون دلائے گا۔ کوئی محلّہ کی اصلاح کمیٹی ان کے ڈیک کو بند کرانے کی جرأت نہیں رکھتی۔

پولیس ان کو Radio Act کے تحت چالان نہیں کرتی۔ بے وقت کی اس راگنی کو روکنے کا حال کسی کے پاس نہیں۔ یہ ڈیک بج رہے ہیں اور پوری آواز کے ساتھ سوتوں کو جگا رہے ہیں۔ لوگوں کا جینا حرام کر رہے ہیں۔ رات گئے تک گاڑیوں میں دکانوں میں، بازاروں میں بج رہے ہیں۔ اہل محلّہ کی نیندیں اڑ گئی ہے مگر ان کے ڈیک خراب نہیں ہوئے، ریڑھی والے دیک لگائے پھرتے ہیں کھجوریں بیچنے والے، قلفیاں فروخت کرنے والے، آئس کریم کی سائیکلیں سب مل کر بچوں کو اور ان کی Study کے ماحول کو برباد کر رہے ہیں۔ کوئی ایسا مرد مجاہد نظر نہیں آتا جو انہیں احساس دلائے کہ آپ معاشرے میں شور کے بیوپاری کیوں بن گئے ہیں۔ ایک طرف ڈیک ہیں اور دوسری طرف لاؤڈ سپیکر ہیں۔ ڈیک اور لاؤڈ سپیکر کے درمیان دن بھر کا تھکا انسان جینا چاہتا ہے۔

اسے سکون، اسے اطمینان کون دلائے گا۔ ٹیپ ریکارڈر اور ڈیک کا سوئچ کون آف کرے گا۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

لیڈر اور ان کے بیانات

صحافی کو صحافت کرنی ہوتی ہے جو غیر موصول ہو اس کی نوک پلک سنوارنے اور خبر کو نکھارنے کے لئے بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں اور معیاری اخبار نکالنے کے لئے فکر و دانش کے سارے خزانے استعمال کرنے ہوتے ہیں اور بڑی امیدوں اور توقعات سے اخبار کو قارئین کرام تک پہنچانا ہوتا ہے اخبار فروش اپنی سائیکلیں اور موٹر سائیکلیں بھگا بھگا کر قارئین تک پہنچتے ہیں۔ قارئین کرام اخبار کے انتظار میں ناشتہ موخر کر دیتے ہیں۔ جب تک گھر میں اخبار نہ پہنچ جائے ایسے لگتا ہے جیسے کوئی کام ابھی ادھورا ہے۔ اخبار گھر میں روزمرہ کی اہم چیزوں کی طرح ایک حصہ ہے۔ ناشتہ کی طرح اہم ہے اگر یہ تصور کیا جائے کہ جس گھر میں اخبار ریڈیو ٹیلی ویژن موجود نہیں وہ گھر کیسا ہوگا۔ اس گھر کے افراد اس بھرپور انفارمیشن کے دور میں معلومات سے کتنے محروم ہوں گے۔ بات چیت میں۔ میل ملاقاتوں میں۔ تقریبات میں ایسے افراد اپنی گفتگو میں کیا اضافہ کرتے ہوں گے۔ جنہیں اخبار پڑھتے کئی دن گزر جائیں اور جن گھروں میں اخبار نہ آئے تو ان کی کیفیت کیا ہوگی۔ لہذا۔ اخبار۔ صحافی۔ اخبار فروش اور قارئین کرام معاشرے کا اہم حصہ ہیں جنہیں اپنے دائرے میں اور حلقہ اثر میں اخبار کو دیکھنا پڑتا ہے۔ پڑھنا پڑتا ہے لیکن قارئین کرام ان سب سے مختلف طبقہ ہے صحافی کو اپنے کام کا انعام تنخواہ میں ملتا ہے مدیر اپنی ذمہ داریوں کا معاوضہ لیتا ہے۔ اخبار فروش کو کمیشن ملتا ہے۔ اور قارئین کرام کو اپنی جیب سے ۔ روپے، ۱۰ روپے ۱۲ روپے ایک اخبار پر خرچ کرنے پڑتے ہیں اور اس خرچ کے بعد جو انہیں انعام ملتا ہے وہ لیڈروں کے بیانات ہوتے ہیں۔ ایک لیڈر بیان دیتا ہے کہ عدلیہ اور پارلیمنٹ کے معاملات میں نہ کوئی ہارا اور نہ ہی کوئی جیتا لیکن قارئین کرام پوچھتے ہیں کہ اگر کوئی نہیں ہارا اور نہ ہی کوئی جیتا ہے تو پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

ایک سے ہوئے بیانات در بیانات جو قوم کو پڑھنے پڑتے ہیں اور جس اضطراب اور کرب سے وقت گزارنا پڑا ہے اس کا مداوا کیا ہے؟ قوم کو کیا ملا ہے؟ کیا مہنگائی ختم ہو گئی ہے۔ کیا نوکریاں ملنے لگی ہیں۔ کیا امن و امان کا لا اینڈ آرڈر کا ماحول پیدا ہو گیا ہے؟۔ قارئین کرام کو روزانہ ہزاروں لاکھوں الفاظ ہضم کرنے پڑتے ہیں۔ بعض لفظ نہایت کڑوے، زہریلے اور جان لیوا ہوتے ہیں بعض تلخ ترش ہونے کے علاوہ چاشنی اور مٹھاس سے بھرپور بھی ہوتے ہیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ایک محتاط اندازے کے مطابق ایک منٹ میں ایک ارب لفظ استعمال ہوتے ہیں۔ قارئین کرام کو صدر، وزیراعظم، وزراء پارلیمانی سیکرٹریوں، مختلف محکموں کے سربراہوں چھوٹے بڑے سیاسی رہنماؤں، ورکروں، سماجی تنظیموں اور دانشوروں کے بیانات پڑھنے پڑتے ہیں ان بیانات کی وجہ سے بعض اوقات جائز خبروں کو جگہ نہیں ملتی۔ خبر کیا ہوتی ہے؟ اور کون سی خبر اہم ہے۔ قارئین کرام کے پڑھنا چاہتے ہیں اس کا سروے، اندازہ اعلیٰ سطح پر نہیں لگایا جاتا بس بیانات ہی بیانات ہماری صحافت کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ بیانات ہماری قومی صحافت کو ورثہ میں ملے ہیں شروع سے لیکر آج تک ہماری صحافت ان لیڈروں کے بیانات اور ان کے خلاف بیانات کو شائع کرتی رہی ہے ہماری صحافت کا وہ دور تحریک آزادی اور قیام پاکستان کی طرف گامزن ہونے کا تھا اس وقت ہمارے تقاضے یہی تھے کہ ایک بامقصد تحریک سے وابستگی کیلئے ذہنوں کو تیار کیا جائے روحانی اور جذباتی فضا پیدا کی جائے لیکن الحمدللہ ہم آزاد ہو چکے ہیں پاکستان بن چکا ہے۔ پچاس سال کا طویل عرصہ ہماری آزادی کی بقا کا گزر چکا ہے۔ آئندہ کی کامرانیوں کے لئے ۲۰۱۰ء جیسے پروگرام بن رہے ہیں کہ یہ ممکن نہیں کہ ہماری آئندہ ترجیحات اور مقاصد کے تعین میں یہ بھی شامل ہو کہ ہم نے لیڈروں کے بیانات کو کم شائع کرنا ہے اور خبروں کیلئے زیادہ صفحات کو مختص کرنا ہے تاکہ قارئین کرام کو باتوں کی جگالی سے بچایا جائے۔ بیانات کی چھیڑ چھاڑ سے تنقید اور تردید کے ذہنی عذاب سے دور رکھا جائے۔ بعض حضرات کا شدید خیال ہو کہ سیاست گری کیلئے لیڈروں کے بیانات جمہوری ذہن کی آبیاری کرتے ہیں۔ شعور اور بحث کو جنم دیتے ہیں۔ سیاست کے اتار چڑھاؤ سے آگاہ کرتے ہیں۔ یہی بیانات بحث و تمحیص کے ماحول کو تخلیق کرتے ہیں۔ بالکل صحیح تجزیہ ہے۔ کیا واقعی ان بیانات نے قوم کے شعور کو سمت دی ہے؟ سنجیدہ بحث و تمحیص کی روایت ڈالی ہے۔ اگر ایسا نہیں تو پھر قارئین کرام کو ہمیں فیصلہ کرنیکا حق دینا ہوگا۔

یہ قارئین کرام لیڈروں کے بیانات پڑھنا چاہتے ہیں یا نہریں، اداریہ، فیچر، کالم اور سنجیدہ مضامین اخبار میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ APNS اور انسٹیٹیوٹ آف پاکستان پریس کو اس سطح کی بحث کو رواج دینا چاہیے۔ وقتاً قارئین کرام کیا چاہتے ہیں؟ وہ بیانات جو ہاضمہ خراب کرتے ہیں یا وہ خبریں جو معلومات، تعلیم اور تفریح کے ساتھ ساتھ ایڈورٹائزنگ کی سہولت بھی فراہم کرتی ہیں۔ آیئے ہم مل کر آج دراحساس پہ دستک دیتے ہیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کیا ایسا ہو سکتا ہے

ملتان یونیورسٹی، پنجاب یونیورسٹی کی دختر نیک اختر ہے اسی طرح پنجاب یونیورسٹی کی دوسری بیٹیوں میں سے بہاولپور، بلوچستان، کراچی، اسلام آباد، فیصل آباد، کشمیر، پشاور راولپنڈی کی یونیورسٹیاں شامل ہیں۔ ان کا مقام بعد میں ہے ماں کی پیدائش ۱۴ اکتوبر ۱۸۸۲ء میں ہوئی۔ اس طرح ۱۱۵ سال یہ بزرگ خاتون اپنے علم و دانش اور تجربات کی بناء پر ایک ہی مادر علمی ہے جس کے اثرات ہر مقام، ہر جگہ اور ہر فرد اور ہر ادارہ میں موجود ہیں۔ جامعہ پنجاب نے علم و عرفان کی ایک ایک شمع روشن کی جس کی کئی قندیلیں تمام تر حوادث کے باوجود فروزاں ہیں۔ جامعہ پنجاب کے فرزندوں کی تعداد کروڑوں تک پہنچتی ہے آج بھی بی اے ایم اے کی سطح کے امیدواروں کی تعداد ۷۰۰۰۰ ہزار سے کم نہیں ہوتی ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں زیر تعلیم ہیں اور ان گنت شعبے تدریس میں مصروف ہیں۔ جامعہ اولڈ کیمپس سے نیو کیمپس میں منتقل ہو چکی ہے۔ اس کے تمام دفاتر بھی نیو کیمپس میں منتقل ہو چکے ہیں اور اورینٹل کالج اور چند دیگر تدریسی شعبوں کے علاوہ سب کچھ نیو کیمپس میں ہے۔ شعبہ امتحانات کا عملہ اور رجسٹرار کا دفتر محض قبضہ قائم رکھنے کے لئے اولڈ کیمپس میں موجود ہے۔ تاکہ نواب بہاولپور کی یہ عطیہ جو ۱۹۰۸ء سے جامعہ کی ملکیت ہے اس پر کوئی اور قبضہ نہ کرے یا مرکزی شہر کی زمین نہ بن جائے۔ جامعہ پنجاب جب قائم ہوئی تو اس کے قیام پر جشن منایا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں یہاں سے چند پروفیسر بھارت چلے گئے تو ہندو پریس نے دکھ کا اظہار کیا کہ سارے پروفیسر بھارت چلے گئے اور یونیورسٹی خالی ہو گئی۔ وہ دور جہالت گزر گیا۔ اب پاکستان بن گیا ہے ہم اپنے معمولات میں غیروں کا عمل برداشت نہیں کرتے۔ آج جامعہ پنجاب نے طلباء اور اساتذہ کے وقار سے ترقی کی طرف گامزن ہے۔ لیکن اسے اپنی شناخت کا سفر طے کرنا ہے۔ ہر دور اور ہر ادارے کے اپنے Court of Arms ہوتے ہیں اداروں کے اپنے Pattern ہوتے ہیں۔ جامعہ پنجاب کی شناخت کے کیا معیار ہیں جامعہ کا مونوگرام ہماری توجہ چاہتا ہے اصلاح چاہتا ہے اور پنجاب میں رہنے کے حوالے سے اپنی شناخت مانگتا ہے۔ جامعہ پنجاب کا پہلا مونوگرام جو عہد انگلینڈ کی برکات کو ظاہر کرتا تھا درج ذیل الفاظ پر مشتمل تھا۔ Crescat-e-Rlurils کے مولانا ظفر علی خان کے بھائی اور مولانا اختر

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

پروفیسر حمید احمد خاں عہد میں بدلا گیا اور اس کی جگہ جس طغرئ کو شامل کیا گیا۔ واللہ المشرق والمغرب مونوگرام میں سورج اور اس کے نیچے زمین دکھائی گئی ہے اس مونوگرام کو دیکھ کر ذہن میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا سورج صرف پنجاب میں ہوتا ہے اور زمین بھی موجود ہے حالانکہ دنیا میں ہر جگہ سورج بھی ہے اور زمین بھی موجود ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا نظام مشرق و مغرب کے علاوہ پوری حیات و کائنات پر محیط بلکہ بسیط ہے۔ اس لئے جامعہ پنجاب کا مونو گرام پنجاب کے علمی، ثقافتی پس منظر اور تشخص کو نہیں ابھارتا اور کہیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ یونیورسٹی پنجاب میں ہے۔ اسے پنجاب کی نمائندگی کے لئے پورے پنجاب کے علمی، تہذیبی، روحانی اور ثقافتی اثرات اور نفوذ کا اظہار کرنا چاہئے۔ اس سے تو بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان ہزار درجہ بہتر ہے کہ اس کے مونوگرام میں روحانی تشخص یعنی گنبد کا عکس موجود ہے کپاس کا پھول اور تسخیر کائنات کا نسخہ موجود ہے کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم اپنی ۱۱۵ سالہ قدیمی درس گاہ کو ماضی کی طرف جانے سے روکیں اور اسے اکیسویں صدی کی طرف لے جائیں جس کی طرف پوری دنیا کی نظریں لگی ہیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

مزار اقبال

۹ نومبر کی صبح ہر سال ننھے منے شاہینوں کے قافلے ہاتھ میں پھول لئے مزار اقبال کی طرف رواں دواں نظر آتے ہیں۔ درس گاہوں کے سربراہ اپنے اداروں کی طرف سے مزار اقبال پر پھولوں کی چادریں چڑھاتے ہیں۔ مرکزی اور صوبائی حکام، گورنر پنجاب، وزیر اعلیٰ پنجاب اور ان کے وزیر بھی صبح ساڑھے آٹھ بجے مزار اقبال پر حاضری دیتے ہیں۔ ۹ نومبر کی صبح مزار اقبال پھولوں سے اور پھول لانے والوں سے بھر جاتا ہے۔ مزار اقبال پر گارڈ کی تبدیلی اور چاق و چوبند فوجی دستے بڑے طریقے اور سلیقے سے پھولوں کی چادر بھی چڑھانے کی رسم ادا کرتے ہیں۔ ۹ نومبر کو سارے رستے مزار اقبال کی طرف جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ اپنی وابستگی اور روحانی لگاؤ کا اظہار کرتے ہیں۔ اس شخص اور اس شناخت کی بازیابی کے گوشے نظر آتے ہیں۔ جو اس مزار کے ارد گرد موجود ہے۔ ایک طرف شاہی قلعہ جو مسلمانوں کی عسکری فتوحات اور ناقابل تسخیر جذبوں کی عکاسی کرتا ہے دوسری طرف بادشاہی مسجد جو مسلمانوں کے سوز دل اور حسن و جمال کی آئینہ دار ہے ان مقامات کے سامنے مینار پاکستان کا عزم جو رفعتوں اور بلندیوں کی طرف آگے بڑھنے اور نظریہ پاکستان کی وسعتوں کا علمبردار موجود ہے۔ اس سارے ماحول میں عروس البلاد لاہور کا وہ عکس بھی دکھائی دیتا ہے جس میں دریائے راوی کی لہریں موجزن ہیں۔ نہریں ہیں جو لاہوریوں کی امنگوں کی جھلک دکھاتی ہیں۔ مزار اقبال کے ارد گرد وہ شہر وہ لوگ اور وہ کوچہ و بازار دکھائی دیتے ہیں جنہوں نے صوفیائے کرام کے روحانی قافلوں کا پڑاؤ دیکھا ہے۔ حضرت داتا گنج بخش، حضرت میاں میر، حضرت شاہ جمال، حضرت مادھو لال حسین کے ایمان افروز مقابر دکھائی دیتے ہیں۔ ان مراکز سے جو یقین آفریں پہلو ملتا ہے وہ یہ ہے۔

حاصل کسی کامل سے یہ پوشیدہ ہنر کر
کہتے ہیں کہ شیشے کو بنا سکتے ہیں خارا

ان ہستیوں کے مراکز سے محبت، خدمت، رحم، احسان، ذکر و عبادت کا سبق ملتا ہے۔ انسان سے انسان کی محبت کا فلسفہ سمجھ میں آتا ہے۔ سوز و مستی جذب و شوق کی منزلیں، طے ہوتی نظر آتی ہے۔ کائنات کے بکھیڑوں میں الجھے ہوئے لوگوں کو سکھ کا درس ملتا ہے۔ عصر

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

حاضر کی بوتلوں میں بھرے ہوئے زہر کا تریاق ملتا ہے۔ان مراکز سے یہ نقطہ بھی کھلتا ہے کہ عظمت خلق خدا کی بھلائی میں ہے۔ تکریم ذات روحانی مدارج میں آگے بڑھنے سے ہے۔

اسی کش مکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی پیچ و تاب رازی کبھی موڑ و ساز رومی

مزار اقبال صرف ایک دیدہ ور کا مرکز نہیں نہ ہی شاعر رنگین نوا کا مقبرہ ہے۔بلکہ ایسے مرد قلندر کی درس گاہ ہے جہاں سے عشق و مستی کے قافلے جنش و تحرک کا پیغام لئے نئی منزلوں کی طرف جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ کہ ابھی سفر باقی ہے۔ ابھی ان گنت مقامات ہمارے نقوش آگہی کے منتظر ہیں۔

بھٹکے ہوئے آہو کو پھر موئے حرم لے چل
اس شہر کے خوگر کو پھر وسعت صحرا دے
اس دور کی ظلمت میں ہر قلب پریشان کو
وہ داغ محبت دے جو چاند کو شرما دے
بے لوث محبت ہو بیباک صداقت ہو
سینوں میں اجالا کر دل صورت مینا دے
احساس عنایت کر آثار مصیبت کا
امروز کی شورش میں اندیشہ فردا دے

مرزا اقبال ہر سال ہمیں احساس دلاتا ہے۔ ہمیں اپنی اقدار کی پہچان کرنی چاہئے۔ اپنے بچوں کو اپنی ماضی اور اپنے ورثے سے آگاہ کرنا چاہئے۔ ہمیں اجنبی تہذیب کی جین ہنٹ، بے ہنگم موسیقی اور بے مقصد زندگی کی بجائے اپنے بچوں کو ''آداب فرزندی'' سکھانے چاہئیں۔ مغرب کے سادہ پرستانہ ہٹ تراشنے کی بجائے اپنی شناخت اور پہچان کے معیار بنانے چاہئیں۔

لاقانونیت اور تشدد کی چنگاریوں کو بڑھنے سے روکتا ہے۔ انتشار، اور تفرقہ کی سیاست کو دفن کرنا ہے۔ مرکز کو مضبوط اور فرد کی آزادی کا تحفظ کرنا ہے۔ ہمیں محبتوں کا پیغام دینا ہو گا۔ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر۔ ایک دوسرے کا سہارا بن کر متصادم اور متحرب قوتوں کا مقابلہ کرنا ہے۔

مرزا اقبال ہر سال ہمیں افکار اقبال سے آگاہ کرنا ہے۔ کچھ لوگ صرف پھول چڑھانے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

وہ اپنی فضیلت سمجھتے ہیں۔ بعض ٹیلی ویژن کے عملہ کا انتظار کرتے ہیں کیونکہ پریس فوٹوگرافر کے تاخیر سے آنے پر تشویش ہوتی ہے۔ کوئی مزار اقبال کی مناسب "کوریج" نہ ہونے سے پریشان ہوتا ہے۔ کچھ لوگ موقع پر "پولورائیڈ" تصاویر بنا کر اپنے کاروبار کو فروغ دیتے ہیں۔ غرضیکہ ۹ نومبر مزار اقبال ہر رنگ اور ہر ڈھنگ سے نظر آتا ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی اس دن دیکھے جاتے ہیں جو ایک تھیلا ہاتھ میں بغل دبائے مزار کے ایک کونے میں بیٹھے کلام اقبال پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ کیا سوچتے ہیں؟ اور اقبال سے کیا پوچھتے ہیں کاش کوئی صحافی کوئی ٹیلی ویژن کا نمائندہ ان درویشوں سے بھی انٹرویو کرے جو بتا رہے ہوتے ہیں کہ اقبال نے پاکستان کی ترقی کی تمام تر راہیں سجھائی تھیں۔ ۱۹۳۰ء کے خطبہ کے بعد صرف دس سالوں میں پاکستان بنا کر دیا۔ مرکز کو مضبوط کرنے و وحدت اسلامی پیدا کرنے کا درس دیا۔ نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر تک۔ مسلمانوں کی ایک زنجیر مربوط کرنے کی کوشش کی۔ پاکستان کو عالم اسلام کا قلعہ ثابت کرنے کے عزم کا اظہار کیا ہے۔ کیا ہم اس درس سے اس مقصد سے آگاہ ہونے کے لئے ۹ نومبر کو مزار اقبال پر حاضری دے رہے ہیں۔ اگر دے رہے ہیں تو ہماری سوچ کا محور ہماری امنگوں کا افق اور مقاصد کا تعین۔

ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

بہاولپور

بہاولپور پنجاب کا اہم ترین شہر، پاکستان کا دل، بادشاہوں کا مسکن پر سکون، امن وامان کا گھر، صاف ستھرا، مختصر آبادی، جان پہچان کی آسانی، ملنے ملانے کا وضعدار شہر ہے۔

بہاولپور کو قدرت کی طرف سے تمام روحانی اور مادری آسائشات میسر ہیں۔ جدید سہولتوں میں شاندار مواصلاتی رابطے، ریل، روڈ، جہاز کی سہولتیں، ترقی کے لئے جدید تعلیم کے مراکز موجود ہیں۔

اسلامیہ یونیورسٹی جدید قدیم علوم وفنون کا اہم مرکز ہے اولڈ کیمپس شہر کے وسط میں موجود ہے جسے خوبصورت پھولوں اور پھلوں والے درختوں سے سنوارا گیا ہے۔

آم کے قدیم پیڑ اس شہر کے خلوص مٹھاس اور مہمان نوازی کی روایت کو یاد دلاتے ہیں۔

شہر میں نفسا نفسی نظر نہیں آتی۔ سکون سے محروم زندگی کا کوئی تصور نہیں، آرام، اطمینان اور ٹھہراؤ اس شہر کا مزاج ہے۔

بہاولپور کے شہری وضعداریوں اور ڈیرہ داریوں کی روایت کو آج بھی سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ یہاں کی زبان میں بلا کی موسیقی، کشش اور مٹھاس ہے، دھیرے دھیرے باتیں کرنا، ٹھہر ٹھہر کر جملے ادا کرنا بہاولپور کی گھٹی میں پڑا ہے۔

اس کے کوچہ وبازار ابھی قدامتوں کی حفاظت کر رہے ہیں۔ فرید گیٹ آج بھی ثقافتی، تجارتی مرکز ہے یہاں نئی اشیاء سے تعارف ہی نہیں ہوتا بلکہ نئے لوگوں سے ملنے اور ان سے باتیں سننے کا موقع بھی ملتا ہے۔

بہاولپور عباسی خاندان سے محبت، عقیدت، عزت کرنے والوں کا شہر ہے۔ اس شہر میں جدید وقدیم عمارات ایک ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔

بہاولپور وکٹوریہ ہسپتال ۱۹۰۶ء کی تعمیر کو اجاگر کرتا ہے یہاں کے محل ودربار پرانی طرز تعمیر کی عکاسی کرتے ہیں۔

فرید گیٹ کے اندرونی سڑک اور شہر کے وسط میں واقع عظیم الشان مسجد نجوبہ بہاولپور ہے۔ مسجد کے در ودیوار مسلم تہذیب کی وسعتوں کو ظاہر کرتے ہیں سنگ وخشت مسلمانوں کے سوز جگر اور ذہن رسا کی دعوت دیتے ہیں۔ کشادہ صحن، وضو کی جگہیں تطہیر فکر ونظر کا

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

سامان بھی بیچتے ہیں۔

مسجد کی غیت سے نئے تعمیر یہ تین سو کے قریب دکانیں تعمیر ہیں اور دکانوں کے اوپر مسجد کی تعمیر ہے جہاں آج کل مرمت کا کام زور شور سے جاری ہے۔ تزئین و آرائش کی شدید ضرورت ہے۔ مسجد شہر کے وسط میں ہے جمعہ اور عیدین کے اجتماعات رونق پذیر ہوتے ہیں۔

مسجد کے اندرونی حصے، گنبد اور محرابیں نواب بہاولپور کے ذوق تعمیر کے حسن کو ظاہر کرتی ہیں۔ نواب بہاول خان اور صادق خان خامس کا عہد تعمیرات اور جدید عمارات کے نقش ونگار رکھتا ہے۔

قلعہ ڈیراور کی مسجد نواب بہاولپور اور اس خطے کے عوام کی سوچ کو ابھارتی ہے۔

بہاولپور ابلاغ کا بھی مرکز ہے یہاں سے کئی اخبارات، کئی مجلے اور کئی رسالے شائع ہوتے رہے ہیں۔

یہاں کا پریس کلب بڑا فعال رہا ہے اب بھی شاید ہوگا مگر اس کا اظہار کہیں نہیں ہوا اس کی وجہ قیادت کا فقدان ہے یا صحافتی برادری کی تنظیمی بحران سے دوچار ہے۔

بہرحال عوام کی خواہش ہے کہ بہاولپور پریس کلب فعال "متحرک نظر آئے تاکہ یہاں کے صحافی جو بلند مرتبہ اور مقام رکھتے ہیں وہ بھی وزیراعظم پاکستان، صدر مملکت اور دیگر پارلیمانی گروپوں کی کوریج کے لیے بیرون ملک نمائندگی کا دورہ کر سکیں اور یہ شرف انہیں ملنا چاہئے۔

بہاولپور کی سنٹرل لائبریری کا بڑا شہرہ ہے پورے ڈویژن کی بڑی لائبریری ہے اس میں کئی نادر نسخے موجود ہیں۔

کاش! جدید نسخے بھی یہاں وافر مقدار میں موجود ہونے چاہئیں۔ سنٹرل لائبریری کو ہر اعتبار سے جدید وسائل و تجاویز سے آراستہ کرنا اور قدیم اور جدید نسخوں کی فراہمی حکومت اور بہاولپور کے دانشوروں کی ذمہ داری ہے۔

کئی خانوادوں اور خاندانوں کے پاس قدیم دستاویزی نسخہ جات موجود ہیں ان علمی تبرکات اور ان گراں قدر مسودات کو لائبریری میں ان خاندانوں کے نام سے گوشے بنا کر محفوظ رکھا جا سکتا ہے یہ قومی ملکیت ہیں اور انہیں حاصل کرنے اور استفادہ کرنے کا حق قوم کے پاس ہونا چاہئے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

اہالیان بہاولپور اپنی خوبصورت تحریروں سے جس طرح علم وادب کی خدمت کر رہے ہیں اس حوالہ سے ایسی کتابیں سامنے آنی چاہئیں تاکہ اس خطہ کا ادبی شعور زیادہ مربوط طریقے سے اجاگر ہو سکے۔

چولستان کے خطے جس تیزی سے آباد ہو رہے ہیں اور وہاں آبادی کی بود وباش بڑھ رہی ہے یقیناً وطن عزیز کی قومی آمدنی میں اضافہ و وسائل میں فروانی ہو گی۔

بہاولپور تعلیمی اعتبار سے آگے بڑھ رہا ہے میڈیکل کالج ریڈیو پاکستان بہاولپور، یونیورسٹی، صادق پبلک سکول، کالج اور دیگر تعلیمی وابلاغی ادارے اس خطے کی آواز ہیں اور ترقی کا زینہ بھی ہیں۔

بہاولپور تمام ترقی کے باوجود ابھی پرانے خلوص کی زندہ تصویر بھی ہے۔ ابھی عام دیہاتی اور شہری افراد مادیت کی بڑھتی ہوئی آگ سے دور ہیں۔

بہاولپور کے لوگ مسعود شہاب کے علمی کارناموں کو فراموش نہیں کر سکتے جنہوں نے اوچ شریف اور بہاولپور پر گراں قدر تحقیقی کام کیا ہے۔

ایک نیا اضافہ مسعود احمد شاہ ڈائریکٹر جنرل چولستان اتھارٹی کا ہے جنہوں نے سیرت النبیؐ پر بے مثال کام کیا ہے۔ علمی، ادبی اور سماجی جدید بہاولپور کی تعمیر و تکمیل میں اپنا بھرپور کردار ادا کر رہی ہیں اور وہ دن دور نہیں کہ بہاولپور ہماری ترقی کا ایک سمبل ہو گا۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

علاج بالغذا

تیر بہدف، فوری اثر اور معیاری دوائی کی تلاش میں نکلنا ایسے ہے جیسے ''انسانم آرزو است'' کہنے والے روشن سویرے میں چراغ لیکر نکلتے ہیں کہ خدا کرے کوئی ''بھلا مانس'' مل جائے کوئی اچھی اقدار کا حامل انسان مل جائے۔ جیسے اچھے انسان ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ جیسے جذبوں اور خلوص میں ملاوٹ ہو رہی ہے۔ ایسے ہی رشتے کمزور پڑتے جا رہے ہیں۔ بقول صوفیائے کرام کی زبان میں جب غذا ٹھیک نہ ہو تو نگاہ کیسے ٹھیک ہو سکتی ہے۔ بالکل ایسی کیفیت دوائیوں کی ہو گئی ہے ان میں ملاوٹ اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ اصل دوائی مل جائے تو مریض کو اپنا مرض بھول جاتا ہے اور شکرانے کے نوافل ادا کرتا ہے کہ اسے اچھی اور اصل دوائی نصیب ہو گئی ہے۔ مجھے ڈرگ سٹور پر وہ نوجوان یاد آ رہا ہے جو میڈیکل سٹور کے مالک سے کہہ رہا تھا کہ جناب مہربانی فرمائیں مجھے نمبر ون نہیں نمبر ٹو دوائی چاہئے۔ دکاندار نے حیرت سے پوچھا ''کیوں'' اور اس نوجوان نے بڑی معصومیت سے کہا ''اس لئے کہ نمبر ٹو ٹھیک ہے تجربہ کی بنا پر کہہ رہا ہے'' اور نمبر ون تمہاری دوائی میں کوئی تاثیر نہیں بلکہ زندگی دو روپے کی ہے اور ہمارے پیسے سے کہ ہماری خریدنے کا نام ہے۔ ملاوٹ ہماری زندگی کا حصہ بن گئی ہے ہر شے میں کوئی چیز اٹھا کر دیکھیں آپ کو اس کی رنگت نظر آئے گی۔ قیمتیں ایک جیسی اور اشیاء میں زمین آسمان کا فرق ہے بچوں کی جگہ لیبل لگا کر مال میں نقلی چیزیں فروخت کی جاتی ہیں ہے ساتھ ہی کی تعلیم سے بدتمیزی اور کاروباری کا حتیاط نہیں کرتے آپ سے قیمت پوری وصول کی جاتی ہیں اور ایک طرف صرف شے کی صحت ایک ایسا ہوتا ہے جس کا حرف سمجھوں کے نظام معاشرے میں نہیں ہوتا بلکہ اس کا عملی نمونہ پیدل چلنے والوں پر بھی ہوتا ہے دیکھنے والے گاڑیوں کی تیز رفتاری اور پیدل والے پیپ پر چلتے ہوئے گاڑی کی تیز رفتاری سے جو منظر دیکھتے ہوں گے سارے رستے پریشان رہتے ہیں اور اس پریشانی میں ''فرینڈشپ'' وبال جان بن جاتی ہے استعمال کی عام اشیاء میں ملاوٹ حیات تک مریض کی صحت غرضیکہ ہر شے ملاوٹ کی زد میں ہے۔ انسان کس طرح زندہ ہے یہ دیکھ کر خدا کے ہاں سے برتری ''ہوائی'' یاد آ جاتی ہے جس نے ''موت کا ایک دن معین ہے'' کا یقین فرما کر انسان کو زندہ رکھا ہے ورنہ معاشرے نے انسان کو مار دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ان حالات میں

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

مجھے دنیا پور کے عظیم حکیم محمد شریف مرحوم و مغفور یاد آتے ہیں جو ہر وقت اپنی جیب میں لہسن کی ڈلیاں اور اجوائن کی پھلیاں رکھتے تھے ان کا خیال تھا لہسن دل کے عوارض کو دور کرتا ہے زندگی بڑھانے میں مدد دیتا ہے اور انسان کو تمام تر معاشی، معاشرتی جھٹکوں اور موت کی سختیوں سے بچاتا ہے اور اجوائن معدہ کی تطہیر کرتی ہے اور غذا کو خواہ جیسی بھی ہو اس کے منفی اثرات سے بچاتی ہے۔

حکیم محمد شریف جناب صابر ملتانی کے تلمذ خاص تھے اور انہی کے مشن علاج بالغذا کو آگے بڑھا رہے تھے لیکن ایک حادثے کی نذر ہو گئے۔ حکیم محمد شریف دنیا میں نہیں رہے مگر ان کا علاج بالغذا آج بھی مریضوں اور عام انسانوں کیلئے مفید نظر آتا ہے۔ جب بھوک لگے دوائی نہیں غذا کھائیں۔ رمضان المبارک کے روزے اسی بھوک کو بڑھانے اور غذا کے استعمال کو ... نے کا موثر ذریعہ ہیں۔ بھوک کے بعد غذا استعمال کرنا صحت یابی کی علامت ہے۔ غذا جتنی سادہ ہو گی صحت اتنی زیادہ مضبوط ہو گی۔ غذاؤں میں پھل، سبزیاں، دالیں جو عموماً موت سے پاک ہوتی ہیں انسان کو زندہ رکھتی ہیں۔

غذا کے استعمال میں تین باتیں حکیم صاحب زور دے کر کہا کرتے تھے زیادہ بھوک ہو تو غذا کھائیں ورنہ توند باہر نکل آئے گی۔ دوسری بات دل جس چیز کو چاہے وہ کھائیں غذا حسب ذائقہ اور کیفیت موسم کے مطابق ہو تو غذا بہتر ہے وگرنہ غذا میں معقول اور قیمتی اجزاء صحت کو بحال نہیں کر سکتے۔

تیسری بات غذا اس وقت تک کھاتے رہیں جب تک بھوک ایک حصہ باقی ہو تو غذا کو چھوڑ دیں کہیں ایسا نہ ہو کہ سارے معدے پر غذا حاوی ہو جائے اور معدہ کام کرنا چھوڑ دے ایسی صورت میں بدہضمی، ہیضہ اور اسہال اور قے کا پیدا ہو جانا قدرتی امر ہے۔

تھوڑا کھانا پیٹ بھر کے کھانا دونوں جسم و جاں کیلئے عذاب ہیں۔ اس لئے ان میں توازن پیدا کرنا ایسے ہی جیسے کسی مملکت میں توازن سے حکومت مستحکم ہوتی ہے اور اگر ریاست میں قدرتی توازن مفقود ہو جائے تو مستحکم سے مستحکم حکومت کے گرنے کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ انسان کی اپنی ذات بھی ایک ریاست کی مانند ہے جسے توازن درکار ہے۔ حکیم محمد شریف مرحوم کبھی کبھی فاقہ کو بھی بیان کرتے تھے ان کا خیال تھا فاقہ بھی صحت کیلئے ضروری ہے ہر وقت کھاتے رہنے سے معدہ تنگ آ جاتا ہے جیسے مزدور اگر آرام نہ کرے تو بیمار پڑ

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

جاتا ہے اس لئے فاقہ صحت، قوت اور جوانی کو قائم رکھتا ہے۔

"رنگ لائے گی یہ فاقہ مستی ایک دن" مرزا غالب ایسے نہیں کہا کرتے تھے ان کی فاقہ مستی غربت کی لذت سے آشنا تھی اور حکیم محمد شریف کی فاقہ مستی صحت سے عبارت ہے۔ حکیم صاحب یہ بھی کہتے تھے جو غذا ہم کھاتے ہیں وہ غذا بارہ گھنٹوں میں ہضم ہوتی ہے تین گھنٹے معدہ میں رہتی ہے۔ چار گھنٹے چھوٹی آنتوں میں اور پانچ گھنٹے بڑی آنتوں میں گزارتی ہے۔ جب تک پوری غذا ہضم نہ ہو جائے اس وقت تک اور غذا ہرگز نہیں کھانی چاہئے اگر آپ کھا لیں گے تو ثقل و تعفن، تیزابیت کا شکار ہو جائیں گے اور پھر ہاضمے والی دوائیاں، نمبر دو سے لے کر نمبر تین کے نسخے آپ کی صحت کو بحال نہیں کر سکیں گے اور پھر آپ کو میڈیکل سٹور سے اسی نوجوان کی طرح کہنا پڑے گا کہ مجھے ہاضمہ کی دوائی چاہئے۔ اور حکیم محمد شریف کا علاج بالغذا بھی مفید نہیں رہے گا کیونکہ اب اس کی مزید تشریح اور اصلاح کیلئے حکیم صاحب اس دنیا میں نہیں رہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

جُور کے تو کوہ گراں تھے ہم

آج سے چند روز پہلے نامور صحافی اے پی پی کے آفیسر جناب احمد بشیر کے انتقال کی خبر اسلام آباد سے ملی۔ پھر آج دوسری خبر اور وہ بھی اسلام آباد کے حوالہ سے ممتاز صحافی دانشور غنی اعرابی کے اس جہان فانی سے رخصت ہونے کی ملی۔ ابھی اس سانحہ سے سنبھلے نہ تھے کہ کراچی سے طنز و مزاح کے عظیم شاعر دانور فکار کے انتقال کی خبر ملی اور خبر کے ساتھ ان کے اپنی موت کی گواہی کے اشعار بھی پڑھنے کو ملے۔ مرنے والے کس قدر موت سے آشنا ہوتے ہیں۔

خبر یہ ہے کے بدایوں سے آیا ہے راوی
کہ قبر میں بصد آرام سو گیا ہوں میں
خبر نہیں کہ میری موت کب ہوئی لیکن
سنی تو میں نے بھی ہے فوت ہو گیا ہوں میں

دانور فکار برصغیر کے نامور شاعر تھے جن کے کلام اور بیاں کا چرچا مشاعروں میں بھرپور انداز سے ہوتا تھا۔ وہ بدایوں میں پیدا ہوئے تھے اور پھر قیام پاکستان کے بعد بھارت سے کراچی آگئے تھے اور پھر عمر بھر کراچی میں رہے اور شاعروں اور مداحوں کے درمیان طنز و مزاح کے پھول بکھیرتے ہوئے آج اس جہان رنگ و بو سے رخصت ہو گئے ہیں۔ یکے بعد دیگرے علم و دانش، فکر و نظر کی یہ شخصیت ہم سے جدا ہو گئیں ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا عہد اہل کمال سے جدا ہونے کا عہد ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک سخن کا آفتاب غروب ہونے کو ہے اور ہم ان ہستیوں کے ساتھ سے ہر بار دوچار ہو رہے ہیں۔ موت کا ایک دن متعین ہے۔ کسی فرد واحد کو اس سے مفر ممکن نہیں لیکن بے رحم مسیحاؤں کے ہاتھوں بے وقت مرنے کا صدمہ ہر وقت بیمار بتاتا ہے کہ نہ جانے یہ ہمارے مسیحا جو اپنی ذات کو اپنے علم اور تجربہ میں ارسطو خیال کرتے ہیں نہ جانے کب اپنی لاپروائی سے ہمیں وقت سے پہلے رخصت کر دیں اور موت کے گھاٹ اتار دیں۔ کتنے ادیب کتنے دانشوران مسیحاؤں کے ہاتھوں دم توڑ گئے ہیں۔ ان بدنصیب لمحوں میں ہمارا دوست اسد اللہ شیخ مرحوم کا بھی ذکر آتا ہے جب اسے ڈاکٹروں کی لاپروائی کا شکار ہونا پڑا وہ نوجوان جو عمر بھر خلوص کی تپتی دھوپ

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

میں چلتا رہا کبھی طالب علموں کے غم میں کبھی ملتان شہر کی تمدنی سوتوں سے فقدان میں کبھی کارپوریشن کے گرد آلود ماحول میں جہاں فائلوں کو وقت کی بے رحم قوتیں اس قدر بے دردی سے دیمک کے حوالے کرتی ہیں کہ فائلیں بھی موت کی لذت سے دوچار ہوتی ہیں۔ ان فائلوں کے اوراق نہ صرف بوسیدہ ہو جاتے ہیں بلکہ جگہ جگہ سے اس قدر خستہ ہو جاتے ہیں کہ وہ تاریخ کی ایسی تحریریں بن جاتے ہیں کہ جسے جہاں سے بھی پڑھیں حوالہ نہیں ملتا۔ منظوری کی جگہ دیمک کے نقوش ملتے ہیں اور ایک اچھا خاصا ریکارڈ ہماری لاپروائی کا منہ بولتا ثبوت بن جاتا ہے۔ مرحوم اسد اللہ شیخ جن کی برسی جمعۃ الوداع کے روح پرور موقع پر منائی جا رہی ہے اس نوجوان کی علمی، سماجی، تہذیبی خدمات پر اہل فکر روشنی ڈالیں گے اور اس کے ادھورے مشن کو آگے بڑھانے کے عزم کا اظہار کریں گے۔ وہ شخص دن بھر ان بوسیدہ خستہ فائلوں کی تلاش اور ان پر عمل درآمد کے لئے کوشاں رہا۔ اسد اللہ شیخ میرا کلاس فیلو تھا۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ بوسن روڈ کالج میں داخلہ لیا۔ طالب علموں کی خدمت کے لئے ایک انجمن بھی بنائی جو سیکنڈ ہینڈ کتابوں کو اکٹھا کرتی اور مستحق طلباء کو فراہم کرتی۔ نادار طالب علموں کے لیے وظیفہ کا خاموشی سے بندوبست کرتی اور اس طرح اسد اللہ شیخ طالب علموں کی خبروں اور خدمتوں میں مصروف رہتے۔ پھر وہ دن بھی آیا وہ ملتان کارپوریشن کا ممبر منتخب ہو گیا۔ کارپوریشن کے اجلاسوں میں اس کی آواز گونجتی مسائل پر وہ خوب بولتے۔ جب مسائل حل نہ ہوتے بیقرار ہو کر دوستوں کی محفل کا رخ کرتے۔ حال دل سناتے۔ معاشرے کی تلخیاں گنواتے۔ بیوروکریسی کے مردہ رویے کی شکایت کرتے۔ پھر ایسے گوشے ڈھونڈتے جہاں انہیں اہل علم کی ڈھارس ملتی کبھی وہ مولانا کوثر نیازی کے ڈیرے پر پہنچے۔ وہاں سے فکر کی نئی دنیا لے کر آئے۔ کبھی حضرت شورش کاشمیری مرحوم سے اپنی ارادت کو مضبوط کرتے۔ کبھی جاوید ہاشمی کو اپنی بات سناتے کبھی فخر امام کے لئے دیدہ و دل فرش راہ ہوتے۔ کبھی جبار مفتی سے صحافت اور صحافیوں کے رویوں کا ذکر کرتے کہ ہماری صحافت اداروں کی مضبوطی کے لئے مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خاں اور حضرت حمید نظامی جیسی شخصیتوں کے نقش قدم پر کیوں نہیں چلتی۔ ان کی روایت کو آگے کیوں نہیں بڑھاتی۔ کیا ہم ان کے امین اور وارث نہیں۔ ہماری مسلم صحافت اس قدر کمزور اور بے حس کیوں ہے۔ جبار مفتی ان کو کیا جواب دیتے! پھر ان کا رخ ولی محمد واجد جیسے کہنہ مشق صحافی کے در دولت پر

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ہوتا ان سے باتیں کرتے اور پھر تعلیم کی دنیا میں اپنی عافیت تلاش کرتے۔ کبھی ملتان کے سر سید ثانی چودھری عبدالرحمٰن سے ملتے۔ کبھی علامہ شبیر بخاری سے رابطہ کرتے کبھی پروفیسر ڈاکٹر محمد نذیر رومانی سے گلہ کرتے کہ وہ ملتان یونیورسٹی کو کیسے چلا رہے ہیں۔ غرضیکہ ہر محفل اور ہر نشست میں حاضری دینے کے لئے بیتاب رہتے۔

مثل خورشید سحر فکر کی تابانی میں
شمع محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق

سب کا رفیق اسد اللہ شیخ ہم سے کئی سال ہوئے جدا ہو گیا ہے ایک دن ہمیں بھی خدا کے پاس جانا ہے لیکن دکھ اس بات کا ہوتا ہے کہ ایسے اچھے لوگ ہم سے اتنی جلدی کیسے جدا ہو جاتے ہیں۔ اس سے تو بہتر ہوتا کہ ہم ان سے نہ ملے ہوتے۔ آج ان کی جدائی کا صدمہ تو نہ اٹھاتے مگر ایک ڈھارس یہ بھی ہوتی ہے کہ اگر نہ ملتے تو آج اس کسک سے کیسے فیض یاب ہوتے جو ان کی جدائی سے ملی ہے۔ یہ درس کہاں سے لیتے کہ اپنے اپنے معاشرے کی اٹھان کیلئے ہمیں ہر لمحہ سرگرم عمل رہنا ہے۔ بے بس، مجبور لوگوں کو سہارا دینا ہے۔ غریب کی آواز اور مجبور کی آنکھ بننا ہے۔ ایوانوں میں بے بس طبقے کی نمائندگی کا فرض ادا کرنا ہے اگر ایسے کاموں میں موت آبھی جائے تو بعد خوشی قبول کرنی چاہئے۔ نفس مطمئنہ کی نوید جو ہمیں قرآنی تعلیم سے ملتی ہے تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی۔ یہ وہ متاع ہے جو عمر بھر کی ریاضت سے نصیب ہوتی ہے۔ اسد اللہ شیخ خوش نصیب ہے کہ وہ اس منزل کا مستحق ٹھہرا اور یہ ایوارڈ وہ اس جہان فانی سے لے کر گیا جس ایوارڈ پر وہ اطمینان سے یہ شعر پڑھا کرتے تھے اور اکثر اپنی گفتگو تقریر میں سنایا کرتے تھے۔

جور کے تو کوہ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہ یار ہم نے قدم قدم تجھے یاد گار بنا دیا

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ملتان کے محسن

ملتان کی وہ تاریخ جو کبھی لکھی نہیں گئی ملتان کے افراد کے دلوں میں زندہ ہیں مگر تاریخ کے اوراق سے اوجھل ہیں۔ زمانے کی تیز رفتاری اور گردش لیل و نہار نے ہمارے اہل قلم کو اتنا مصروف کر دیا ہے کہ فکر و خیال سے وہ افراد نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں جن کی بنیاد پر آج کا ملتان قائم ہے۔ اس سات دریاؤں کے شہر اور سات دروازوں اور اندرون (Walled City) کی تاریخی اہمیت کے حامل خطہ کو تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ اس شہر نے ان گنت عہد دیکھے ہیں ان گنت صاحب فکر و نظر اہل سیاست اور اہل حرفہ کے وہ قبیلے دیکھے ہیں جنہوں نے اس شہر کو اپنے علم و ہنر سے صدیوں کیلئے محفوظ کر لیا۔ کبھی اس شہر سے ہیوان سانگ جیسے چینی سیاح گزرے یہ عہد تقریباً ۶۴۱ء کا تھا پھر ۸۹۲ء البلاذری کا دورہ ہوا۔ ۹۱۶ء میں ابوزاہد ہو المسعودی ۹۱۵ میں ملتان آتے ہیں۔ ۹۷۰ میں ابو ریحان البیرونی ۹۶۲ میں ابن بیکل کی آمد ہوتی ہے۔ ۱۳۳۴ میں ابن بطوطہ کا اس شہر بے مثال سے گزر ہوتا ہے۔ قزوینی ۱۳۰۵ میں آیا تو اس نے اپنی کتاب اثار البلاد اخبار العباد میں ملتان کی عظمتوں کے گیت لکھے یہاں کے مزاروں اور ان مندروں میں سونے چاندی کے بتوں کا ذکر کیا جب محمد بن قاسم نے ملتان فتح کیا تو ملتان کا الگ ڈھنگ بدل گیا یہاں اسلامی تہذیب کے نقش و نگار ابھرے اور سفید پگڑی اس خطے کی پہچان بنی۔ پھر اس شہر میں اللہ والوں کے ڈیرے لگنے شروع ہوئے شاہ گردیز سے حضرت یوسف شاہ گردیز، ایران سے حضرت شاہ شمس سبزواری، مدینہ منورہ سے حضرت غوث بہاء الدین زکریا ملتانی، حضرت شاہ رکن عالم، حضرت موسیٰ پاک شہید، حافظ محمد جمال گردیزی، قریشی، گیلانی، مشہدی، بخاری یہاں آباد ہونے لگے۔ پھر افغانستان سے افغانوں کے قبائل یہاں آباد ہوئے جو آج سدوزئی، ابدالی، خاکوانی، خاکانی، علیزئی، بادوزئی غرضیکہ ہر قبیلے کی الگ الگ پہچان ہوئی۔ قیام پاکستان کے بعد یہاں بھارت سے نقل مکانی اور ہجرت کر کے آنے والے مہاجرین بھائیوں نے اس شہر کو اپنے ہنر اور تجربے سے مالا مال کیا اس شہر کی جدید خطوط پر تعمیر اور ترتیب کا مرحلہ مکمل کیا اور آج ملتان کی پہچان ان افراد کی بھرپور دلچسپی اور محبت سے ہے۔ ملتان خوش نصیب خطہ ہے جسے ہر عہد میں محبت کرنے والے افراد ملے ہیں۔ رواداری خلوص اور پیار کے پیکر ملے ہیں۔ انہی معدودے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

چند افراد میں وہ عہد ساز لوگ بھی شامل ہیں جنہیں تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ جو جدید ملتان کے بانی ہیں۔

ان ہستیوں میں سر فہرست قبلہ مخدوم محمد سجاد حسین قریشی جنہوں نے ۱۹۲۲ سے ۱۹۹۸ء تک کے دور سے ملتان کی بھرپور خدمت کی ایک شخصیت پیر خورشید احمد قریشی کی تھی جسے لوگ بھولتے جارہے ہیں اپنے عہد کا ایک عظیم فرزند، علم و کمال کا یگانہ روزگار ایک منفرد نام کل محمد خاں ترین کا ہے جس نے ہینڈ لوم انڈسٹری کی ملتان میں بنیاد رکھی۔ ٹرانسپورٹ کی دنیا میں حاجی حمید الدین کا گوروی دیوان غلام عباس، پیر دوست علی قریشی، تعلیم کی دنیا میں چودھری عبدالرحمٰن، ہیڈ ماسٹر مسلم ہائی سکول ملتان، سید عنایت علی شاہ گردیزی پائلٹ سکول ملتان مسرت مرزا بیگ ملت ہائی سکول ملتان۔

ملتان کی روحانی تربیت میں حضرت مولانا احمد سعید کاظمی کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا ملتان کے بے تاج بادشاہ مولانا حامد علی خاںؒ کو تاریخ فراموش نہیں کر سکتی۔ حضرت چادر والی سرکار کا فیض جاری ہے حضرت شوکت حسین گیلانی کی روحانی کمالات آج بھی ملتان میں موجود ہیں۔

اس شہر کی صحافتی دنیا میں جنہوں نے عہد ساز کردار ادا کیا ان میں ریاض نور اور اشعاع اور الشمس کے جریدوں کے علاوہ افراد میں شمس ملک، خان رضوانی، حضرت نور احمد فریدی، مہر ڈاکٹر عبدالحق شامل ہیں۔

ایک علم دوست شخصیت جیسے ملتان کبھی فراموش نہیں کر سکتا وہ آغا شیر احمد خاموش کی شخصیت تھی۔ ملتان کی ادبی ثقافتی سرگرمیوں کے متحرک ان کی ذات تھی۔ منشی عبدالرحمٰن ایک دوسرا نام ہے جو زندہ رہے گا مولوی فیضان، مولوی عرفان احمد انصاری ایڈووکیٹ ملتان کی ترجمانی کا فرض ادا کرتے تھے۔ خان محمد احسن خاں ایڈووکیٹ ایک بڑا نام تھا جس نے ہمیشہ مسلم بنگال سے لے کر پاکستان کی سیاست میں کلیدی کردار ادا کیا اور سیاست دانوں کو ایک مقام پر اکٹھا کیا۔ آموں کی لڑیاں جوڑ کر ائرپورٹ پر حکام کو دکھانے اور انہیں ملتان کا تعارف کرانے میں جناب ملک فیض بخش رجوانہ کا نام بھی زندہ رہے گا اور فیض عام نرسری ان کی ذہنی کاوشوں کی علامت رہے گی۔

ملتان کا ایک نامور فرزند اور بابائے زراعت ملک خدا بخش بچہ بھی ایک عہد ساز شخصیت

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

سے مالک ہیں زندہ ہیں اور کاشتکاروں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک معتبر نام سید فخر الدین بلے کا ہے جنہوں نے ملتان کو اطلاعات معلومات اور تعلقات سے معاملوں میں باخبر رکھا ہے اور اس شہر کی آواز کو ہر آن بلند رکھا۔

ملتان ان گنت محسنوں کی سرزمین ہے یہاں ایسے دیدہ ور پیدا ہوئے جنہوں نے ملتان کو اپنے علم اور ہنر سے وہ فضیلت بخشی کہ ملتان آج انہی افراد کا زیر بار ہے۔ سیاست، زراعت، تجارت، تعلیم، صنعت و حرفت، آرٹ، اور آرٹسٹ جس کوچہ میں بھی جائیں آپ کو اونچے نام اور اونچے مقام کے نشان ملیں گے۔ ملتان کے یہ وہ چراغ ہیں جنہوں نے ہر شعبہ حیات میں ان گنت حکمت کی قندیلیں روشن کی ہیں۔ کبھی مجسم خیر کی صورت میں مولانا خیر محمد مجسم مدرسہ خیر المدارس، کبھی مدرسہ تعلیم الابرار کی صورت میں ابو الحسن قاسمی، کبھی ڈاکٹر محمد جمال بھٹہ بانی و معمار نشتر میڈیکل کالج ملتان، نادر کتب اور مخطوطات میں عبد الحلیم خاں ترین، سید حسن رضا گردیزی، عمر کمال خاں ایڈووکیٹ ملتان کی تاریخ کا علمی حوالہ ہیں تقریبات کا زندہ حوالہ ارشد حسین ارشد ہے۔ کاش زمانہ اس کی قدر کرتا اور اسے کسی منصب پر فائز کرتا۔ ملتان کے ادبی، روحانی اور علمی نکھار کا انداز یہاں کے افراد کے زبان و بیان سے نمایاں کیا جا سکتا ہے وہی مٹھاس وہی چاشنی وہی دھیما پن وہ سادگی جو یہاں کے اسلاف کا ورثہ ہے۔ آج ملتان کو انہی افراد کی ضرورت ہے جو خلوص و وفا کی انمول تصویر تھے جنہوں نے رواداری اور مٹھاس سے اس شہر کی اس کی تعمیر میں کبھی زبان، علاقہ، ذات، حائل نہیں ہوئی جو اس شہر میں آباد ہوا اسی شہر کا ہو گیا اس کی پہچان یہ شہر ہوا۔

عاصی کرنالی کو ملتان کی روحانی اقدار کا اور یہاں کے مزاج کا وہی پیار ہے جو ارشد ملتانی اور ریاض ملتانی کو ہو سکتا ہے عرش صدیقی نے بھی ملتان کو اپنی پہچان بتایا۔ ملتان نے ایسے نامور حضرات بھی دیکھے ہیں جنہوں نے روحانیت اور سیاست میں کمال پیدا کر دیا جن میں حضرت زین العابدین گیلانی اور صحافت میں قد آور شخصیت ہیں شیخ مظفر الدین جنہیں بابائے صحافت بھی کہا جاتا ہے۔ زمیندار سدھار کے مالک اور مدیر تھے اکرشش محمد اکرم خان بھی ایک حقیقی نام تھا ہفت روزہ کارزار کے ظفر مخدوم اور خواجہ عبدالکریم قاصف عاشق حسین حسنی کا ہفت روزہ روشن چراغ بال کشن تبرہ گرد گنٹھال کے مدیر تھے۔ جنہوں نے صحافت کی آبرو بڑھائی۔ علمائے کرام میں سید عطاء اللہ بخاری سے بڑھ کر کوئی خطیب کیا ہو سکتا ہے جن کی پچی اینٹوں

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کا مزار گل ٹیکس کے قبرستان محلہ قدیر آباد میں ہے۔ عہد حاضر کے صحافیوں میں جنہیں داستان صحافت امام کہنا موزوں ہو گا محترم شیخ ریاض پرویز ہیں جن کی یادیں اور اس عہد کی باتیں ایک مستند کتاب کا درجہ رکھتی ہیں۔ ملتان انہی افراد کے کارناموں سے اور انہی افراد کے لازوال کردار سے آج بھی زندہ ہے اور زندہ رہے گا لیکن دکھ اس بات کا ہے کہ ہم نے ان ہستیوں کو کیا مقام دیا ہے۔ نہ کوئی تاریخ نہ کتاب اور نہ کوئی یادگار صرف زبان اور بیان کی حد تک اور وہ بھی کبھی طاق نسیاں نہ ہو جائیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ایک کمرہ 6 آدمی

پاکستان کی ساری سیاسی جماعتیں دن رات غریب کی زندگی سنوارنے اور ان کے دکھ بانٹنے میں مصروف رہتی ہیں۔ یہی حال عوامی نمائندوں کا ہے۔ جنھوں نے غریبوں سے زخم اٹھائے کر رکھے ہیں۔ جنھیں وہ اپنے منشور میں جلی حروف سے لکھتے ہیں انتخابی جلسوں میں رقت آمیز لہجے میں بیان کرتے ہیں۔ غریب جس کو مناسب تربیت نہیں ہوئی ہوتی وہ بڑی آسانی سے ان خوش نما اور خوش نوا لفظوں کے چکر میں آجاتا ہے۔ بڑی بڑی امیدیں وابستہ کر لیتا ہے جونہی نواب صاحب الیکشن جیتیں گے ہم غریبوں کے دن پھر جائیں گے۔ گلی نالی جہاں گندا پانی متعدی بیماری کی طرح چمکتا رہتا ہے ختم ہو جائے گا۔ جس گلی میں ہر وقت نور جہاں کے مقبرے جیسی تاریکی چھائی رہتی ہے وہ بھی مرکزی بلب لگ جانے پر بقعہ نور بن جائے گی۔ جس سکول کی چھت ہر سال گرتی ہے اور بچوں کو زخمی کرتی اور بعضوں کی جان لیتی ہے وہ بھی مرمت ہو جائے گی۔ واسا کے بل اور واپڈا کا اضافی سرچارج بھی ختم ہو جائے گی۔ غریبوں کو وہی بل ہے کہ جس کی انھوں نے بجلی یا سوئی گیس جڑی ہوں گی۔ ایک ہی Good Goverance سے سنہری خواب آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں اور الیکشن تقدیر بدلنے کا نام بن جاتا ہے اور ہر امیدوار مقدر کا ستارہ اور رحمت خدا کا ظل جلیل نظر آنے لگتا ہے جونہی الیکشن کا کام تمام ہوا اراکین نے حلف اٹھایا پھر مرکزی شہروں کو وہ چلے گئے کبھی کبھار مہمانوں کی طرح بستی میں آئے تو ان کے درشن اور غیر متعدی جلسوں سے انہیں فرصت نہ ملی اور غریب بھی اپنی بستی کو اپنے محلہ کو اور وہاں سے مستقل اٹھنے والی بدبو کو دیکھتا رہتا ہے جسے کارپوریشن والے اٹھاتا اس لئے ضروری نہیں سمجھتے کہ روز روز کے کوڑا کرکٹ کو سال سال پھینکا جائے۔ بات غریبوں کی غربت کی ہو رہی تھی اور پھر بلدیاتی الیکشن پر ہیں اور ایسے ہی پیارے لوگوں نے حصہ لینا ہے اس لئے ان کے منشور بھی تیار کر رہے ہیں۔ بڑے اس انداز سے تیار کر رہے ہیں کہ دھنک رنگ پر اس طرح اثر پذیر ہوں کہ واہ واہ کے ترانے بن جائیں کے اور لوگ داد دیں کہ کس آن سے اور کس شان سے ہمارا یہ مہمان آتا ہے غریبوں کی باتیں تو ہر ایک کرتا ہے کیا کیا اندازے اور تجزیے بیان کرتا ہے۔

Word Development Indicators

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

لفظ Poverty کی تشریح اور پھر ۱۲۰ ممالک میں اس کی شرح کو کم کرنے کے دعوے بیان کئے جاتے ہیں۔ اعداد و شمار سے ثابت کیا جاتا ہے کہ پوری دنیا کی دو تہائی آبادی غربت کے چنگل میں پھنسی ہے۔ معیار زندگی کی پست ہے۔ ایسے ماحول میں بے روزگاری عام ہے۔ صاف پانی، بہتر تعلیم اور علاج معالجہ کی سہولتیں نایاب ہیں۔ جنوبی ایشیاء میں صحرائی افریقہ اس طرح پس کے رہ گئے ہیں جیسے چکی کے دو پاٹ میں آیا ہوا دانہ پس جاتا ہے۔ ورلڈ رپورٹ کے اعداد و شمار غربت کی زبوں حالی، غریب کی مجبوری اور پست معیار زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ خدا بھلا کرے ان این جی اوز کا جو فائیو سٹار ہوٹلوں میں عالی شان سیمینار کا انعقاد کرتی ہیں۔ دو تین لاکھ کے اخراجات سے احساس غربت کی بیداری پیدا کرتی ہیں۔ انگریزی میں بڑے بڑے مدیر، ماہرین، اقتصادیات اپنے گراں قدر مقالے پیش کرتے ہیں۔ اس موقع پر بروشر اور مفید لٹریچر بھی تقسیم کیا جاتا ہے جیسے کراچی میں عورت پر تشدد کی کانفرنس ۱۸، ۱۹ دسمبر کو منعقد ہوئی کہ عورتوں پر تشدد کو کیسے روکا جائے۔ فائیو سٹار ہوٹل کی رہائش شاندار یومیہ اور ایکزیکٹو کلب کے کرایہ جات سے ایسے محسوس ہوا جیسے "عورت پر تشدد" کے موضوعات ختم ہو گئے تو پھر ان ورکشاپوں اور کانفرنسوں کی ضرورت نہیں رہے گی اسی طرح غربت ایک پیارا لفظ ہے اسے بھی قائم رہنا چاہئے۔ کیونکہ غربت ورلڈ رپورٹ کا ایک مستند ایجنڈا ہے اگر غربت ختم ہو گئی تو ورلڈ رپورٹ کے ایجنڈے کا کیا بنے گا۔ اس لئے مسائل پر غور تو جاری رہے دراصل مسئلہ ختم نہ ہو۔ یہی کانفرنس ورکشاپ اور سیمینار کی خوبی ہے۔

جب ہم پڑھتے ہیں کہ ہر روز دس ہزار نئے شیر خوار پیدا ہوتے ہیں اور ایک ہزار سے زائد بچے غریبانہ ماحول کی وجہ سے مر جاتے ہیں اور جو بچ جاتے ہیں وہ ایک غریب افلاک زدہ معاشرہ میں ناقص ملاوٹ شدہ خوراک پر پلتے ہیں اور صبح سے شام تک Unproductive Services میں زندگی گزار دیتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے اپنی منصوبہ بندی پر اور دکھ ہوتا ہے ان منشوروں ان انتخابی نعروں اور پانچ سالہ ترقیاتی منصوبوں پر جن میں ہم بڑے بڑے دعوے بڑے بڑے پروگرام تشکیل کرتے ہیں سارا دن خوش رہتے ہیں کہ بس اب ہمارے دن بدل جائیں گے۔ جنوبی پنجاب سے اگر کوئی وزیر سفیر، سینیٹر الیکشن جیت جائے تو ہمیں جنوبی پنجاب کی قسمت کے بدلنے کے خواب نظر آنے لگتے ہیں۔ اور ہم بھول جاتے ہیں کہ مشتاق احمد گورمانی سے لے کر جناب فاروق احمد لغاری تک نے اس خطہ کیلئے اور اس خطہ کے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

عوام کیلئے کیا کیا منصوبے نہیں دیئے۔ کیا اس علاقے میں صنعتیں لگ گئی ہیں۔ معدنی وسائل پر جدید ریسرچ ہو رہی ہے کاٹن پر جننگ فیکٹریوں کے علاوہ صنعتیں لگ گئی ہیں جو Finished Products تیار کرتی ہیں پھر تیار کر کے مارکیٹ میں لاتی ہیں۔ ہمارے سیمینار صرف بڑے چھوٹے موضوعات پر ہوتے ہیں کہ غربت مٹاؤ غریب کو جینے کا موقع دو جبکہ وہ حالت دور کرنے کا ارادہ نہیں کرتے۔ جو غریب پاؤں سے ننگے تھکے ہوئے گندوں کی صورت میں جھونپڑیوں میں اپنی ساری زندگی گزار دیتے ہیں ہم نے آزادی سے ان پچاس سالوں میں کیا غریب کیلئے کوئی ایسی کالونی تعمیر کی ہے جہاں غریب کو سر چھپانے کو جگہ ملی ہو جو پلوں اور اوور ہیڈ برجوں کے نیچے عمر بھر زندگی گزارنے والوں کو گھر ملا ہو۔ اس لئے وہ مہنگے پلاٹ خرید کر کے قسطیں ادا نہیں کر سکتے۔ ہمارے اعداد و شمار چیخ چیخ کر بتاتے ہیں کہ جس تیزی سے ہماری آبادی بڑھ رہی ہے اس تیزی سے ہمارے مکان سے ہماری آبادی بڑھ رہی ہے اس تیزی سے ہمارے مکان تعمیر نہیں ہو رہے۔ کل مکانات کا ۵۲ فیصد صرف ایک کمرے کے مکانات پر مشتمل ہے جبکہ ہر ایسے مکان میں ۱۲ افراد فی کمرہ رہائش پذیر ہیں۔ ایسے مکانات میں تھکے ہوئے خاندان اچھے منشور کی بجائے بہتر رہائش، تعلیم، صحت، عمدہ غذا اور صاف پانی کے آرزو مند ہیں۔ انہیں روزگار چاہئے۔ بیماریوں کے خلاف تحفظ کی فراہمی کی ادویات چاہئیں دکھ اس بات کا رہتا ہے کہ کتنے اچھے لفظوں پر غربت مٹاؤ کے دعوے ہیں۔ مثلاً ایک سکیم بھی نہیں۔ پیلہ ... سکیم کا حال پوری دنیا جانتی ہے۔ دی ہوئی قسطیں ضبط ہو گئیں۔ گاڑی چھین کر نیلام ہو گئی اور غربت مٹانے کا امیدوار نوجوان ایک کمرے میں درد سے گزار رہا ہے جہاں اس جیسے پیسے پانچ جوان رہائش پذیر ہیں جو رضائی ڈھانپ کر جاپ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ رضائی اور ایک کمرے میں چھ افراد اب تک ہمارے منصوبوں کو ناکام بنائیں گے۔ یا منصوبے انہیں ناکام بنا دیں گے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

عمر پور کی محنت کش ''مہارانی''

دیہی زندگی کی بھی عجیب زندگی ہے اچھی فصلیں ہو جائیں تو شہروں کے شوروم آباد ہو جاتے ہیں کاشتکار خوشحال ہو جاتا ہے نئی ماڈل کی گاڑی خرید کرتا ہے بڑے شہروں کے دورے کرتا ہے بڑے بڑے وزیروں کی دعوتیں کرتا ہے پرانی دشمنیاں یاد کرتا ہے اور نئی دوستیاں بنتا ہے حکام سے رابطے بڑھاتا ہے تحصیل کچہری کو آباد کرتا ہے پٹواری سے لے کر تحصیلدار تک صرف زمین کا ہی نہیں بلکہ متوقع آمدنی کا بھی جائزہ لیتا ہے صرف ایک فصل کتنی زندگی بدل دیتی ہے ترجیحات کا کس طرح تعین کرتی ہے اور جن کی زمینیں دریابرد ہو جائیں ان کی دنیا جھونپڑی تک محدود ہو جاتی ہے۔ مالک سے مزارع حاکم سے محکوم امیر سے غریب اور پھر ایسا غریب کہ سارا دن مٹر چننے میں گزر جاتا ہے اور شام کو ایک بوری مٹر کا معاوضہ صرف بیس روپے ملتا ہے پچھلے دنوں عمر پور کے ایک دیہات میں جانے کا اتفاق ہوا دریائے چناب کی زرخیز مٹی کے حسن کو دیکھنے کا موقعہ ملا کس طرح دریا ہر سال کشمیر کا سونا اور پہاڑوں کے اندر چھپے ہوئے خزینے کو دیہات میں منتقل کرتا ہے جہاں جہاں سے دریا گزر جاتا ہے وہاں ایسے زمینی خزانے چھوڑ جاتا ہے کہ لہر پہر ہو جاتی ہے فصلیں سونا اگلنے لگتی ہیں گندم گنا مٹر کے صرف بیج ڈالیں کسی پانی کی کسی دیکھ بھال کی ضرورت نہیں زمین اپنے سارے خزانے منتقل کر دیتی ہے غریب کو امیر بنا دیتی ہے۔ ہمارے دورے میں ایک مصنوعی کھاد کے بڑے آفسر بھی تھے وہ حیران تھے کہ ہماری کھاد کے بغیر اتنا انقلاب کیسے آجاتا ہے اس قدر ''کش گرین'' خطے کیسے وجود میں آتے ہیں گنا کے جوس میں اس قدر مٹھاس کیوں آجاتی ہے مٹر اس قدر میٹھے اور لذیذ کیوں بن جاتے ہیں پلاؤ میں مٹر ڈالیں تو زردے کی مٹھاس مل جاتی ہے دھنیاں میں اس قدر خوشبو شامل ہو جاتی ہے کہ ہاتھوں میں مہک رچ بس جاتی ہے پانی کا ذائقہ اس قدر میٹھا ہے کہ جس قدر پانی پی لیں کوئی مصنوعی مشروب اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ تازہ پانی اور صاف ہوا چہروں پر نکھار لاتی ہے گفتگو میں وقار اور چلنے پھرنے میں ایک بہار جیسی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے جب دیہاتی مہمانوں کو دیسی گھی میں دیسی مرغی کھلاتے ہیں تو ایسے محسوس ہوتا ہے کہ طب مشرق کا کوئی ایسا صدری نسخہ استعمال کر رہے ہوں جو کبھی بڑھاپے کو قریب نہ لائے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

دیہات کی یہ وہ مشروب ہے جو جلن کا علاج اور معدہ کی تیزابیت کا مجرب نسخہ ہے مگر شہر اس نعمت سے محروم ہیں کی پیتے ہیں تو دفتر میں نیند آ جاتی ہے سارا دن چھینکیں اور طبیعت مضمحل رہتی ہے شہر والوں کے مقدر میں چینی کی چائے جو دماغ کو روشن کرتی اور معدہ کو جلا کے رکھ دیتی ہے معدہ صرف چائے پینے تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے جو کوئی ٹھوس غذا کھانے کو جی نہیں کرتا ہے مجبوری ہے احتیاج کی حد بند ہوں کہ ہمیں صرف چائے تک رکھے دو جبکہ دیہاتی کی زندگی پر ظلم ہے کہ وہ تیل والے کھانے سے پیٹ کی گرمی معمولی بھی شوق سے ہضم کر لیتا ہے رشک آتا ہے کہ کیا تندرست معدہ ان دیہاتیوں کا ہے جبکہ ہم شہر والے بڑی کے سے جو بس کا ایک گلاس پی لیں تو بڑی شدت سے احساس ہوتا ہے کہ کاش ہمارا بھی معدہ ایسا ہی ہوتا جس کا فائدہ ہم سے استعمال کرتے۔

ہم پر خوش نصیب ہیں جہاں ہمیں تر و تازہ چہرے ہشاش بشاش دیہاتی نظر آتے ہیں مرغی اور بچے کے چہرے پر سرخی اور پیاز جیسے رنگ کے بڑھتے ہیں یا تازہ لسی سے ان کے چہرے تازہ ہوں تو لگتے ہیں جیسے تازہ ہی ہیں اور انہیں بات کا ہی ضرور پابند کرنے سے آتا شہر کی نہیں دیہاتی ملتا ہے دیہاتی ملتا تو کوئی بڑی بات نہیں دیہاتی سے مراد جب جو شہر آ جاتے تو اس وقت چہرہ ذرا زیادہ ہوتا ہے اس وقت کیفیت وہی ہو جاتی ہے جس زمیندار کی زمین دریا برد ہو جائے اور وہ شخص ہے جو نیچے میں منتقل ہو جائے اس عمر میں ان بڑھاپے کی طرح موضع جات کی ملتا تھا آج بیس روپے فی بوری مزدوری پر گزارہ کرتی اور سارے دن میں صرف ایک بوری تیار ہو جائے تو وہ بڑی خوش ہوتی ہے کہ آج دیہاڑی اچھی لگ گئی ہے ورنہ ادھوری بوری پر کوئی مزدوری بھی نہیں ملتی اس کی زمین دریا برد ہو گئی ہے اور یہ لطیفہ محکمہ لاہور میں ہے جہاں کا کرایہ سو روپے سے زیادہ ہے اور مزدوری صرف بیس روپے انصاف کتنا دور ہے اور دریا برد زمین کتنی نزدیک ہے ایسے موقع پر دیہاتی یہ شعر گنگنا کر خوش ہو جاتے ہیں۔

اب وفا کی یاری ایسی نہیں رہتی شہر
دھوپ لگے تے سایہ نہیں ڈھونڈتے چل دور

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ملتان کی تہذیبی قدریں

شہنشاہ جہانگیر اور اس کی بیگم نور جہاں کو لاہور اس قدر پسند تھا کہ انہوں نے لاہور میں دفن ہونا پسند کیا بلکہ لاہور کی محبت میں اس قدر اسیر ہوئے کہ نور جہاں کی زبان شعر کی رعایت میں ڈھل گئی۔

؎ لاہور رابجان برابر خرید، ایم
جاں داود ایم و جنت دیگر خرید ، ایم

میں نے اپنی جان کو بیچ کر لاہور خرید لیا ہے اور اس طرح دوسری جنت جو لاہور ہے وہ میں نے خرید لی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ دونوں ہستیوں کے مزار لاہور ہی میں ہیں مٹی سے اس قدر محبت کا اظہار شاید کسی نے نہ کیا ہو لیکن تاریخ میں ایک ایسا شہر بھی موجود ہے جسے دنیا بھر کے دانشوروں نے جان سے کیا روح سے چاہا ہے اور وہ ملتان ہے۔ ارض ملتان کو تاریخ میں جو فضیلت حاصل ہے اس کا اظہار اس شعر سے ہوتا ہے۔

مہد آدم کہ قدرسیاں داشتند
جاگے اصل است موفقان نامند

ملتان کی مٹی خوشخطی کے لئے استعمال ہوتی ہے نقش و نگار کیلئے حسن اظہار کے لئے اور اس تخلیق آدم کے لئے استعمال ہوتی ہے جب قرنوں کی خاک اور دبی ہوئی راکھ سے انسان کا وجود حیات و کائنات کا روپ اختیار کر رہا تھا۔ ملتان بظاہر ایک ٹیلہ کے گرد آباد شہر ہے جس کے چاروں اطراف میں دریاؤں کا سنگم ہے مگر اس کی مٹی کے نیچے تہذیب کی وہ قدریں پوشیدہ ہیں جن کی اساس انسان دوستی محبت اور اخلاص ہے۔ جب اس خطہ میں اسلام کی روشنی پھیلی تو اس مٹی سے گنبد محراب مسجد کی صورت میں تہذیب کے ایسے نقش سامنے آئے کہ ملتان کی مٹی حقانیت اسلام کی قندیل بن کر چہار سو ضیاء پاش ہوئی اس مٹی سے منبر و محراب ہی نہیں تعمیر ہوئے بلکہ اس مٹی کی تاثیر سے حضرت جلال الدین سرخ بخاری اور بابا مسعود گنج شکر حضرت امیر خسرو اور حضرت خواجہ فرید کی روح پرور شاعری نے شعر و نغمہ کی صورت میں تصوف کے پھول تر و تازہ کئے۔ رشد و ہدایت کے باب روشن ہوئے اس مٹی نے علم و تدریس کی حویلیاں آباد کیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

اس مٹی نے اہل علم سے محبت اور خلق خدا کی الفت کا درس دیا۔ اس مٹی نے یہ احساس اجاگر کیا۔

اٹھ فریدا ستیا جھاڑو دے مسیت
توں ستا رب جاگدا تیری ڈاہڈے نال پریت

خدا تعالیٰ سے اپنی نسبت کو مضبوط کرنے کے لئے شب بیداری ضروری ہے جب رب کائنات جاگ رہا ہے تو اس کا بندہ سوئے کیسے سکتا ہے تو مسجد آباد کرنی چاہئے۔ آج مسجد سے بڑھ کر کس کا پیغام ہے یہ ملتانی تہذیب کا کوئی ورثہ نہیں۔ یہ شہر مان ہے اس شہر نے تو انسان دوستی اور خدا خوفی کا ایسا درس دیا ہے جس میں کمی ذات اور من پسندی کا کہیں دور تک گزر نہیں آتا حضرت بابا فرید گنج شکرؒ فرماتے ہیں۔

فریدا میں نوں مرے تک کی کرکے ست
بھر خزانے رب دے جو بھاوے سو لٹ

فرید خودی کو ایسا موت کر جیسے تم گندے کو موت کر موتی بناتے ہیں اگر ایسا کرو گے تو رب کے خزانے تمہارے لئے بے حساب ہیں جس قدر چاہو اپنے دامن کو بھر لو کم نہیں ہوں گے۔ ملتان علمی ادبی سرگرمیوں کا شہر ہے۔ ملتان ادبی اور تہذیبی تنظیموں کا کام کرتی ہے۔ ملتان کی نوجوان تنظیمیں اپنے وجود کا احساس دلاتی ہیں ہر روز ان کی تقریبات ان کی علمی اور سماجی شعور احساس دلاتا ہے کہ اس شہر میں مقامی مسائل سے لے کر قومی مسائل تک حل کرنے کے لئے فکر و تدبر موجود ہے۔ ملتان شاعروں، ادیبوں دانشوروں کا شہر ہے کسی بھی تقریب کا انعقاد کریں آپ کو نوجوانوں کی ایک وسیع جماعت اپنی فکری کاوشیں لئے نظر آئے گی بزرگوں اور استاد شعراء کی ایک بڑی تعداد دکھائی دے گی جو ملتان کی تہذیبی قدروں کا سرمایہ ہیں اسی شہر میں آپ کو ایک ایسا شاعر استاد دانشور شاعروں پر چھائے ہوئے نظر آئے گا جیسے تاریخ کے پس منظر پروفیسر فرخ درانی کے ہاں یہ ہوا ہے جس نے ربع صدی سے زائد عرصہ تک تدریس کا فریضہ سر انجام دیا ہے شعر و سخن کی جہتیں دریافت کی ہیں کی تحقیق اور فکر کے معیار بنائے ہیں سورج میانی کے تاریخ مدینۃ الاولیاء کی بوڑی بستی کے نام سے جانی جاتی ہے اس بستی پر ملتان کی وجاہتوں، چاہتوں کا ایک خوبصورت شاعر ارشد ملتانی ہے جس کے اشعار میں حکمت جس کے کردار میں ملتان کی نکہت

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

اور اٹھان میں وہی ملتانی مٹی ہے جسے بھارت والے اپنی تحریروں کو خوشخط بنانے کے لئے استعمال کرتے ہیں ملتانی مٹی تصوف کی خوشبو میں رچی بسی ہے اسے بزرگانِ دین نے اپنے کوزہ، جامِ الفت اور مہمان نوازی کے لئے چنا ہے شالیمار کی بستی کا رخ کریں تو دنیا بھر سے محبت کرنے والے انسان سے ملاقات ہوتی ہے جسے اہلِ پاکستان عاصی کرنالی کہتے ہیں۔ اسی راستے پر جناب اسلم نصاری کی اقامت گاہ ہے یہ درویشوں سے محبت کرنے اور ملتان کی عظمت کو اجاگر کرنے والا شاعر ہے۔ خواجہ فرید کا مرید اور اس کی شاعری اور تخلیقی کاوشوں کا مفسر اسلم مبتلا سرزمین جہانیاں سے اپنی فکری اساس لئے نظر آتا ہے اندرون شہر کی مجلسی زندگی پر نظر ڈالیں تو ملتان کا ایک محسن اپنی شاندار علمی محافل کی یادوں کا سرمایہ لئے رخصت ہو گیا ہے ملک اللہ بخش تعلیم اور تعلیمی اداروں کا ایک درخشندہ ستارہ تھا انہی تہذیبی قدروں کے امین پروفیسر خواجہ خورشید احمد تھے جن کا گھر لوہاری دروازہ میں مجلس احرار کے دفتر کے سامنے اور ہنوں کے چھجہ کے پہلو میں تھا اب وہاں یہ نہ مجلس احرار کا دفتر ہے اور نہ ہی پروفیسر صاحب کا گھر ہے دونوں ادارے نئی منزلوں کی طرف منتقل ہو گئے ہیں۔ ملتان نے اپنی تہذیبی قدروں کو سنبھال کر رکھا ہے انہیں دیکھنے کے لئے مشرقی پاکستان سے نورالامین تشریف لاتے تھے اور محمود علی صاحب تو اکثر یہاں حاضری دیتے رہتے ہیں اس شہر میں قدرت اللہ شہاب سے لے کر ڈاکٹر عبداللہ، جوش ملیح آبادی فتیل شفائی شورش کاشمیری ابنِ میری شمل جرمن سکالر علامہ علاؤالدین صدیقی اور حضرت قائداعظم محمد علی جناح کی قابلِ فخر بہن مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح کئی بار یہاں تشریف لائیں۔

اس سرزمین کی تہذیبی قدروں میں یہ بھی حسن و کمال رہا ہے کہ اس سرزمین نے آنے والوں کے مفید مشوروں کو ہمیشہ خندہ پیشانی سے قبول کیا ہے اور انہیں اس شہر کی اٹھان میں استعمال کیا ہے یہاں پرنس کریم آغا خاں آتے رہتے ہیں سردار عبدالقیوم سابق صدر آزاد کشمیر نے روحانی مدارج کے لئے یہاں کے کئی دورے کئے ہیں دنیائے طب کی نامور شخصیت حکیم محمد سعید نے آوازِ اخلاق کے لئے اس شہر بے مثال کو چنا ہے۔ ملتان علم و فن کا شہر ہے شعر و سخن کا شہر ہے موسیقی جسے روح کی غذا کہتے ہیں یہاں موسیقی سے عارفانہ کلام سے محبت کرنے والوں کا دور رہا ہے اس سرزمین سے کبھی خواجہ فریدؒ کبھی اقبالؒ کبھی غالب اور کبھی پنجابی اور سرائیکی کے شعراء کا کلام گایا اور سنا گیا ہے ان محفلوں کو سجانے میں ملتان کے ریڈیو

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

سٹیشن کا بھی تاریخی کردار ہے اس نے کئی موسیقاروں کو متعارف کرایا کئی نئی آوازوں کو معتبر آواز بنایا ہے اس شہر سے ثریا ملتانیکر سے لے کر اقبال بانو مینا لودھی مسرت بانو نذیر بیگم نے عارفانہ کلام سے دلوں کو مہر و محبت سے آشنا کیا اس سرزمین سے استاد کوڑے خاں استاد مشتاق خاں نے ملک بھر میں ملتان کا نام روشن کیا۔ ملتان صدیوں سے لے کر آج کے عہد تک اپنی علمی ثقافتی اور تہذیبی قدروں کا منفرد شہر رہا ہے لیکن المیہ یہ بھی ہے کہ آج مل بیٹھنے کے گوشے دستیاب نہیں۔ اس سرمائے کو محفوظ کرنے والے ادارے مفقود ہیں اور اگر یہ صورتحال جاری رہی تو ہمیں ملتان صرف مضمونوں اخباری بیانوں کی حد تک تہذیبی شہر نہ رہ جائے اور اگر کوئی پوچھے گا کہ ملتان کا تہذیبی سرمایہ ہے تو حوالہ ملے گا کہ آپ اخبار کا فلاں شمارہ کھول کر دیکھ لیں اس میں ساری تاریخ درج ہے اور بس باقی ملتان خالی رہ گیا ہے اور صرف اخباری تراشے اس کی عظمت اور قدامت کے حوالے ہیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ہمارے شہر میں ایک آدمی تھا آسماں جیسا

اہم مناسب بھی اس درویش کا کچھ نہیں بگاڑ سکے

مخدوم محمد سجاد حسین قریشی کا شمار ان منفرد اور اعلیٰ مقام شخصیات میں ہوتا ہے۔ جنہیں خدائے بزرگ وبرتر کسی مخصوص خدمت کے لئے پیدا فرماتا ہے اور پھر اس خدمت کو انجام دینے کی توفیق اور صلاحیتوں سے بھی نوازتا ہے تاریخ شاہد ہے کہ ایسی شخصیات ہر دور اور ہر زمانے میں اور کم وبیش ہر معاشرے میں پیدا ہوتی رہی ہیں اور اپنے بعد آنے والوں کو درس حیات دیتی رہی ہیں۔ جب قبلہ مخدوم سجاد حسین قریشی کی شخصیات کا جائزہ لیتے ہیں تو اللہ کے اس نیک بندے میں غیر معمولی اوصاف تھے۔ دلوں میں گھر کر جانا۔ اپنا گرویدہ بنا لینا اور ہر ایک سے اس طرح ملنا جیسے وہ اہم ترین انسان ہو ایک غریب سے غریب آدمی کو سینے سے لگانا اس کے لئے ساتھ دکھ درد بانٹنا اس کی امداد کرنا۔ اس کے دامن میں دعاؤں کے تحفے ڈال دینا اس کے حوصلے بلند کرنا۔ مشکلات میں ڈھارس دینا۔ کیا ایسی خوبیاں معمولی خوبیاں ہیں۔ کیا ان کے مرتبے کو بلند کرنے والے اوصاف نہیں آج کسی کے پاس چار پیسے آجائیں تو رعونت سے اس کی گردن کے بل ٹھیک نہیں ہوتے۔ سیدھے منہ بات کرنا اس کیلئے دشوار ہوتا ہے اپنی مسند سے اٹھ کر سلام کا جواب دینا ممکن نہیں ہوتا۔ اپنے عمر بھر کے ساتھی کو پہچاننے سے انکار کر دینا اس مادی دور کے کمالات ہیں۔ قبلہ مخدوم محمد سجاد حسین قریشی ملتان کے رئیس خاندان میں ۱۹۲۳ میں پیدا ہوئے ناز و نعم کی ساری نعمتیں ورثے میں ملیں دنیاوی منصب بھی بہت زیادہ تھے متحدہ پاکستان کی قومی اسمبلی کے رکن رہے۔ ملتان کارپوریشن کے وائس چیئرمین پھر چیئرمین۔ ملتان کی امپرومنٹ ٹرسٹ کے سیکرٹری، کئی تنظیموں کے سربراہ اور روحانی مدارج میں جنوبی ایشیاء کی عظیم روحانی سلطنت جس کی اساس حضرت بہاوالدین زکریا ملتانی نے قائم کی تھی وہ آپ کو ورثہ میں ملی۔ آپ اس درگاہ عالیہ کے سجادہ نشین مقرر ہوئے۔ حضرت شاہ رکن عالم کی درگاہ کے بھی سجادہ نشین اور حضرت بی بی پاک دامن کے بھی سجادہ نشین۔ مشائخ کرام کی تنظیموں کے بھی سرپرست اعلیٰ تھے، یہ سارے منصب یہ سارے جاہ جلال اس درویش کا کچھ نہ بگاڑ سے اس کے مزاج میں کوئی کروفر پیدا نہ کر سکے وہ سر سے لے کر پاؤں تک عجز وانکساری کا پیکر رہے۔ ہر مکتب فکر سے پیار کیا ہر

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

بازاروں میں لاؤڈ سپیکر

لاؤڈ سپیکر یا آلہ عکبر الصوف ایک ایسی ایجاد ہے جسے خلق خدا نے جی بھر کر معتوب کیا ہے اور جی بھر کر چاہا ہے۔ ماضی میں اس کے ساتھ کیا کیا سلوک نہیں ہوئے۔ اس پر کیسے کیسے بیانات شائع نہیں ہوئے اسے کسی نے شیطان کا آلہ کہا کسی نے اس کے وجود کو برائی سے تعبیر کیا پھر ایسا دور بھی آیا کہ یہ معتوب مقررین کا انتہائی محبوب بن گیا۔ کسی گلی، محلہ یا شہر کی جیسی بھی تقریب ہو اس کا اہتمام ضروری ٹھہرا۔ جب تک لاؤڈ سپیکر نہیں آئے گا تقریب شروع نہیں ہوگی۔ جونہی لاؤڈ سپیکر نصب ہوا فضا میں ہیلوون ٹوتھری کی آواز گونجی۔ ٹیسٹنگ کا اعلان ہوا اور سامعین نے محسوس کر لیا کہ تقریب کا آغاز ہوا چاہتا ہے۔ سامعین گرجتے لاؤڈ سپیکر کی طرف لپکتے ہیں۔ یہ لاؤڈ سپیکر مجمع کو یکجا کرنے اور سامعین کی آخری صف تک آواز پہنچانے کا اہتمام کرتا ہے اگر کسی تقریب کا لاؤڈ سپیکر خراب ہو تو اچھی بھلی تقریب ناکام ہو جاتی ہے حاضرین تک آواز نہیں پہنچتی وہ بے چین ہو جاتے ہیں "آواز" "آواز" کی آواز بلند کرتے ہیں۔ منتظمین کے لئے الگ پریشانی ہوتی ہے کہ وہ آواز کہاں سے لائیں جو آخری آدمی تک پہنچ سکے بہر حال لاؤڈ سپیکر محض ایک ایجاد ہی نہیں ایک مؤثر ابلاغ بھی ہے اور ذرائع ابلاغ میں اسے وہ مقام حاصل ہے جیسے ریسور میں ڈش کا ہوتا ہے۔ ریسور جتنا ٹھیک ہو ٹیلی ویژن سیٹ جتنا اچھا ہو اگر ڈش کی جالی ٹوٹی ہوئی ہو تو نشریات ناممکن ہوتی ہے۔

یہی حال لاؤڈ سپیکر کا ہے اسے ہر اعتبار سے فٹ ہونا چاہیے۔ لاؤڈ سپیکر کی مقبولیت کا اندازہ آپ اس بات سے بخوبی لگا سکتے ہیں کہ اسے ہر چوک اور ہر سڑک کے آغاز میں لگایا جا رہا ہے آپ ایک سرے سے دوسرے سرے تک سفر کرتے جائیں شہر کی ساری سڑکیں ناپ لیں آپ کو کہیں "نشریات" میں تعطل نہیں ملے گا پوری توجہ سے زحمی سے آپ سارے پروگرام سے آگاہ ہو سکتے ہیں شہر کی سڑکیں اس سہولت سے آراستہ ہیں بجلی کے کھمبوں پر قطار اندر قطار یہ لاؤڈ سپیکر نصب ہیں اللہ کے نیک بندوں نے بڑے اچھے جذبوں سے بازاروں کے ماحول کو اچھے انداز تکلمے روشناس کرانے کے لئے "آواز اخلاق" کا بیڑا اٹھایا ہے کیونکہ بازاروں میں ہونے والی گفتگو میں اکثر ایسے گرے پڑے لفظ سننے کو ملتے ہیں جن کی وجہ سے شریف لوگوں کے کان سرخ اور چہرے لال ہو جاتے ہیں اس وبا کے خاتمہ کے لئے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ابلاغ کے اس مؤثر آلہ کا استعمال عمل میں لایا گیا ہے تاکہ صبح سے شام تک بازاروں میں تلاوت قرآن مجید نعت رسول مقبول کے کیسٹ چلائے جائیں تاکہ سننے والے اپنے اندر سوز و ساز اور ذوق و مستی کی روح پرور کیفیت پیدا کر سکیں۔ جس نے بھی ایسا سوچا ہے یقیناً اس کے دل میں معاشرے کی اصلاح کا مثبت پہلو موجود ہے لیکن ضروری نہیں کہ ہر مطلوبہ نتیجہ کا حصول ہر مروجہ طریقے سے حاصل کیا جا سکے۔ لاؤڈ سپیکر ہزار اچھی سہی مگر اس پر پروگرام پیش کرنے اور دوسروں تک پہنچانے کے کچھ آداب ضروری ہیں۔ تلاوت قرآن مجید اور نعت رسول مقبول کے اوقات مقرر ہیں اس کے لئے خشوع اور خضوع کا ماحول برقرار رکھنا ضروری ہے۔

علمائے کرام اس سلسلہ میں بہتر جانتے ہیں اور تلاوت قرآن مجید اور نعت رسول کی لذتوں اور کیفیتوں کا ادراک انہیں بہتر حاصل ہے۔ اکثر بازاروں میں جب تلاوت کی کیسٹ چل رہی ہوتی ہے لوگ بازار کی گہما گہمی میں کھوئے ہوئے ہوتے ہیں زور زور سے باتیں تکرار جھگڑے اور تو تکار کا ماحول گرم ہوتا ہے اس سے تلاوت کا تقدس اور اسے غور سے سننے کا حکم مجروح ہوتا ہے۔ یہی کیفیت نعت رسول مقبول کے وقت ہوتی ہے نعت رسول مقبول مقام ادب ہے۔ نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا است کا مقام ہے۔

جب ان کا ذکر ہو دنیا سراپا گوش ہو جائے
جب ان کا نام آئے مرحبا صلِ علیٰ کہئے

ایسے پروگراموں کے لئے دن بھر کی بجائے صرف صبح کو کیسٹ چلائے جائیں تاکہ دن کا آغاز اچھے کلام سے اور عقیدت کے اظہار سے ہو بار بار اور دن میں کئی بار کیسٹ چلانے سے بازاروں میں جو بے ادبی کا ماحول نظر آتا ہے۔ وہ ان ہستیوں کی تعلیمات سے یکسر خلاف ہے۔ ادھر عارفانہ کلام، عقیدت و محبت کا پیغام عشق و مستی کا۔ عقیدے کی پختگی کا ذکر و اظہار و سرور کا عمل جاری ہوتا ہے اور ہر بازار میں عید کی خریداری اور پھر لوٹ مار، مہنگائی اور سفید پوش طبقہ کی آخری پونجی کی صفائی کا عمل جاری ہوتا ہے۔ عید کی خریداری کے لئے بازاروں میں جو ہلڑ بازی، خواتین کو تنگ کرنے، پرس چھیننے، جیب کاٹنے اور دھکے دینے کا عمل دکھائی دیتا ہے اور ادھر لاؤڈ سپیکر پر الہامی کلام کا پروگرام کس دعوت فکر کا سامان ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم اس دو عملی کے ہاتھوں لٹ جائیں۔ سنیں کچھ اور کریں کچھ کے زمرے میں

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

دھر لئے جائیں۔ لاؤڈ سپیکر سے کیا ہم زیادہ اچھے پاکیزہ ذوق کے انسان بن جائیں گے ؟ تطہیر قلب کا عمل تو دل کی گہرائیوں سے شروع ہوتا ہے۔ کیا ہم اپنے دل میں تسبیح استغفار نہیں کر سکتے۔ عشق و محبت کا اور مدح رسول مقبول کا وظیفہ نہیں کر سکتے۔ ہمارے دلی جذبوں کو یہ لاؤڈ سپیکر کہاں تک سہارا دے گا۔ کیا ہمارے بازار صرف لاؤڈ سپیکر کی آواز سے ملاوٹ، ذخیرہ اندوزی، مہنگائی سے پاک ہو جائیں گے۔ اگر ایسا ممکن نہیں تو پھر لاؤڈ سپیکر کا بجلی کے کھمبے پر نصب ہونا بھی ضروری نہیں۔ تلاوت اور نعت رسول مقبولؐ کے لئے پہلے دل کی کثافتوں کو دھلی کپاس کی طرح صاف کرنا ضروری ہے تاکہ تجلیات کا ظہور ہو سکے اگر بازاروں میں لاؤڈ سپیکر صرف پیغام، احتجاج اور ایسوسی ایشن کے ایجنڈے کو ارکین تک پہنچانے کا اہتمام ہے تو پھر اس کا سارا دن استعمال عام شہریوں کے لئے کیوں ہے۔

لاؤڈ سپیکر سے زیادہ مؤثر ایجادات آچکی ہیں ایسوسی ایشنوں کو اس طرف پیش قدمی کرنی چاہئے۔ E.Mail کی ترقی سے فیکس کی سہولت سے موڈیم کی ایجاد سے اپنے پروگرام دوسروں تک پہنچانے چاہئیں۔ سارا دن کی تشریات سے کیا بازاروں میں کلام و بیان کے انداز بدل گئے ہیں۔ کیا ہمارے دکاندار آنے والے گاہک کو وہ مقام دیتے ہیں۔ جیسا ایک سفیر کو دوسرے ممالک اپنی اسناد تقرری پیش کرنے پر اہمیت دیتے ہیں۔ گاہک تو خدا تعالیٰ کی طرف سے دکاندار کے لئے رزق کا اہتمام کرنے آتا ہے ہم نے لاؤڈ سپیکروں کی قطار سے اچھے کلام سنانے کا ایک قدم اٹھالیا ہے لیکن ابھی دل میں گاہک کے لئے محبت، احترام، درگزر اور رحمت و شفقت کا قدم نہیں اٹھایا۔ کیا اس کے لئے دل کے اندر کسی لاؤڈ سپیکر کی ضرورت ہے جو ضمیر کی تہوں میں جمے ہوئے جذبہ کو جگائے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

دنیائے اسلام جو تقریباً 55 ممالک پر مشتمل ہے۔ جس کی آبادی تقریباً 85 کروڑ ہے جس کے وسائل اور ذرائع میں دریائے نیل کی زرخیزی، سندھ کی طغیانی، دریائے اردن کی جولانی، میٹھے گرم اور ٹھنڈے پانی جیسے دریا اچھی فصلوں لذیذ اثمار اور گھنے اشجار کی ضمانت ہیں۔ بعض دریا کئی ملکوں کو ملاتے ہیں عراق، ترکی اور شام کی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ دنیائے اسلام کی قدرت نے تیل اور دیگر معدنیات کے خزانے دیئے ہیں۔ تیل بطور ہتھیار بھی استعمال ہوا ہے اور آج بھی اس کی اہمیت سے انکار نہیں۔ دنیا بھر کے ادارے، ٹرانسپورٹ اور صنعتیں اسی تیل کی مرہون منت ہیں۔ دنیائے اسلام امیر ترین خطوں پر مشتمل ہے۔ افریقہ میں ان گنت مادی وسائل موجود ہیں۔ ایشیاء افرادی قوت ذہانت میں اپنی مثال آپ ہے۔ یورپ کے خطوں میں آباد مسلمان اپنے علم، ہنر اور مرتبہ کی پہچان رکھتے ہیں۔ اسلامی ممالک میں وسط ایشیائی ممالک بھی شامل ہیں جو اپنی صدیوں کی تہذیب اور عسکری جرأت کی وجہ سے بڑی طاقت سے آزاد ہوئے ہیں اور اسلامی امہ میں اب اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ مشرق وسطی اپنی مصنوعات، معدنیات اور کرہ ارض کے وسط میں ہونے کی وجہ سے دنیا بھر کی نظروں میں رہتی ہے۔ بڑی طاقتیں بہانے بہانے سے یہاں اپنا تسلط بڑھانا چاہتی ہیں۔ اس سرزمین کو سونے کی چڑیا سمجھتی ہیں اور اس کے وسائل پر قبضہ اور اس کے مسائل پر اجارہ داری قائم کرکے مشرق وسطی کو مستقل طور پر جنگ کے دہانے پر کئی بار لا چکی ہیں اور اب عنان کوئی اس محاذ آرائی کی صورت میں کوئی اہم شاکی کردار ادا کرنا چاہتے ہیں۔ مہذب دنیا اب جنگوں سے تنگ آچکی ہے لیکن حیرت ہوتی ہے کہ یہ مہذب دنیا یورپ اور دیگر ترقی یافتہ علاقوں میں جنگ نہیں ہونے دیتیں لیکن اسلامی امہ کو اس مصیبت سے نکلنے بھی نہیں دیتیں۔ جب انہیں معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اسلامی ملک اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کر رہا ہے اس کے معائنہ کے بہانہ سے اس کی اندرونی ترقی پر شب خون مارنے کی کوشش کرتی ہیں اور اسے ایسا کمزور کرنے کی کوشش کرتی ہیں کہ وہ علاج معالجہ کے دوائیوں سے محروم ہو جاتا ہے۔ دودھ، گوشت، غذائی سہولتوں سے محروم ہو جاتا ہے المیہ یہ بھی ہے کہ دنیائے اسلام کے پاس ان گنت وسائل ہونے کے باوجود اور افرادی قوت

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

میں ۸۵۰ ملین کی آبادی کے باوجود، بیشتر آبادی میں ۷۰ فیصد شرح خواندگی کے وصف کے باوجود یہ دنیائے اسلام ۲۳۰ بلین امریکی ڈالر اپنی معمولی درجہ کی خوراک جس میں چینی، گوشت اور بسکٹ شامل ہیں خرچ کرتی ہے اس قدر درآمدی ممتاجی قابل حیرت ہے یہ درآمدی محتاجی جو ۴۶ ملین ٹن اشیاء پر مشتمل ہے اور جس کی تعداد ۲۰۰۰ سال میں ۸۰ ملین ہو جائے گی۔ کیا دنیائے اسلام اپنی غذائی اشیاء خود تیار نہیں کر سکتی۔ کیا اسلامی مملک میں ایسی صنعتیں نہیں لگ سکتیں۔ کیا لائیو سٹاک سے ہمیں دودھ، مکھن، گوشت نہیں مل سکتا۔ کیا زرعی وسائل سے عالم اسلام کی ضرورتیں پوری نہیں ہو سکتیں۔ پھر یہ خطے غریب کیوں ہیں۔

اقوام غالب کی ان پر اجارہ داری کیوں ہے۔ اس لئے کہ عالم اسلام ابھی متحد نہیں۔ اس لئے کہ عالم اسلام کی فکری قیادت پر بڑی طاقتوں نے قبضہ کر رکھا ہے۔ اور انہیں ایسے مسائل میں الجھا رکھا ہے جس سے عالم اسلام ہر وقت اپنی بقاء سالمیت اور تحفظ میں الجھا دیتا ہے۔ صنعتیں لگانے، افرادی قوت کو بروئے کار لانے میں اسے کم مہلت ملتی ہے زیادہ تر وقت اس کا امریکی دباؤ سے بچنے اور بڑی طاقتوں کی مداخلت کے تریاق ڈھونڈنے میں لگتا ہے۔ اس کوشش میں اپنے بھی کبھی ناراض ہو جاتے ہیں اور دشمن تو ویسے بھی دشمن ہے۔

دنیائے اسلام کی اس زبوں حالی سے آگاہ کرنے کے لئے ہمارے نامور ماہر تعلیم جنہوں نے ساری زندگی معلّمی کی نظر کر دی۔ سرائے سدھو کی زرخیز زمینوں کو چھوڑ کر کبیر والا کی سیاسی سرگرمیوں سے الگ تھلگ قبیلے اور علاقہ کی سربراہی کو پس پشت ڈال کر اپنے آپ کو اساتذہ طلبا اور اداروں سے وابستہ کر دیانہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پرواہ۔ ان گنت تعلیمی اداروں کی معاونت کرنے، نئے ادارے کھولنے، تحریر اور تقریر کی سہولتیں فراہم کرنے اور اپنے دوستوں کی دل گیری اور عزیزوں کی دست گیری کرتے کرتے قلم اور کتاب کو اپنا مشن بنا لیا ہے۔ مہر گل محمد بظاہر ایک فرد کا نام ہے مگر یہ حساس انسان اسلامی درد سے آشنا اور دنیائے اسلام بیداری کا خواہاں ہے۔ ان کی حالیہ کتاب، دنیائے اسلام کا مختصر تعارف سامنے آتی ہے جو معنوں اور صوری اعتبار سے دیدہ زیب ہے۔ جس میں دنیائے اسلام کے سارے وسائل اور سارے مسائل شامل ہیں۔ یہ کتاب نہیں Hand Book ہے جسے ہر مسلمان کے ہاتھ میں ہونا چاہئے تاکہ اسلامی امہ مضبوط ہو سکے۔ دنیائے اسلام کو اس وقت درپیش چیلنج میں نمبر ایک یہ ہے اس کی سالمیت محفوظ رہے۔ اسلامی ممالک میں Better Under Stanging

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

پیدا ہو سکے ان اسلامی ممالک میں آج ایک اچھے ابلاغ کی ضرورت ہے تاکہ مشکل گھڑی میں ہم ایک ساتھ ہوں۔ مسئلہ کشمیر ہو یا فلسطین و بوسنیا ہو یا بغداد، عالم اسلام کو ایک چھت کی ایک منزل ایک مقصد کے تحت ہونا چاہئے۔ ہم نے الگ ہو کر بڑی مار کھائی ہے۔ اکٹھے ہو کر ہم اقوام متحدہ کے اندر ایک چوتھائی طاقت ہیں اور باہر ہمارے پاس تیل کا ذخیرہ اور وسائل کا انبار ہے پھر اسلامی دنیا غریب کیسے ہو سکتی ہے۔ اسلامی دنیا کی غربت میں وسائل کی کمی نہیں صرف Unity of Muslim World کا فقدان ہے۔ اگر عالم اسلام کا ایک رب ہے تو پھر قبلہ فکر بھی ایک ہونا چاہئے۔ ہم اپنے Collective Wisdom سے دنیا بھر کی امامت کا فریضہ ادا کر سکتے ہیں مگر عالم اسلام کا المیہ یہ ہے کہ پوری اسلامی دنیا میں کوئی ایک ہستی موجود نہیں جو ہمیں ایک تسبیح میں پرو سکے۔ قوم پھر جمال الدین افغانی کو تلاش کر رہی ہے پھر رومی اور رازی کو ڈھونڈ رہی ہے۔ قوم پھر شاہ فیصل جیسا مدبر دیکھنا چاہتی ہے۔ قوم پھر جمال ناصر کی تلاش میں ہے۔

قوم اس رہنما کی قیادت کی آرزو مند ہے جو انہیں پھر وہی عزم و حوصلہ عطا کر دے جو کبھی مسلمانوں کو صلاح الدین ایوبی کے دور میں حاصل تھا لیکن اس وقت مسلمانوں کی دشمنی کی مہار مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی اب وہ ناقہ وہ اونٹنی اپنی مہار بڑی طاقتوں کے ہاتھ میں دے چکی ہے جسے وہ صحراؤں میں بھوکا پیاسا رکھ کر بے دردی سے اس کی رفتار کو اور اس کے بھرپور کردار سے محروم کر رہے ہیں۔ وہ ناقہ بے زمام پھر سے اپنے قبیلے میں لوٹ آنے کی جنگ لڑ رہی ہے لیکن کون ساتھ دے گا۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

23 مارچ ہماری منزل کے تعین کا دن

قائداعظمؒ نے مسلمانان ہند کی زندگی کا رخ بدلنے کیلئے
جس حکمت عملی کا اظہار کیا تھا یہ اسی کا ثمرہ ہے کہ صرف سات
سال کی جدوجہد کے بعد ایک عظیم اسلامی مملکت وجود میں آگئی

قرارداد پاکستان منظور ہوتے ہی ہندو پریس نے شور مچادیا
قرارداد پاکستان ایک منزل تک پہنچنے کا فکری راستہ تھا
جسے عمل، جوش اور جذبے سے آگے بڑھایا گیا

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ ہماری تاریخ کا وہ دن ہے جب آج سے ۵۸ سال قبل برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں نے اپنے تمام تر اجتماعی شعور سے یہ عہد کیا تھا کہ ہماری بظاہر اگانہ تشخص میں ہے۔ ۲۴ مارچ کو برصغیر کے مسلمانوں کے نمائندہ اجتماع میں یہ عزم کا اظہار کیا گیا تھا کہ ہم نے ظلم واستبداء کی زنجیروں کو کاٹنا ہے۔ اپنے حقوق کا تحفظ کرنا ہے اور پاکستان بنانا ہے کیونکہ ہندوؤں کے ساتھ مزید رہنا دشوار ہو گیا تھا۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ کو مسلمانوں نے حضرت قائداعظم محمد علی جناح پر عزم قیادت کی عقابی سوچ اور زریں افکار کی صداقتوں میں جس دانش فکر کا راستہ اختیار کیا تھا اسی فکر کی عملی دستاویز ۲۳ مارچ ہے۔ یہ صرف ایک قرار داد ہی نہیں بلکہ آگے بڑھنے، منزل کو پانے، کانٹوں بھری راہوں سے گزرنے سازشوں کے جال توڑنے چمنستان اقبالؒ و جناحؒ کو پانے کے لئے ٹھوس قدم بھی ہے۔

اس تاریخی موقعہ پر حضرت قائداعظم محمد علی جناح نے مسلمانان ہند کی زندگی کا رخ بدلنے کے لئے جس حکمت عملی کا اظہار کیا تھا یہ اسی کا ثمرہ ہے کہ صرف سات سالوں کی جدوجہد میں پاکستان جیسی عظیم اسلامی مملکت وجود میں آگئی اور برصغیر کے مسلمانوں کی تمناؤں، آرزؤں اور امنگوں کو قبولیت کا شرف مل گیا۔ اس دفعہ ۲۳ مارچ کی تقریبات اور تجدید عہد کے موقعہ پر جو خوشی اور مسرت نصیب ہو رہی ہے وہ سر سید احمد خان کی صد سالہ تقریبات بھی ہیں اس مسیحائے قوم نے ۲۳ مارچ تک کامیابی کا رستہ ہموار کرنے اور قوم کو عزم وہمت، فہم وفراست عطا کرنے میں جس دو قومی نظریہ کا ادراک پیدا کیا اور رام اور رحیم

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ایک علاقے اور ایک ریاست کا مالک ہونا چاہئے۔

قرار داد لاہور کا منظور ہونا تھا کہ ہندو پریس چیخ چیخ کر اسے قرار داد پاکستان کہنے اور پاکستان بنانے کا مواد شائع کرنے لگا۔ ہندوؤں کے شدید ردعمل کو دیکھتے ہوئے مسلمان بھی متحد ہو گئے انہوں نے بھی یہ نعرہ لگایا کہ "بٹ کے رہے گا ہندوستان بن کے رہے گا پاکستان" "پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ" انگریزوں، ہندوؤں کے ہزار پروپیگنڈہ اور بے سروپا باتوں کے باوجود اسلامیان ہند کی آواز اور دل کی دھڑکن پاکستان بن گیا۔ ملک کے کونے کونے میں پاکستان کے جھنڈے، پاکستان کے نغمے گونجنے لگے۔ قرار داد پاکستان دراصل ایک منزل تک پہنچنے کا فکری راستہ تھا جسے عمل، جوش، جذبہ سے آگے بڑھایا گیا اور عملی اقدامات سے خاکہ میں حقیقت کا رنگ بھرا گیا۔ ناممکن کو ممکن بنایا گیا۔ ان گنت مسائل اور مخالفتوں کے طوفان اس آواز کو دبا نہ سکے اور قرار داد پاکستان کی متعین کردہ منزل اس قدر ابدی اصولوں پر مشتمل تھی کہ اسے دنیا کی کوئی طاقت روک نہ سکی اور پاکستان ۱۹۴۷ء کو معرض وجود میں آگیا اور دنیا جانتی ہے کہ یہ مملکت صرف اور صرف اسلام کی اساس پر قائم ہے۔

آج جب ہم ۲۳ مارچ کی تقریبات منا رہے ہیں اور مینار پاکستان کے سایہ میں بیٹھ کر جو عافیت محسوس کرتے ہیں ہمیں اس بات پر بجا اظہار تشکر کرنا چاہئے کہ اگر برصغیر کے مسلمان دور اندیشی اور معاملہ فہمی سے آگاہ نہ ہوتے تو آج ہماری حالت کیا ہوتی۔ ہندوؤں کی غلامی ہماری موت تھی پاکستان کے قیام سے ہمیں زندہ رہنا موقع دیا گیا اور آج الحمدللہ جو ہندو پاکستان کی "پ" نہیں ہلنے کی دھمکیاں دیتا تھا اور نعرہ لگاتا تھا کہ پاکستان صرف چھ ماہ تک رہے گا آج حیران ہے کہ مسلمانوں نے کس طرح اپنے عزم راسخ سے پاکستان کو مربوط اور مضبوط ملک بنا دیا ہے اور گزشتہ پچاس سال سے پاکستان ترقی اور کامرانی کی شاہراہوں پر گامزن ہے۔ اس لئے ہمیں اس نعمت عظمیٰ پر خدائے بزرگ و برتر کے حضور شکر بجا لانا چاہئے اور وطن عزیز کو اقوام عالم میں ایک مضبوط اور معاشی اور سیاسی اعتبار سے مستحکم کے طور پر ثابت کرنا چاہئے۔

ہمیں اپنے وسائل اور ذرائع کو موثر انداز سے بیرونی درآمدی محتاجی سے نجات حاصل کرنی چاہئے۔ ۲۳ مارچ کو جس ہندو سے ہم نے اپنی جان چھڑائی تھی اور اس کے سیاسی اور معاشی تسلط سے الگ ہونے کا عزم کیا تھا آج اس عزم کی تجدید کرنی چاہئے کیونکہ ہندو اپنے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

مزاج اور کردار سے نہیں بدلا ہندو آج بھی ۱۹۴۷ء کی ضد میں موجود ہے بلکہ اس کی سازشیں اور بڑھی ہیں کم نہیں ہوئیں۔ بھارت میں ہندو مسلم فسادات کی تعداد چار ہزار سے بڑھ گئی ہے۔ کشمیر میں اس کے مظالم میں اضافہ ہوا ہے اور ہم اپنی تاریخ سے غافل ہونے سے نسیان میں مبتلا ہو گئے ہیں اور بعض اوقات ہندو کو اپنا دوست خیال کرنے لگتے ہیں حالانکہ حقیقت کچھ اور ہے۔ ہندو نے آج تک ہمیں ذہنی طور پر تسلیم نہیں کیا اور نہ ہی وہ تسلیم کرنے کا کوئی آئندہ خیال رکھتا ہے پھر ہمیں اس کے بارے کسی قسم کی خوش فہمی نہیں ہونی چاہئے بلکہ اپنی جغرافیائی اور سرحدی سرحدوں کو ہر آن مضبوط بنانا چاہئے اور اپنے دفاع اور اپنی ترقی کو بامقصد اور بامعنی بنانا چاہئے۔ ہمارے الیکٹرانک میڈیا کو بھارت کے چینل اور ٹی وی سے جو عریانی اور فحاشی کی در آئی ہے اس کے لئے ہمیں اپنے نوجوانوں کو آگاہ اور اپنے نظریاتی وجود کو اور مضبوط کرنا چاہئے تاکہ ہم بھارت کو سیاسی، معاشی، معاشرتی اور میڈیا کی سطح پر شکست دے سکیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

یہی دن اہل دل کے واسطے امید کا دن ہے

یہی دن اہل دن کے واسطے امید کا دن ہے
تمہاری دید کا دن ہے ہماری عید کا دن ہے

امید کا دن اس لئے ہے کہ شادی بیاہ کی تقریبات میں گوشت کھانے کو نہیں ملتا۔ پلیٹ بھر کر اور جی بھر کر کھانے اور اوپر سے سویٹ ڈش کے مزے اڑانے کے جو موقع ملتے تھے اور خلال کرنے کا جو کھانے کے بعد مزہ آتا تھا اب وہ مزے کہاں۔ چائے کا کپ یا کوئی مشروب کی بوتل اور ''لفظ شکریہ'' بڑی قناعت پسندی سے ملتے ہیں اگر ہاتھ میں بھاری بھر کم تحفہ ہو تو پھر لفظ شکریہ ضعیف جذبوں میں سمٹ جاتا ہے۔ صدر دروازہ تک چھوڑنے کا تکلف بھی دیکھنے کو ملتا ہے اگر اب تہی دست ہیں اعمال کی وجہ سے نہیں، تحفہ کے کمال سے محروم ہیں تو پھر عروسی تقریب میں آپ کا جانا نہ جانا ایک برابر ہے۔ بہتر ہے طبیعت پر قابو رکھیں اور گھر کی دال کو روسٹ چرغہ سمجھیں۔ ویسے اب گھر کی دال مرغا برابر ہو چکی ہے۔ مہنگائی نے ''عشق پیچاں'' کی طرح ہر فرد کو اور ہر گھر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے لوگ صرف بجلی کو اور بجلی مہیا کرنے والی کمپنیوں کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں کہ غریب کے گھر کا چراغ جو پہلے مہنگائی سے بجھ گیا تھا اب بجلی کے میٹر سے دم توڑ گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غریب بیچارا ایک معمولی پیاز بھی بازار سے نہیں لا سکتا جو پیاز کبھی تین چار روپے کلو بکتا تھا اب عید قربان پر یعنی عید الاضحی پر ۲۲ روپے کلو بک رہا ہے۔ کیسا ہے کس معیار کا ہے اس سے نہ مجھے سروکار ہے اور نہ آپ کو ہونا چاہئے جس طرح ملتا ہے لے لینا چاہئے وگرنہ آئینہ کی طرح گھومتی بکری کی ران آپ کا مقدر نہیں بن سکتی۔ ران اسی کی ہے جس کے گھر پیاز ہوں اور پیاز کو لانے کے لئے زر بھی ہونا چاہئے جس سے کم از کم ۲۲ روپے کلو والا پیاز گھر میں آسکے ویسے تو لہسن بھی بڑا ضروری ہے وہ بھی دس روپے پاؤ سے کم نہیں اور لہسن کے بغیر کڑاہی گوشت کا مزہ کہاں۔ اس کا انتظام بھی ضروری ہے نمک، مرچ، گھی کس بھاؤ آپ کو ملتا ہے یہ سوچنا بھی آپ کا کام ہے اور اس کے لئے آپ کی جیب آپ کا کس حد تک ساتھ دے سکتی ہے۔ اس سے مذاکرات آپ نے کرنے ہیں کچھ مذاکرات آپ سے ان لوگوں نے بھی کرنے ہیں جن کا بلاواسطہ یا بالواسطہ آپ کی عید سے اور عید کے دن سے ہے۔ یعنی اس میں مرکزی کردار بکرا

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

Marketing

Sales Activities

in Family

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

یاد رکھو کچھ تو مستحق مسکین آپ کو مل جائیں گے اور اگر نہ مل سکیں تو مسکین دوستوں کو گوشت کھلاؤ اور یاد رکھو کہ تمہارے گوشت کھلانے سے دوسرے کو یقیناً فائدہ ہوگا کیونکہ وہ شادی آرڈیننس کی وجہ سے ایک عرصہ سے گوشت سے محروم رہا ہے۔ اس کا تمہیں بھی فائدہ ہوگا کیونکہ تمہارا تقویٰ مضبوط ہوگا اور تمہارے دل میں دوستوں کے لئے سچا خلوص پیدا ہوگا قربانی صرف گوشت کھانے اور کھلانے تک محدود نہیں اس کا مقصود ایک دوسرے کا زندہ احساس ہے محبت ہے الفت ہے پیار اور خلوص ہے گوشت کی تقسیم دراصل منصفانہ نظام کو عملی طور پر لانے کا نام ہے۔ دولت کی صحیح گردش کا نام ہے فلاحی رفاہی معاشرہ کی طرف پیش رفت ہے۔ گوشت تقسیم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اسے تین حصوں میں تقسیم کیا جائے ایک حصہ خود قربانی والے اپنے گھر رکھ لیں (گردے، کلیجی، ران، سری کی تقسیم بھی ضروری ہے) یہ دوستوں کا حق ہے اس کا خیال رکھیں اور ایک حصہ خیرات کر دیں اور باقی اپنے دوست اور احساس کو تحفہ میں دیں اور اس جذبہ سے دیں کہ توقع نہ رکھیں کہ واپسی پر آپ کی اپنی بھیجی ہوئی ران آپ کو ملے گی واپس آ بھی جائے تو صبح کا بھولا شام کو لوٹ آئے تو اسے کچھ نہ کہا جائے کیونکہ لوٹنے والا مال آپ کا آئینی قانونی حق ہے بہت سے لوگ اسی حق پر زندہ ہیں بلکہ غصب کرنا اور قبضہ گروپ کہلانا ان کی ایک صفت ہے۔ کچھ لوگ قربانی کرتے ہیں اور کچھ لوگ صرف قربانی کے گوشت پر گزارا کرتے ہیں۔ بہر حال فضیلت دونوں کے مقدر میں ہے آج عید کا دن ہے دوستوں کی دید کا دن ہے ملنے اور ملتے رہنے کے عزم کا دن ہے اس دن کو خوب منانا چاہئے آنے والے دوست کو اس کی فرمائش پر جی بھر کر کھلانا چاہئے۔ تاکہ آپ کے گزشتہ پچاس سال جو کنجوسی میں گزرے ہیں اب نعمتوں کے تشکر میں گزرنے چاہئیں۔ تحدیث نعمت یہی ہے کہ ہم اس قربانی کا خیال رکھیں جو آج سے پچاس سال پہلے ہمارے بزرگوں نے ہمیں مقدس خط دلانے کے لئے دی تھی۔ ہمیں آج کے دن اس جذبہ کو اس صداقت کو یاد رکھنا چاہئے اور محروم اور مجبور لوگوں کا احساس کرنا چاہئے جو کسی وجہ سے آج کسی جانور کی قربانی نہیں کر سکیں گے۔ یہ بھی فضیلت ہے کہ آپ سارا گوشت خیرات کر دیں۔

اگر کسی کو تحفہ بھی نہ بھیجیں تو بھی کوئی حرج نہیں لیکن مستحق کے پاس گوشت ضرور جانا چاہئے۔ اگر آپ کے گھر دو یا دو سے زائد جانور ہیں اور آپ نے قربان کرنے ہیں تو ان میں بھی تقسیم اور بانٹنے کا عمل جاری رکھیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ قربانی سے لطف اندوز ہو سکیں

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

قربانی سے پہلے جو آپ نے بال اور ناخن بڑھائے تھے محض اللہ تعالیٰ سے تقویٰ کے خلوص نیت کے لئے وہ کاٹ دیں کیونکہ وہ مقام آپ نے پالیا ہے اگر آپ نے ویسے گذشتہ پچیس سال سے بال اور ناخن حرص اور ہوس کے لئے بڑھائے تھے ان کو رہنے دیں کیونکہ ان کا تعلق قربانی کی عید سے نہیں آپ کی سوچ سے ہے۔ جس سے بنگلے، کوٹھیاں، موٹر کاریں اور کارخانے بنتے ہیں۔ اور جن کے بال اور ناخن عید کی قربانی کی وجہ سے بڑھے تھے وہ آج کٹوا دیں کیونکہ ان کا اب جواز باقی نہیں رہا پچھلے لوگ بال اور ناخن اس لئے بڑھاتے ہیں کیونکہ دوسروں کی جیبیں کاٹتے رہیں چھل والا چھل مدد کا پیتا ہے رشوت والا میٹھے کی طرح بڑھا دیتا ہے وہ دو چار مجھے سمجھنے کے بعد ملتا ہے وہ اس کا رزق آپ نہ پوچھیں کیونکہ آج عید کا دن ہے اور مجھے آپ کو عید چائے پلانی ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کتابیات

1. Fisher-Glen, **"American Communication in a Global Society"**
   Ablex Publishing Corporation.
   New Jersey - 1979

2. **Pakistan Development Review No.36**
   Part-I 1997

3. Sahibzada - Mohibul-Haq,
   "Poverty Alleviation in Pakistan"
   Institute of Policy Studies,
   Islamabad - 1997

4 Mahbul-Haq - **Human Development in South Asia - 1997**
   Oxford Unviersity Press - 1997

5. Straubhaar, Joseph
   "Media in the Information Society"
   Wadsworth Publishing Company
   U.S.A. 1997

6. First Call by Unicef, U.N.O.

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ڈاکٹر کریم ملک ملتان کے ایک پسماندہ گاؤں جس کا کوئی رابطہ کوئی پگڈنڈی نہ تھی کھیت اور کھلیان کے دشوار گزار فاصلے طے کرتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے۔ نامساعد حالات کی گود سے اٹھ کر ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے گورنمنٹ پائلٹ ہائی سکول، گورنمنٹ کالج ملتان، ہیلے کالج آف کامرس اور پھر پنجاب یونیورسٹی لاہور تک پہنچے۔ ہیلے کالج آف کامرس لاہور کے تین سال "الاقتصاد" کے مدیر رہے علاوہ ازیں ایم اے، ایل ایل بی، ڈی ایل ایل، پھر بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان سے شعبہ ابلاغیات کے پہلے پی ایچ ڈی ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ اس یونیورسٹی سے ان کی رفاقت کم وبیش 25 سالوں پر محیط ہے اس میں انتظامی امور کا عمیق تجربہ اکاؤنٹس اور ابلاغیات کے استاد ہونے، تدریس کے معیار کو بہتر بنانے اور شعبہ تعلقات عامہ میں مہارت کا ایک ایسا حوالہ بنے جو اس شعبہ سے وابستہ افراد کیلئے ایک درس گاہ کا، ایک ادارہ کا درجہ رکھتا ہے۔

دنیائے صحافت میں بطور فری لانس کے آغاز کیا اور روزنامہ کوہستان ملتان میں لکھتے رہے لیکن 1972 سے روزنامہ نوائے وقت لاہور اور ملتان سے مستقل طور پر وابستگی اختیار کی۔ اس عرصہ میں تصانیف اور تحقیقی مضامین کا سلسلہ بھی جاری رکھا ان گنت سماجی تنظیموں سے وابستگی کی بنا پر ڈاکٹر کریم ملک کے کالموں میں اسلوب بیان کی شگفتگی، شوخی، بیباکی کے علاوہ معاشرہ کے وہ سلگتے مسائل بھی شامل ہیں جن کے حل کیلئے ان کی حریم ذات میں پاکستان اور پاکستانیت کی اقدار رچی بسی ہیں۔

Tehqeeq TanqidRs 225
000001 078978
Dar e ehsas pe datak

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com